تاریخ ادبیات ایران
ایس۔ ایل۔ گومر
کپور برادرس سرینگر

جدید ترین طبع

تاریخ ادبیات ایران

آئینۂ ادبِ فارسی

مصنفہ

پروفیسر ایس۔ ایل۔ گوہر، ایم۔ اے

(یونیورسٹی گولڈ میڈلسٹ)

ناشران: میسرز کپور برادرس بک سیلرز و پبلشرز

پکہ ڈنگہ جموں لال چوک سرینگر کشمیر

(جمال پریس دہلی) قیمت دس روپیہ

عرض حقیقت

ادبیاتِ ایران کی تاریخ سے متعلق فارسی اور انگریزی زبان میں تصانیف کی کمی نہیں۔ لیکن اردو زبان میں ایسی کتابوں کی تعداد محدود ہے۔ اس موضوع پر اکثر تالیفات مخصوص مضامین اور معین ادوار پر مشتمل ہیں۔ اردو میں ایک ایسی کتاب کی کمی شدت سے کھٹکتی رہی تھی جو ہر لحاظ سے جامع ہو۔

بندہ نے یہ کتاب "آئینہ ادب فارسی" کے نام سے لکھی ہے۔ اور اس میں ادبیاتِ ایران کے آغاز سے جدید دور تک بحث کی ہے۔ کم درجہ شعراء اور ادبا پر کم اور بلند درجہ شاعروں اور نثر نگاروں پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔ یہ کتاب لہذا عام علم دوست حضرات اور تاریخ ادبیاتِ فارسی کے شائقین کی دلچسپی کا موجب ہے لیکن طلباء کالج کے لئے بالخصوص مفید ہے۔ امتحان کے نقطۂ نگاہ سے ان کی تمام ضرور پر حاوی ہے۔ طلباء کی سہولت کے لئے مواد کو بصورت سوال و جواب مرتب کیا گیا ہے۔ جوابات نہ زیادہ طویل ہیں اور نہ ہی مختصر بلکہ سوال کے تقاضوں کے عین مطابق۔

چند قابلِ ذکر خصوصیات مذکورہ ذیل ہیں:

۱۔ کتاب سادہ اور سلیس مگر بامحاورہ زبان میں لکھی گئی ہے۔

۲۔ طرزِ بیان دلکش اور مؤثر ہے۔

۳۔ تمام نامور اور عظیم الفم شعرا کے حالاتِ زندگی کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان کے کلام پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے

۴۔ مشہور اور بلند درجہ انشاپردازوں کے سوانح حیات کے ذکر کے علاوہ ان کی ادبی خدمات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔
۵۔ نثر و نظم کی تاریخ و تنقید کے ساتھ ساتھ ادبی تحریکات پر بھی توجہ دی گئی ہے۔
۶۔ ادبیات پر بحث کے دوران تاریخی تسلسل کو قائم رکھا گیا ہے۔
۷۔ کتاب کی تالیف میں متعدد مستند تصنیفات (اردو۔ فارسی اور انگریزی) سے استفادہ کیا گیا ہے اور تحقیق و تدقیق کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
۸۔ گو کتاب کی ضخامت زیادہ نہیں لیکن تمام ضروری اور اہم مطالب و مضامین تفصیلاً بیان کردیئے گئے ہیں۔ اور کوئی کام کی بات نظرانداز نہیں کی گئی۔ گویا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کوزے میں دریا بند ہے۔

اساتذہ کرام سے استدعا ہے کہ اگر کتاب ہذا کی کوئی خامی یا غلطی ان کی نظر سے گذرے تو بندہ کی توجہ اس پر مبذول کر کے اپنی رائے صائب سے مستفیض و ممنون فرمائیں۔ جدید ترین طبع پیش خدمت ہے۔

نیاز کیش
ایس۔ ایل۔ گوہر

دہلی سنہ ۱۹۸۰ عیسوی

آئینۂ ادب فارسی

تاریخ ادبیات ایران

فہرست مضامین

تعارف

ایران جس کا قدیم نام فارس (PERSIA) ہے ہندوستان کے ساتھ صدیوں پرانے روابط رکھتا ہے۔ بعض مورخین کا عقیدہ ہے کہ ان تعلقات کا آغاز ۵۲۲ ق ۔م سے ہوا جب ایران کے عظیم المرتبہ بادشاہ دارا نے اپنی سلطنت کو وسعت دی اور ہندوستان کی حدود تک اسے پہنچا دیا۔ کچھ محققین اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور ایرانیوں اور ہندوستان کے آریوں کو ایک ہی نسل یا قوم سے منسوب کرتے ہیں، جو وسطی ایشیا میں رہتی تھی اور مختلف قبیلوں میں منقسم ہو کر ادھر اُدھر پھیل گئی۔ اس کی ایک شاخ ایران میں آباد ہو گئی اور دوسری شاخ ہندوستان میں وارد ہوئی۔

تاریخ نگاروں نے اس قوم کے ابتدائی زمانہ، اصلی وطن، تہذیب اور تمدن اور زبان کے بارے میں بہت سے مختلف نظریئے پیش کئے ہیں۔ ان نظریوں سے پیدا ہونے والا آخری اور قرین قیاس عقیدہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ قوم مذکور سے آریہ، ایریا یا آرج قوم مراد ہے جس کا لفظی مطلب ہے "دوست یا باوفا" اس قوم کا اصلی وطن شمالی یورپ تھا اور یہیں سے یہ لوگ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے۔ ان لوگوں کو آٹھ بڑی بڑی شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ انہی شاخوں سے ایک شاخ ایران پہنچی اور اس خطے کو یہ نام دیا۔ بعض محققوں کا خیال ہے کہ آریا لوگ ایران میں دو ہزار برس قبل مسیح کے

لگ بھگ وارد ہوئے۔ بعضوں کا عقیدہ ہے کہ یہ آر چار چودھویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوئی۔ تاریخی تحقیقات اور اوستا نیز قدیم کتبوں کی روشنی میں یہ امر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندوکش کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہونے والے آریہ اور ایران، افغانستان، سیستان، خراسان، گرگان، البرز اور رے میں آباد ہونے والے آریہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے زیادہ اختلافات نہ رکھتے تھے۔

صرف زبان ہی کو لیجئے سنسکرت اور قدیم فارسی کے صدہا الفاظ اب بھی ظاہر کرتے ہیں کہ ان زبانوں کے بولنے والے ضرور زمانۂ قدیم میں اکٹھے مل جل کر رہتے تھے۔ مثال کے طور پر چند مترادف کلمات ذیل میں دیئے جاتے ہیں:-

سنسکرت	قدیم فارسی	موجودہ فارسی	اوستائی
ماترِی	ماتر	مادر	×
بھراتا	براتا	برادر	براتا
نام	نام	نام	نیم
کرتَم	کَرَتَم	کردہ (شدہ)	کرتم
داریہ	داریوش	داریوش	داریو
پس چاؤ	بساؤ	پس	پس ح اِت
اَب دَم	اَبَ دم	بودم	بوَم
آسِ	آہَ	بود	آس
سماتا	ہماتا	ہم مادر	ہمامت

یوں تو نویں صدی قبل مسیح سے بہت پہلے تک کے متعلق مشہور ہے کہ باختر (BACTRIA) میں ایرانی سلطنت قائم تھی لیکن اس امر سے قطع نظر کسی ایرانی سلطنت کے قیام کے بارے میں سب سے پہلا تاریخی اشارہ نویں صدی قبل مسیح ہی میں ملتا ہے جبکہ اسیریا کے بادشاہوں کی توجہ میڈیز کے علاقۂ اقتدار کی طرف مبذول ہونے لگی۔ ایران کی تاریخ باقاعدہ طور پر کیخسرو اعظم (CYRUS THE GREAT) یعنی کورش بزرگ سے شروع ہوتی ہے جس نے پہلے پہل بابل (BABYLON) اور اس کے قرب و جوار پر اپنا تسلط جما کر ہخامنشی خاندان کی بنیاد ڈالی ہخامنشی خاندان (ACHAEMENIAN DYNASTY) کے ارتقا کا آغاز فارس (PARS : PERSIS) سے ہوا جس کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی کہ آج تک فارس سے مراد ایران کا ملک لیتے ہیں حالانکہ فارس ایران کا صرف ایک صوبہ یا حصہ تھا۔

کیخسرو اعظم نے جو ایرانی سلطنت کا بانی تھا ۵۵۹ قبل مسیح سے ۵۲۹ق۔م تک حکومت کی۔ اس کا علاقۂ سلطنت جنوب میں خلیج فارس سے لے کر شمال میں کوہ ارارات تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں فلسطین، شام اور اسیریا کے بادشاہوں کی عظیم سلطنت کا کچھ حصہ بھی شامل تھا۔

کیخسرو کے بعد اس کا بیٹا کمبوجیہ (CAMBYSUS) ۵۲۲ق۔م تک حکمران رہا۔ اس نے اپنے باپ کی سلطنت کو وسعت دینے کے لیے مصر اور سیرینکا (CYRENAICA) کو فتح کیا۔ اس کے بعد اس نے حبشہ (ETHIOPIA) پر بھی چڑھائی کی لیکن ناکام ہوا۔ اس کی

وفات ۵۲۲ ق۔م میں ہوئی۔

اس سے داریوش (DARIUS) کے لئے میدان صاف ہوگیا دارا
داریوش نے سلطنت کو اور بھی وسیع کیا اور اپنی حدود کو راجپوتانہ کے
ریگستان تک پھیلایا۔ امن وامان قایم کرنے کے بعد دارا نے اپنی
سلطنت کو چھوٹے چھوٹے حصّوں یا صوبوں میں منقسم کردیا۔ ہر حصّے
کا نام سٹرپی (SATRAPY) رکھا اور اس حصّے کے حکمراں یا صوبہ دار
کو (SATRAP) کہا جاتا تھا۔ تجارت کی ترقی وسہولت کے لئے
دارا نے سونے اور چاندی کے سکّے جاری کئے۔ یونانیوں کا مقابلہ کرنے
کے لئے دارا نے ہندوستانی فوجیوں سے بھی کام لیا۔ دارا کا سنہری
زمانہ کئی باتوں کے لئے مشہور ہے جنھیں اولیاتِ داریوش کہتے ہیں
مثلاً (۱) سندھ سے لیکے سویز تک) پہلا بحری سفر (۲) بحیرہ قلزم کا دریائے
نیل کے ڈیلٹا سے ملایا جانا (۳) ہندوستان میں ایک نائب (گورنر)
(SATRAP) کا قیام۔ (۴) تھریس اور مقدونیہ وغیرہ کو فتح کرنا۔ (۵)
سڑکوں کی تعمیر، محکمہ ڈاک اور سراغرسانی کا قیام (۶) ایشیا کی یورپ کے
خلاف سب سے پہلی مہم یعنی بحیرۂ اسود کے شمالی علاقہ پر حملہ وغیرہ۔
داریوش اول اعظم نے چھتیس سال حکومت کی یعنی ۵۲۲ ق۔م سے
۴۸۵ ق۔م تک۔

اس کے بعد خشیارشا (XERXES) تخت نشین ہوا۔ اس کو
یونانیوں کے ساتھ کئی معرکے لڑنے پڑے۔ اسی کے زمانے میں مشہور
عالم جنگ تھرموپلے بھی ہوئی جس میں سپارٹا والوں کو شکست ہوئی۔ بعد
میں اسے یونانیوں کے ہاتھوں سلیمیس (SALAMIS) کے مقام پر

شکست ہوئی اور قتل ہوگیا۔ اس کے بعد ملک میں فسادات اور قتل و غارت کا آغاز ہوا اور سلطنت کمزور ہوگئی۔ آخر داریوش سوم جو ہخامنشی خاندان کا آخری بادشاہ تھا سکندر اعظم کے ہاتھوں ہار گیا۔ اور ۳۳۱ ق م میں ملک پر یونانیوں کا قبضہ ہوگیا۔

آخر تیسری صدی عیسوی میں ایرانی نسل کا ایک حکمران اردشیر معرض وجود میں آیا۔ اور اس نے ایران کی عظمت کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سڑکیں تعمیر کیں۔ کئی شہر آباد کیے اور زرتشت کا مذہب پھیلایا جب عربوں نے ایران پر حملہ کیا تو کئی اہل زرتشت یعنی آتش پرست (پارسی) ایران سے بھاگ کر ہندوستان آ گئے۔ سورت کے راجہ نے ان کا خیر مقدم کیا اور رہنے کی اجازت دے دی۔ یہ لوگ یعنی پارسی (اہل فارس) اب ہندوستان کے شہری ہیں۔ گجراتی زبان بولتے ہیں اور بمبئی اور سورت میں آباد ہیں ۶۵۱ء میں مسلمان عربوں نے ایران پر پورا پورا تسلط جما لیا اور تمام ایرانیوں نے اسلام قبول کر لیا۔

گیارھویں صدی عیسوی میں عرب سلطنت زوال پذیر ہوئی۔ ترکوں نے پے در پے اس پر حملے کیے۔ اس کے بعد منگولوں نے حملہ کر دیا۔ ترکوں اور منگولوں نے ایک مدت تک حکومت کی۔ آخر شاہ اسمٰعیل نے صفوی خاندان کی بنیاد رکھی اور امن وامان قایم کیا۔ اس کی حکومت سے ملک کو خوشحالی نصیب ہوئی۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں پھر ایران بیرونی حملوں اور خانہ جنگی کا شکار رہا۔ اور اس قدر کمزور ہوگیا کہ پہلے روسیوں اور پھر انگریزوں کے سایۂ حفاظت میں رہا۔

۱۹۳۵ء میں فارس (PERSIA) کا نام سرکاری طور پر ایران رکھا گیا برطانیہ نے وہاں تیل نکالنے اور صادرات کرنے کے حقوق حاصل کرلئے۔

۱۹۴۱ء میں برطانیہ اور روس نے ایران پر قبضہ کرلیا اور رضا شاہ پہلوی کو تخت سے اتار دیا اور موجودہ حکمران محمد رضا شاہ پہلوی کو اس کا جانشین مقرر کردیا موجودہ شہنشاہ عوام کی بہبودی اور ترقی کے لئے انتہائی کوشش کررہے تھے صنعت وحرفت خوب ترقی پر تھی۔ زرعی اصلاحات عمل میں آرہی تھیں۔ زمین کو کسانوں میں بانٹا جارہا تھا۔ تعلیم کی اشاعت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جارہی جمہوری نظام حکومت قائم کردیا گیا۔ لیکن عوام کی امیدیں پوری نہ ہوئیں۔ حالات بگڑ گئے۔

حال ہی میں (۱۹۷۹ء) ایرانی انقلاب پسندوں نے شاہ ایران کے خلاف آیات اللہ روح اللہ خمینی کی زیر راہنمائی بڑے پیمانے پر بغاوت کردی قتل وغارت کا بازار گرم ہوا۔

شاہ ایران محمد رضا شاہ اپنی بیگم فرح دیبا اور بچوں کے ہمراہ ملک سے بھاگ نکلا اور مشکل سے جان بچائی۔ اب وہ غیر ملکوں میں پناہ گزیں ہے باغی انقلابی حکومت نے سینکڑوں سابق شاہ پرستوں، جرنیلوں، وزیروں اور امیروں، رئیسوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ شاہ اور اس کے لواحقین کو بھی موت کا سزاوار قرار دیا گیا ہے۔ جونہی ان کی گرفتاری عمل میں آئی انہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔

سوال: زبان کی ابتدا اور ارتقا پر بحث کیجئے۔

جواب: زبانیں بھی انسانوں کی طرح وجود میں آتی ہیں۔ زندگی بسر کرتی ہیں اور کسی ایک وجہ یا حادثات کے سبب صفحۂ ہستی سے مٹ بھی جاتی

ہیں: علم الالسنہ کے علما کا عقیدہ ہے کہ اب کوئی نئی زبان عالم وجود میں نہیں آئے گی۔ کیونکہ اب روئے زمین پہ کوئی فرد و بشر یا قبیلہ موجود نہیں جو ایسی ابتدائی حالت میں ہو کہ بات چیت کرنے کے بھی قابل نہ ہو لہٰذا موجودہ زبانیں ہی ترقی کریں گی اور ہر زبان کے ننے سے کئی شاخیں پیدا ہوں گی۔ یہ زبان کی اندرونی ترقی ہو گی۔ البتہ کسی زبان میں دوسری زبان یا زبانوں کے اثر سے تغیر و تبدل ممکن ہے جس سے اس زبان کی قدیم اور جدید صورت میں نمایاں فرق ہو سکتا ہے۔

جو زبانیں متروک ہو چکی ہیں اور جن کا کوئی نشان باقی نہیں رہا ان سے متعلق کوئی دستاویز دستیاب نہیں ہے محققین کا عقیدہ ہے کہ ابتدائی آدمی سوائے فریاد کرنے اور اشاروں کے اپنا مطلب کسی اور طریقے سے بیان نہیں کر سکتا تھا اس کے بعد جب اس نے ترقی کی تو اس کی زبان میں الفاظ شامل ہونے لگے۔ یہ الفاظ زیادہ تر جانوروں اور قدرت کی آوازوں کی پیروی تھی۔ چنانچہ اب بھی موجودہ قوموں کی زبانوں میں اس تقلید کے آثار باقی ہیں۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ جوں جوں انسان ترقی کرتا گیا اس کی بولی کے الفاظ میں اضافہ ہوتا گیا۔

فلالوجی (PHILOLOGY) (علم زبان) کے علما کا خیال ہے کہ موجودہ دنیا کی تمام زبانیں تین زمروں یا گروہوں میں منقسم ہیں:-

(۱) یک ہجائی یا یک رکنی زبانیں :- ان زبانوں کو ایک ریشہ والی زبانوں کے نام سے بھی نامزد کرتے ہیں۔ کیونکہ ان زبانوں کے الفاظ ایک ریشہ یا مادہ پر مشتمل ہیں۔ ان ہجوں یا مادوں کے شروع یا آخر میں کسی سابقہ یا لاحقہ کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔ چینی۔ انامی اور سیامی زبانیں

اسی گروہ سے شمار ہوتی ہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ ایک ریشہ والی زبانوں میں الفاظ کا ذخیرہ محدود ہے۔ چنانچہ چینی لوگ اپنے خیال یا مطلب کے اظہار کے لئے مجبور ہیں کہ لفظوں (ہجوں یا مادوں) کو آگے پیچھے کریں یعنی ان کو مختلف صورتوں میں ترتیب دیں لب و لہجہ کی تبدیلی سے بھی مطلب سمجھانے میں مدد لی جاتی ہے۔

(۲) پیوندی یا ملتصق زبانیں۔ یہ زبانیں یک ہجائی نہیں ہیں۔ کیونکہ ان زبانوں کی لغت میں مشتقات (کلماتِ مشتق) بنانے کے لئے مادہ میں ہجوں کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ان ہجوں کے اضافہ سے مادہ یا ریشہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اور وہ اپنی اصلی حالت میں قائم رہتا ہے۔ جس ہجے کا اضافہ کیا جاتا ہے وہ پہلے ہجے یا مادہ کے آخر میں محض چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ یہ ملتصق یا پیوندی زبانیں مندرجہ ذیل اقوام میں رائج ہیں:-

(ا) اورال کی زرد جلد والی قومیں مثلاً مغل۔ تاتار۔ ترک۔ سامویدو غیرہ۔

(ب) جاپانی و اہل کوریا۔

(ج) ہندوستان کے دراوڑ اور بامنکا۔

(د) افریقہ میں نوبی لوگ (مصر کے جنوب ...) ہوٹن ٹوٹ۔ کافر سیاہ جلد والے لوگ۔

(س) آسٹریلیا میں اصلی باشندے۔

(ق) امریکا کے اصلی لوگ۔

(۳) منصرف زبانیں:- ان زبانوں کی لغات (الفاظ) میں مادہ ...

ہجوں کا اضافہ کیا جاتا ہے لیکن صرف آخر میں ہی نہیں بلکہ شروع میں بھی
دوسری بات یہ ہے کہ ہجوں کے اضافہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مادہ یا ریشہ
تبدیل ہوجاتا ہے۔ ہجوں کے اضافہ اور مادہ کے تغیر و تبدل سے زبان
میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ہر قسم کے خیالات و جذبات
کے اظہار کے قابل ہو جاتی ہے۔ اس گروہ میں دو قسم کی زبانیں شامل ہیں۔

(ا) ہند و اردیائی :۔ ہندوستان۔ یورپ۔ ایران وغیرہ کی زبانیں۔

(ب) سامی زبانیں :۔ عبرانی۔ زمانۂ قدیم کی بابل کی زبانیں، آسوری
فنیقی۔ قرطاجنہ کے باشندوں کی زبان حمیری۔ عربی۔

انڈو یوروپین (ہند و اردیائی) زبانوں سے مراد انڈو آرین۔ یونانی۔
اطالوی۔ سنسکرت۔ فارسی۔ انگلش وغیرہ ہیں۔

بعض فلالوجی کے ماہرین کا عقیدہ ہے کہ تیسرے گروہ کی زبانیں
یعنی منصرف زبانیں پہلے اور دوسرے گروہ کی زبانوں کے مرحلوں سے
گذر کر اس درجے (تیسرے مرحلے) تک پہنچی ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ
تمام زبانیں مذکورہ بالا تین مرحلوں سے نہیں گذریں۔ کیونکہ ایسی
زبانیں بھی مشاہدہ میں آئی ہیں۔ جو پہلی یا دوسری منزل پر ہی رہ گئیں
یا تیسری منزل تک پہنچنے سے پہلے پہلے صفحہ ہستی سے محو ہو گئیں۔
پھر ہمیں وہ زبانیں بھی ملتی ہیں جو کہ درمیانی مرحلہ پر واقع ہیں۔ پس
ہمیں ان کو مختلط زبانیں کہنا چاہیئے۔

سوال :۔ رسم الخط (SCRIPT) کی ابتدا اور ارتقا پر بحث کیجئے۔

جواب :۔ علمائے السنہ کے عقیدے کے مطابق رسم الخط بھی زبان
کی طرح طویل زمانہ کے دوران آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے وجود میں

آیا ہے۔ اور رفتہ رفتہ آخری یعنی موجودہ مرحلہ تک پہنچا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تمام اقوام نے رسم الخط کے ایجاد کرنے اور ترقی دینے میں شرکت کی ہے۔ کیونکہ بہت سی اقوام نے دوسری اقوام سے اسے اختیار کیا ہے۔ اگر ہم رسم الخطوں کی تاریخ بیان کریں تو ہم اصل مضمون سے دور چلے جائیں گے۔ کیونکہ یہ بحث ایک علیحدہ مضمون ہوگا۔

ان مرحلوں کے درمیان جن سے رسم الخط گزر کر موجودہ درجہ تک پہنچا ہے پانچ نمایاں منزلیں ہیں:۔

(۱) وہ مرحلہ جب انسان اپنے خیالات کی ترجمانی کے لئے اشیا کو علامات کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ مثلاً اب بھی ملایا کے بعض لوگوں کے درمیان یہ مروج ہے کہ نمک کو محبت کی علامت اور مرچ سیاہ کو بغض و کینہ کی علامت جانتے ہیں۔ امریکہ کے وحشی باشندے ان گانٹھوں سے جو وہ دھاگے میں دیتے ہیں یا سوراخوں کے ساتھ جو وہ درختوں کے پتوں میں کرتے ہیں اپنا مفہوم سمجھاتے ہیں۔ اس قسم کی علامات اکثر قوموں اور گروہوں میں مروج تھیں۔ ان میں سے ایک رسم الخط لکڑی کا تھا۔ جس کو بغیر سیاہی کے قدیم زمانے میں برتتے تھے۔

(۲) تصویری خط:۔ دوسرے مرحلے میں کسی چیز کو بیان کرنے یا مطلب ظاہر کرنے کے لئے اس چیز کی تصویر کھینچ دی جاتی تھی۔ مثلاً آفتاب رقم کرنے یا ظاہر کرنے کے لئے اس کی تصویر کھینچ دیتے تھے کسی جانور کا نام لکھنے کے لئے اس کی شکل بنا دی جاتی تھی۔ امریکہ کے بعض اصلی باشندوں میں اب بھی یہ خط مروج ہے۔

(۳) تیسرا مرحلہ مفہوم نویسی یا فکر نگاری (IDEOGRAPHY)
کا ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا دوں دوں کسی چیز کی تصویر کھینچنے کی
دقّت کو محسوس کیا گیا۔ اور اس مشکل کو دور کرنے کے لیئے بجائے تمام یا پوری
شکل کھینچنے کے اس کا صرف ایک حصہ ہی ظاہر کرنے لگے اس کے بعد
جب یہ کام بھی مشکل نظر آنے لگا تو آہستہ آہستہ شکل کو اور گھٹاتے گئے اور
مختصر سے مختصر تر کرتے گئے یہاں تک کہ تصویر صرف علامت میں بدل گئی۔ اور
اس کو بھی حقیقی معنوں سے بڑھا کر مجازی معنوں میں استعمال کرنے لگے۔
اس ترتیب سے جو علامت اور حرف تحریر کرتے وہ کلمہ یا مفہوم پر دلالت
کرتا۔ قدیم مصریوں کا خط ایسا ہی تھا۔ قدیم سومری۔ بابلی اور ایرانی رسم الخط
اگرچہ اس مرحلے سے گذر چکے ہیں اور ترقی کر گئے ہیں۔ پھر بھی ایسی
علامتیں موجود ہیں جو کلمات پر دلالت کرتی ہیں۔ ایرانی (میخی) رسم الخط
میں چار علامتیں ہیں جن میں سے ہر ایک کسی کلمہ پر دلالت کرتی ہے
حساب میں خاص طور پر مفہوم نویسی کا زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ وہ علامات
ارقام میں مستعمل ہیں مثلاً ہم جب "+" لکھتے ہیں تو اسے "جمع" پڑھتے
ہیں۔ جب علامت ÷ لکھتے ہیں تو اسے "تقسیم" پڑھتے ہیں۔

۴۔ چوتھا مرحلہ ہجائی یا تقطیعی رسم الخط ہے۔ اس مرحلہ میں ہر
ہجّے کے لیئے ایک علامت ہے۔ یہ علامت آواز کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ
ایک ہجے یا چند حروف کے مجموعے کو اس رسم الخط کو سمجھنے کے لیے موجودہ
(الف بائی) رسم الخط کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ جبکہ اسے بغیر اعراب
(زیر۔ زبر۔ پیش) کے لکھیں۔ اگرچہ یہ خط ہجوں اور الف با سے مرکب ہے
تاہم زیادہ تر ہجوں والا ہے۔ سومری اور بابلی رسم الخط ہجوں والے تھے

اور مفہوم نویسی پر مبنی تھے۔

(۵) الف بائی رسم الخط:- یہ وہ رسم الخط ہے جس میں ہر آواز کے لئے ایک علامت یا حرف ہے۔ جیسے کہ عام جدید رسم الخط عربی۔ سنسکرت فارسی۔ انگریزی وغیرہ ہیں یورپ کے موجودہ رسم الخط الف بائی ہیں۔ قدیم رسم الخطوں میں اوستا کا رسم الخط پورے طور سے الف بائی تھا۔ فنیقیوں نے عبرانیوں سے رسم الخط مستعار لیا اور پھر براعظم یورپ میں پھیلایا بعض کی رائے ہے کہ انہوں نے یہ خط اہل مصر سے لیا۔ آرامیوں اور قبطیوں نے عبرانی خط اخذ کیا۔ اور اس کو مختلف شکلیں دیں۔ آرامی رسم الخط سے پہلوی اور قبطی رسم الخط پیدا ہوئے۔ ان رسم الخطوں سے ایسا رسم الخط وجود میں آیا جو ایشیا اور افریقہ میں مروّج ہوا چینی رسم الخط ان خطوں سے مستثنیٰ ہے اور کسی دوسرے منبع سے نکلا ہے۔ جاپان۔ سیام اور کوریا کے باشندوں کے رسم الخط چین کے رسم الخط سے ماخوذ ہیں۔

سوال۔ ایرانی رسم الخط (قدیم) کی ابتدا اور اس کے ارتقا پر روشنی ڈالئے۔

جواب:- اسلام کے غلبہ سے پہلے ایران میں تین قسم کے رسم الخط مروّج تھے۔ (۱) میخی خط (۲) اوستائی خط (۳) پہلوی خط۔ قدیم ایرانی بادشاہوں کے کتبے میخی خط میں تھے۔ پہلوی زبان کی کتابیں پہلوی رسم الخط میں لکھی گئیں۔ اور قدیم آتش پرستوں کی مذہبی کتاب اوستا، اوستائی زبان اور اوستائی خط میں مرقوم ہوئی۔ اسلام کی فتح کے بعد ایران میں عربی زبان کو ترقی ملی اور قدیم رسم الخطوں کی جگہ عربی رسم الخط مروّج ہو گیا۔ گو فارسی زبان نے عربی زبان اور ادب کے اثرات قبول کئے مگر اپنی اصل اور ماہیت کو قائم رکھا موجودہ فارسی زبان ایران کی اپنی قومی زبان ہے لیکن

رسم الخط غیر ملکی یعنی عربی ہے۔ ایران کے قدیم قومی رسم الخط کا ذکر حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) میخی خط :۔ اس رسم الخط کو یہ نام اس لئے دیا گیا کہ اس خط کے اجزا یا حروف کی صورت میخ یا کیل سے ملتی جلتی ہے۔ شروع شروع میں یہ خط بھی تصویری (HIEROGLYPH) تھا۔ بعد میں علامت نگار۔ پھر مفہوم نگار (IDEOGRAPH) اور آخر میں الف بائی یا حرف نگار (ALPHABETICAL) بن گیا۔ یورپی محققین کا عقیدہ ہے کہ ہخامنشی خاندان کے آغاز میں ایرانیوں نے اسیریا کے رسم الخط سے جو مفہوم نگاری (IDEOGRAM) کے مرحلہ میں تھا اپنا رسم الخط وضع کیا۔ اور اپنے میخی خط کو دوسرے تمام میخی خطوں مثلاً بابلی وغیرہ سے زیادہ سادہ اور صحیح بنایا اور بابلی (مفہوم نگار) خط کو ابجدی حروف یا حروف تہجی میں تبدیل کر لیا۔ بابلی خط میں بہت سی اصلاح کی۔ ٹیڑھی میڑھی میخوں یا خطوط کو ترک کر دیا۔ اور صرف سیدھی سادی لکیروں یعنی افقی اور عمودی میخوں کو اپنا لیا۔ ہخامنشی دور کے قدیم کتبے اسی رسم الخط میں ہیں۔ اس رسم الخط کے حروف تہجی کی تعداد چھتیس (۳۶) ہے۔ ان چھتیس حروف کے علاوہ ایک ٹیڑھی میخ بائیں سے دائیں بنائی جاتی ہے۔ جو خطِ فاصل کی علامت ہے۔ نیز ایرانی میخی خط میں پانچ مفہوم نگار علامات بھی ہیں۔

(۲) اوستائی خط : یہ رسم الخط ایرانیوں نے سامی خط سے اخذ کیا تھا چھٹی صدی قبل مسیح کے دوران میخی خط کے ساتھ ساتھ اوستائی خط بھی مستعمل تھا۔ میخی خط پتھروں پر کتبے کندہ کرنے کے لئے مخصوص تھا جبکہ

اوستائی خط تحریروں میں کام آتا تھا اور ایران قدیم کی مذہبی کتاب
"اوستا" اسی خط میں لکھی گئی تھی۔ یہ خط بھی سامی خط کے مانند بائیں سے
دائیں لکھا جاتا ہے اس خط کے حروف تہجی کی تعداد چوالیس (۴۴) ہے
ان حروف میں تمام آوازیں اور اعراب (زیر۔ زبر۔ پیش) داخل ہیں۔
پہلوی حروف میں یہ نقص تھا کہ ایک حرف کئی مختلف آوازوں کو ظاہر
کرتا تھا جس سے پڑھنے لکھنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی۔ قدیم ایرانی
عالموں نے اس نقص کو دور کر دیا۔ اور ایک حرف صرف ایک آواز کے
لئے وقف کر دیا جس سے رسم الخط آسان اور صحیح ہو گیا۔

(۳) پہلوی خط۔ اہل تحقیق کے مطابق "پہلوی" میں یائے نسبتی
ہے یعنی پہلو سے تعلق رکھنے والی "پہلو" بگڑی ہوئی صورت ہے "پلہو"
کی "پلہو" "بلشو" سے نکلا ہے۔ اور ش بدل کر ہ بن گئی۔ بلشو دراصل
"پرشو" تھا۔ کیونکہ "ر" بدل کر "ل" کی صورت ہو گئی۔ پرشو یا پرتھوا ایک قوم
کا نام ہے۔ جب اس اشکانی قوم "پرشو" کا اقتدار ملک ایران پر چھا گیا
تو فارسی زبان کا نام بھی اسی قوم کے نام پر پہلوی ہو گیا اور اس زبان
کا رسم الخط بھی پہلوی خط کہلایا۔ پہلوی زبان اشکانی اور ساسانی دور
کی زبان تھی جو درحقیقت قدیم فارسی زبان اور موجودہ فارسی زبان
کے درمیان کی کڑی ہے۔ اگر موجودہ فارسی زبان سے عربی الفاظ نکال
دیئے جائیں تو اس کی صورت بہت حد تک پہلوی زبان سے ملتی ہے۔
شاہنامہ فردوسی کی زبان بھی پہلوی زبان کے قریب ہے۔

پہلوی رسم الخط آرامی خط سے ماخوذ ہے۔ یہ خط دائیں سے بائیں
لکھا جاتا ہے۔ پہلوی خط کی دو صورتیں ہیں۔ ایک قدیم خط یا خط کلدہ

جو کتبوں کے سوا کہیں باقی نہیں۔ دوسری صورت کتابی یا ساسانی خط ہے۔ اس خط میں ساسانی عہد کی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ساسانی بادشاہوں کی بنائی ہوئی یادگاروں۔ تمغوں، نگینوں، مہروں اور سکّوں وغیرہ پر بھی پہلوی تحریریں موجود ہیں۔

پہلوی رسم الخط کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اس خط میں سامی زبان کے جو بہت سے الفاظ لکھے جاتے ہیں۔ وہ فارسی یعنی پہلوی زبان میں پڑھے جاتے ہیں۔ ایسی مثال اردو میں بھی موجود ہے۔ مثلاً عربی علامت عــہ جس کا مطلب عشر ہے۔ عربی صورت میں لکھی جاتی ہے لیکن اسے پڑھنے میں "دس" کہا جاتا ہے جو اردو کا عدد ہے۔ پہلوی زبان میں پڑھنے کے اس طرز کو "ہزوارش" کہتے ہیں۔

سوال: ایران کی قدیم زبان اور ادب (قبل اسلام) پر مفصل نوٹ لکھیے۔

جواب: میخی خط اور کتبے قدیم فارسی ہیں:۔ ایرانی ادب کا آغاز تاریخی طور پر دار یوش اعظم (۵۲۱ق۔م تا ۴۸۵ق۔م) کے وقت سے وجود میں آتا ہے۔ داریوش اعظم اپنے پیشرو ہخامنشی بادشاہوں پر کئی ایک لحاظ سے گوئے سبقت لے گیا۔ اس کی وسیع فتوحات اور امور سلطنت کی تنظیم قابل ذکر ہے۔ اس نے عظیم الشان تعمیرات بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ تخت جمشید (PERSEPOLIS) کے مقام پر کی دیواریں اور ستون اس کی عظمت کو ظاہر کرتے ہیں۔ تخت جمشید شیراز کے شمال مشرق میں چالیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور اسی جگہ داریوش اعظم نے اپنی فتوحات کی بے نظیر یادگاریں قائم کیں۔ اس نے

اس جگہ اور کئی مقامات پر شاہی احکام کندہ کروائے۔ یہ تمام کتبے اور نقوش قدیم فارسی زبان اور میخی رسم الخط میں ہیں۔ داریوش اعظم کے جانشین بادشاہوں خشنار پاشا۔ آردشیر اول۔ آردشیر دوم۔ کوروش خرو اور آردشیر سوم نے بھی اپنے اپنے کتبے۔ احکام اور واردات میخی خط میں چٹانوں۔ پتھروں وغیرہ پر کندہ کروائے۔ ان میخی کتبوں میں زیادہ مشہور اور قابل ذکر کتبے تخت جمشید۔ نقش رجب۔ نقش رستم۔ دشتِ مرغاب کرمانشاہ سے قریب کوہ بے ستون اور ہمدان سے قریب کوہ الوند میں موجود ہیں۔ صحیح معنوں میں ادبیات ایران کی بنیاد انہی کتبوں پر ہے ان کتبوں میں داریوش نے اپنے فرمان۔ اپنی عظیم فتوحات کے تذکرے اور اپنے شجرۂ نسب کے ساتھ کئی دوسرے امور اور واقعات کھدوائے۔ آج کے ایران کی زبان انہی کتبوں کی قدیم فارسی زبان سے نکلی ہوئی ہے۔

مشہور جرمن محقق ڈاکٹر مسٹیٹر کے بیان کے مطابق ان کتبوں میں مختلف الفاظ کی مجموعی تعداد چار سو سے زیادہ نہیں۔ ان کتبوں کے مضامین سے ہخامنشی وقتوں کے ایرانیوں کا مذہب صاف ظاہر ہے۔ وہ توحید الٰہی کے قائل تھے۔ ان کا سب سے بڑا پاک ترین خدا "آہرامزدا" (AHURA MAZDA) تھا اور ہر کام شروع کرتے وقت وہ اس خدا سے امداد کی دعا کرتے تھے۔ اور کامیابی کو اسی کی عنایت کا نتیجہ جانتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان کتبوں کے بغیر ہمارے لئے قدیم پارسی یا فارسی کا تاریخی مطالعہ اور آج سے قریباً ڈھائی ہزار سال پہلے کے

ایرانیوں کا مذہب معلوم کرنا ایک مشکل بلکہ ناممکن کام ہو جاتا۔
میخی زبان (قدیم فارسی) اور کتبوں کے علاوہ قدیم ایران کی زبان
اوستا بھی جو اصل میں قدیم فارسی سے رشتہ رکھتی تھی۔ جہاں قدیم فارسی
کتبوں میں مستعمل تھی وہاں اوستا کتابی زبان تھی۔ یہ زبان ایران کے شمال
میں رائج تھی اور زیادہ تر مذہبی پیشواؤں اور مقدس کتابوں کی زبان تھی۔
اوستا:۔ ایران قدیم کے سب سے پہلے پیغمبر زرتشت (ZOROASTER)
نے دین آتش پرستی کی بنیاد ڈالی۔ اس کی تعلیم اوستا میں شامل ہے جس میں خدائے
برترین کی تعریف کے ساتھ ساتھ دعا کے گیت بھی ملتے ہیں۔ زرتشت کی اُمت
اوستا کو الہامی کتاب مانتی ہے۔ اصلی اوستا موجودہ کتاب سے بہت زیادہ
ضخیم تھی۔ پارسی روایات کے مطابق ساسانی بادشاہوں کے وقت میں اوستا
کے حصے اکیس کتابوں پر مشتمل تھے۔ ہم تک صرف ایک مکمل کتاب اور چند
متفرق غیر مکمل حصے پہنچے ہیں۔ اوستا کا وہ حصہ جس میں چھوٹی چھوٹی
دعائیں ہیں خورد اوستا کہلاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مقدس گیت
(GATHAS) ہی زرتشت کے اپنے دماغ کا نتیجہ ہوں۔ پروفیسر جیکسن
کو ان میں خاص شعریت نظر آتی ہے۔ ان کی تعداد سترہ ہے۔ اوستا کا قدیم
ترین حصہ یہی ہیں۔ انہیں صحیفہ صغرا بھی کہا جاتا ہے۔ ڈارمیسٹیٹر کا عقیدہ ہے
کہ سکندر اعظم کے حملہ کے دوران اوستا ضائع ہو گئی تھی اور موجودہ اوستا
پارتھین اور ساسانی بادشاہوں کے حکم سے جمع اور مرتب کی گئی۔
اوستا کو عام طور پر چھ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:۔
(۱) یسنا (YASNA) اس میں گیت (گاتھاز) بھی شامل ہیں۔ یسنا
سے مراد پوجا اور یگیہ ہے۔

(۲) وسپیرد (VISPERED) اس کے لفظی معنی "جمہور یا عوام" کے ہیں۔ اس میں عام لوگوں کے لئے مذہبی رسوم و قواعد ہیں۔

(۳) یشت (YASHTS) اس میں خدائے برترین کی حمد میں اکیس بھجن ہیں۔

(۴) خردِ اوستا (MINOR TEXTS)

(۵) وندیداد (VENDIDAD) مذہبی قوانین اور قصّے کہانیاں اور شیاطین کے خلاف قانون۔

(۶) ہدوخوکت نسک کے اجزاء۔

اوستا میں جس مذہب کی تلقین کی گئی ہے اس کی تعلیمات کا لبِ لباب یہ ہے۔

خیالات پسندیدہ (HUMATA)

اقوال پسندیدہ (HUOCHTA)

اعمال پسندیدہ (HUWURSHTA)

اوستا کی ادبی خصوصیات:۔ اوستا کے کچھ حصّے ادبی محاسن کے حامل ہیں۔ ان میں خدا کی تعریف فصیح اور دلکش الفاظ اور انداز میں کی گئی ہے۔ ان میں قدرت کے مناظر کا بیان بھی قابلِ داد ہے۔ بعض حصّے منظوم اور مقفّیٰ ہیں گاتھا (گیت) میں نغمے۔ دعائیں اور بلند رتبہ اخلاقی اشعار ہیں۔

پہلوی زبان اور ادب:۔ ساسانی خاندان کے عہد کی ایرانی زبان کو پہلوی کہتے ہیں در اصل یہ قدیم فارسی کی ایک شاخ ہے۔ اسے درمیانی پارسی بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ قدیم فارسی اور موجودہ فارسی کے درمیان ایک کڑی کا کام کرتی ہے۔ اگر آج کل کی فارسی زبان سے

عربی زبان کے الفاظ نکال دیئے جائیں تو اس خالص فارسی زبان کی قدیم اور متروک شکل پہلوی زبان سے قریب پہنچ جائے گی۔ شروع میں تو لفظ "پہلوی" اس رسم الخط کے لئے وضع ہوا تھا جس میں ساسانی عہد کی درباری زبان لکھی جاتی تھی مگر عام استعمال نے اس لفظ کا مفہوم رسم الخط کی بجائے خود ایرانی زبان ہو گیا۔

پہلوی زبان کا ادب مکمل طور پر زرتشت کے مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور اکثر اخلاقی اور مذہبی اصولوں کے اظہار پر مشتمل ہے اور اوستا کے متن۔ اوستا کی شرح اور دوسرے دینی مسائل سے متعلق ہے۔

پہلوی ادب :-

(۱) اوستا کے پہلوی ترجمے۔ تقریباً ۲۷ کتابیں یا غیر مکمل رسالے جو ایک لاکھ اکتالیس ہزار الفاظ پر مشتمل ہیں۔

(۲) مذہبی موضوع پر کتابیں۔ تعداد میں تقریباً پچپن۔ چار لاکھ چھیالیس ہزار الفاظ پر مشتمل ہیں :-

(الف) دینکرت۔ آتش پرستوں کے اصولوں۔ رسم و رواج روایات۔ تاریخ و ادب کے متعلق اطلاعات کا ذخیرہ۔

(ب) بندا ہشن۔ مذہب کے متعلق ضخیم واقفیت۔

(ج) مینوئے خرد۔ نولدکی کے قول کے مطابق کتابی پہلو کی تعلیم شروع کرنے کو یہ ایک بہترین کتاب ہے۔

(۳) خالص ادبی یا تاریخی کتابیں۔ تعداد میں گیارہ۔

(الف) پارسیوں کے اجتماعی نظام کے اصول۔

(ب) شاہنامہ پہلوی یا شاہنامہ گشتاسپ (تاریخی ناول)
(ج) کارنامک ازتخششر پاپکاں۔ تاریخی ناول۔
دقیقی اور فردوسی نے شاہنامہ لکھنے میں انہی دو تاریخی ناولوں سے استفادہ کیا۔

(د) خسرو کاونان اور اس کے ساقی کی کہانی۔
(ہ) خطوط نویسی کے نمونے۔
(و) شطرنج کی تاریخ وغیرہ۔

سوال: ساسانی خاندان پر ایک مختصر نوٹ لکھئے:۔

جواب: ساسانی خاندان (۲۲۶ء تا ۶۵۱ء) سکندر اعظم کے ہاتھوں ہخامنشی خاندان کا صفایا ہو جانے کے بعد ایران پر پارتھیا کا اقتدار ہو گیا۔ آخر پارتھیا کا اقتدار بھی ختم ہونے لگا۔ ایران میں مغرب کے اثرات کے خلاف ایک سیاسی اور قومی بغاوت سی نمودار ہوئی جس نے زرتشت کے مذہب کو ایک بار پھر زندہ کر دیا۔ خالص ایرانی جذبات تمام ملک پر چھا گئے نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۲۶ء میں اردشیر بابکاں ساسانی خاندان کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ایرانی بادشاہوں کی نسل سے تھا اور اپنا شجرہ نسب ہخامنشی خاندان کے ساتھ ملانے میں جائز فخر کرتا تھا۔ اردشیر کا سب سے بڑا کارنامہ شاید یہ ہے کہ اس کے عہد میں اوستا کو نئے سرے سے ترتیب دی گئی۔

ساسانی خاندان کی شوکت میں ہخامنشی وقار کی جھلک جا بجا پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس خاندان کی تاریخ بھی روشن ہے اور مستند۔ ساسانی عہد کے نقوش اور یادگاریں عرب اور ایرانی

موزخوں کی کوششوں کو خوب چمکا رہی ہیں۔ مختلف قوموں کے افسانہ نگاروں نے ساسانی عہد کے متعلق بیش قیمت شاہکار پیش کئے ہیں اس خاندان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اردشیر کا باپ ساسان تھا۔ جو دارِیوش بزرگ کی اولاد سے تھا۔ ساسانی عہد کے ایران میں بادشاہ کو خدا کا نائب اور حکومت کا واحد اور جائز حقدار خیال کیا جاتا تھا۔ شاید اسی عظمت اور وقار کے حاصل کرنے کو ساسانیوں کا شجرۂ نسب حضرت زرتشت کے محافظ گشتاسپ سے ملا دیا گیا تھا۔

اردشیر کے وقت سے ایران کی باقاعدہ تاریخ شروع ہوتی ہے۔

اردشیر کے بعد اس کا بیٹا شاپور اوّل تخت پر بیٹھا۔ اس نے یونانیوں پر بہت سی فتوحات حاصل کیں اور ان فتوحات کی خوشی میں نقش رستم۔ اور شاپور کی سی یادگاریں قائم کیں۔ مانی جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا شاپور کے وقت ہی میں ہوا ہے۔ پہلے تو بادشاہ اس پر مہربان تھا۔ آخر کسی بات پر ناراض ہو گیا۔ اور مانی کو اِدھر اُدھر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔

شاپور اوّل کے بعد ہرمس واس۔ بہرام اوّل اور بہرام ثانی وغیرہ تخت نشین ہوئے۔ ان کے بعد شاپور اعظم تخت پر بیٹھا۔ اس کا عہد عظیم فتوحات اور جھموں کے لئے مشہور ہے شاپور اعظم کے وقت میں عیسائی مذہب پر بہت سی سختیاں کی گئیں۔ شاپور اعظم نے ستر سال تک حکومت کی۔ اور ۳۷۹ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اردشیر ثانی شاپور سوم اور بہرام چہارم۔ یزدجرد اور بہرام گور وغیرہ تخت پر بیٹھے۔ ان کے بعد قباد بادشاہ بنا۔ مزدک جس نے خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کیا

تھا۔ قباد کے وقت میں ہوا ہے۔ قباد کے بعد نوشیرواں عادل نے تخت ساسانی کو زینت بخشی۔ اس کا نام انصاف، سیاسی تنظیم اور فتوحات کے لئے زندہ جاوید ہے۔

تمام ساسانی بادشاہ زرتشت کے مذہب پر ایمان رکھتے تھے۔ ان کا زمانہ ملکی اور ملی تاریخ میں ایک روشن انقلاب کا زمانہ ہے۔ ایرانی فوج نے اپنی عظیم طاقت کا سکّہ سارے یورپ کے دل پر بٹھا لیا۔ سڑکوں، پلوں، شہروں اور رفاہ عامہ کے دوسرے کاموں کی طرف ساسانی بادشاہ خاص توجہ دیتے تھے۔ لڑائی کے فن نے بہت ترقی کی یہ عہد پہلوی زبان کے عروج کا عہد ہے۔ بہت سی کتابوں کے پہلوی میں ترجمے کئے گئے۔ مستقل کتابیں بھی لکھی گئیں۔

اس عہد کی تعمیریں بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ فیروزآباد محل۔ طاق کسریٰ۔ قصر شیریں۔ نقش رستم۔ خسرو پرویز کے شکار کے مناظر شاپور اوّل کا بت۔ سونے چاندی کا کام اور کئی دوسرے فنونِ لطیفہ ساسانی آرٹ کی خوب ترجمانی کرتے ہیں۔ خسرو پرویز کا زمانہ سیاسی اعتبار سے بھی بہت اہم ہے۔

یزدجرد سوم تھا تو جنگجو بادشاہوں کی اولاد سے لیکن اس کی بزدلی ساسانی خاندان کے ماتھے پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ یوں تو اس کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے ہی ساسانی ستون متزلزل ہونے لگے تھے مگر عرب جرنیلوں کے ہاتھوں اس عظیم خاندان پر جو ضرب کاری لگی وہ یزدجرد کی قسمت میں لکھی تھی۔ اس نے ۶۵۲ء میں وفات پائی۔

سوال۔ ایران پر عرب حملہ اور غلبہ کے اثرات واضح کیجئے۔

جواب: ۶۵۱ ء میں ساسانی خاندان کے آخری بادشاہ یزدجرد سوم نے عرب فاتحین کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اہلِ عرب کی فتوحات اسلام کی ترقی اور اشاعت کا موجب بنیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ فارس کو بادل ناخواستہ اپنا قدیم مذہب ترک کر کے اسلام قبول کرنا پڑا۔ عربوں کے اثرات ایران کی زندگی کے ہر شعبے پر پڑے۔ پہلوی زبان نے عربی کے لئے جگہ خالی کر دی۔ نومسلموں کے لئے عربی زبان کی تعلیم ناگزیر ہو گئی۔ دفاتر اور دربار کی زبان بھی عربی ہو گئی۔ بادشاہی فرمانوں سے لے کر دفتروں کے احکام تک اسی زبان میں جاری ہونے لگے۔ اسی میں خط و کتابت ہونے لگی۔ القصہ جملہ علوم و فنون نے عربی چولا پہن لیا۔ یہاں تک کہ ایران دوست اہلِ قلم کی زبان پر بھی عربی کے الفاظ روانی اور بے تکلفی سے بچھرنے لگے۔ بہت سے ایرانی عالموں نے عربی زبان میں شعر بھی کہے۔ عربوں کے غلبہ کے بعد صدیوں تک عربی زبان میں مذہبی کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ گویا عربی ایران کی نہ صرف سرکاری بلکہ ادبی زبان بھی بن گئی۔ فارسی کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہوتی گئی۔ کیونکہ اس زمانے میں مسلمان قرآن کے سوا ہر کتاب کو اور عربی زبان کے سوا ہر زبان کو ناقابلِ توجہ سمجھتے تھے۔ فارسی کے زوال کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پہلوی کے مقابلے میں عربی زبان زیادہ وسیع اور فصیح ہے اور ہر قسم کے خیال ادا کرنے پر حاوی ہے۔

عربی جاننے اور لکھنے والے ایرانیوں میں ذیل کی شخصیتیں قابلِ ذکر ہیں۔

عرب دورِ حکومت میں ابن مقفع کا نام صفِ اوّل کے ایرانی علمائے

عربی میں شامل ہے۔ وہ پہلوی اور عربی دونوں زبانوں کا عالم تھا۔ اس نے "کلیلہ و دمنہ" نام کی کتاب پہلوی سے عربی میں منتقل کی۔ یہ سنسکرت کی کتاب ہتُوپدیش کا ترجمہ ہے۔ اور عربی کے نثری ادب میں بلند مقام رکھتی ہے۔ ابن مقفع نے ایک اور پہلوی تصنیف "خدای نامک" کا ترجمہ عربی زبان میں کیا۔ مگر سوائے اقتباسات کے یہ کتاب مفقود ہو چکی ہے۔ وہ یونانی فلسفہ سے بھی واقف تھا۔

عربی کے ایک اور عظیم المرتبہ ایرانی عالم ہوئے ہیں جن کا نام امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت ہے۔ آپ حنفی مذہب کے بانی اور علم فقہ کے بڑے عالم شمار کئے جاتے ہیں۔

سیبویہ نحوی نام کے ایک اور ایرانی عالم ہوئے ہیں۔ انہوں نے صرف و نحو کے مسائل پر ایک نہایت اہم اور مستند کتاب لکھی جس کا نام "الکتاب" ہے۔ اس میں عربی زبان کے اصول و قواعد کی وضاحت کی گئی ہے۔ ایران نے عربی زبان کے شاعر بھی پیدا کئے ان میں بشار اور ابونواس کے نام قابل ذکر ہیں۔ بشار پیدائش سے ہی اندھا تھا اور عباسیوں کے دربار کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے قصیدے لکھے اور قصیدہ گو کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ابونواس کے دلکش اشعار اور دیوان باقی ہے۔ یہ بھی عباسی خلفا کا درباری شاعر تھا۔

خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں موسیٰ بن شاکر خوارزمی ایک اعلیٰ پایہ کا منجم تھا۔ یہ ایرانی علم ہندسہ کا ماہر تھا۔ اس کے بیٹے محمد۔ احمد اور حسن بھی تیسری صدی ہجری کے بزرگ ترین علما میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے یونان کی علمی کتابیں جمع کیں اور بڑی محنت و زحمت کے ساتھ انہیں

عربی زبان میں ڈھالا۔ علم ہندسہ۔ حساب۔ اقلیدس اور محیطی کے استاد تھے۔ احمد نے مامون کے حکم پر محیط زمین کی مساحت کی تھی اس کی اہم ترین کتاب "کتاب الحیل" ہے۔ یہ طبعی علوم اور صنائع سے متعلق ہے۔

عربوں کے دَورِ حکومت میں پہلوی زبان پر عربی کا اثر نمایاں ہے پہلوی زبان میں بے حد تغیرات رونما ہوئے۔ پہلوی اور عربی کے میل جول سے موجودہ فارسی پیدا ہوئی۔ پہلوی اور موجودہ فارسی میں بڑا فرق یہ ہے کہ موجودہ فارسی زبان کا رسم الخط عربی ہے۔ اس کے علاوہ عربی زبان کے بے شمار الفاظ فارسی میں داخل ہوگئے۔ عربی الفاظ کا استعمال علم و ادب کی شان سمجھا جاتا تھا۔ عربی الفاظ کے علاوہ عربی زبان کی وساطت سے یونانی۔ آرامی اور لاطینی وغیرہ کے الفاظ بھی اسی زمانے میں فارسی میں استعمال ہونے لگے۔

مثالیں:-

یونانی الفاظ: دینار۔ الماس۔ پیالہ۔ سندل۔ دیہیم۔ فنجان۔

آرامی: کنشت (کنیسہ) چلیپا (صلیبا) جزیہ (گزیت) مسجد (مزگت) تابوت۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل الفاظ بھی غیر زبانوں سے ماخوذ ہیں:-

قیصر۔ قانون۔ طلسم۔ کیمیا۔ چاشنی (کاتولیک)

پہلوی زبان کے اکثر الفاظ کی صورت موجودہ فارسی میں بہت بدل گئی ہے۔ مثلاً

اباک = با۔ ابر = بر۔ اپورناک = برنا۔ اروميک = رومی
زیوندک = زندہ۔ ہماگوں۔ ہمایوں۔ پتنگر = پیکر

پتغام = پیغام ہتوستن = پیوستن - اکاس = آگاہ۔
یکر = جگر نکاس = نگاہ گرنگ = گروہ - نامک = نامہ
ورتک = ورد (گل)

سوال: "فارسی شاعری کی ابتدا اور ترقی کب اور کیسے ہوئی؟ یا کیا یہ صحیح ہے کہ فارسی شاعری کی ترقی کی ابتدا ساماانی خاندان سے منسوب ہے۔"؟

جواب: خاندان سامانیہ سے پہلے شعر کا پتہ نہیں چلتا اور اگر کوئی ایک آدھ شعر مل بھی جاتا ہے تو وہ لوازم شعری سے کورا ہوتا ہے تقریباً تمام فارسی تذکرہ نویس ذیل کے شعر کو بہرام گور کے نام سے منسوب کرتے ہیں:۔

منم آں شیر گلہ و منم آں پیل یلہ نام من بہرام گور بوجبلہ

شعر کے الفاظ اس طرح الٹ پلٹ کر دیئے گئے ہیں کہ بحر اور وزن بالکل بدل گیا ہے۔

عوفی نے جس طرح لکھا ہے وہ نثر سے ملتی جلتی بحر ہے جو عرب کا مذاق ہے۔ بخلاف اس کے اور تذکرہ نویسوں نے اس کو آج کل کی مروّجہ فارسی بحروں کے موافق کر دیا ہے۔

غرض بہرام گور کے چند موزوں کلمات کو شاعری کا سنگ بنیاد نہیں کہہ سکتے۔ اصل یہ ہے کہ ایران میں خالص عرب کی حکومت نے فارسی شاعری کو دبائے رکھا۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں:۔ سلسلہ سامانیہ سے پہلے جو خاندان گذرے وہ طاہریہ اور صفاریہ تھے۔ طاہریہ عربی النسل تھا۔ اس

لئے فارسی شاعری کو اس زمانے میں عروج نہیں ہو سکتا تھا۔ صفاریہ نو دولت اور کم اصل تھے اور ان کی حیثیت ایک فتنہ جو باغی سے بڑھ کر نہ تھی (خاندان صفاریہ کا بانی یعقوب بن لیث الصفار یعنی .... (COPPERSMITH) یا ٹھٹھیار تھا) لیکن سامانی خاندان نسل کیان کی یادگار تھا۔ ان کی سلطنت نے ایک سو دس برس کی عمر پائی۔ قدردان علم و فن ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی صاحب کمال اور سخن سنج تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اہل عجم اپنے لٹریچر اور ملکی خصوصیات سے بالکل الگ ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی شاعرانہ قوتیں بالکل غیر زبان (عربی) پر صرف ہو رہی ہیں۔ خراسان اور بخارا میں سینکڑوں ہزاروں شعرا موجود ہیں جو نسلاً عجمی ہیں لیکن دارالخلافہ بغداد کے اثر سے جو کچھ کہتے ہیں عربی میں کہتے ہیں۔ ان اسباب سے اس خاندان نے اپنی قومی اور ملکی زبان کی ترقی پر شاہانہ توجہ کی۔ شعرا کی بخشش مقرر تھا۔ مقرر کیں۔ خاص خاص مضامین پر اشعار لکھوائے۔ نصر بن احمد سامانی نے رودکی کو حکم دیا کہ کلیلہ و دمنہ کو فارسی میں نظم کر دے۔ عجم کی تاریخ اب تک نامرتب اور پریشان تھی۔ اس لئے دقیقی (وفات ۹۷۵ء) کو اس کام پر مامور کیا چنانچہ اس نے ہزار شعر لکھے اور یہ شاہنامہ فردوسی کا پہلا سنگ بنیاد تھا۔

شعرائے سامانیہ میں ذیل کے شعرا خاص حیثیت رکھتے ہیں:
ابوالعباس۔ ابوشکور بلخی۔ ابواسحاق۔ جوئباری۔ ابوالحسن کسائی شہید بلخی۔ رودکی۔ دقیقی۔ رابعہ وغیرہ۔

رابعہ۔ رودکی کی ہمعصر تھی اور اعلیٰ درجہ کے شعرائے صوفیہ میں شمار

پغام = پیغام   پوستین = پوستین   الماس = آگاہ ۔
نیکر = جگر   مجلس = نگاہ   کرانہ = گروہ ۔   نامک = نامہ
ورنگ = ورد (دگی)

سوال :- فارسی شاعری کی ابتدا اور ترقی کب اور کیسے ہوئی ؟ یا کیا یہ صحیح ہے کہ فارسی شاعری کی ترقی کی ابتدا سامانی خاندان سے منسوب ہے ۔؟

جواب :- خاندان سامانیہ سے پہلے شعر کا پتہ نہیں چلتا اور اگر کوئی ایک آدھ شعر مل بھی جاتا ہے تو وہ لوازم شعری سے کورا ہوتا ہے تقریباً تمام فارسی تذکروں میں ذیل کے شعر کو بہرام گور کے نام سے منسوب کرتے ہیں :-

منم آں شیر گلہ ومنم آں پیل یلہ   نام من بہرام گور بوجبلہ

شعر کے الفاظ اس طرح الٹ پلٹ کر دیئے گئے ہیں کہ بحر اور وزن بالکل بدل گیا ہے ۔

عوفی نے جس طرح لکھا ہے وہ نثر سے ملتی جلتی بحر ہے جو عرب کا مذاق ہے ۔ بخلاف اس کے اور تذکرہ نویسوں نے اس کو آج کل کی مروجہ فارسی بحروں کے موافق کر دیا ہے ۔

غرض بہرام گور کے چند موزوں کلمات کو شاعری کا سنگ بنیاد نہیں کہہ سکتے ۔ اصل یہ ہے کہ ایران میں خالص عرب کی حکومت نے فارسی شاعری کو دبائے رکھا ۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں :- سلسلہ سامانیہ سے پہلے جو خاندان گذرے وہ طاہریہ اور صفاریہ تھے ۔ طاہریہ عربی النسل تھا ۔ اس

لئے فارسی شاعری کو اس زمانے میں عروج نہیں ہو سکتا تھا۔ صفاریہ
نو دولت اور کم اصل تھے اور ان کی حیثیت ایک فتنۂ جو باغی سے بڑھ کر
نہ تھی (خاندان صفاریہ کا بانی یعقوب بن لیث الصفار یعنی ....
(COPPERSMITH) یا ٹھٹھیار تھا) لیکن سامانی خاندان نسل
کیان کی یادگار تھا۔ ان کی سلطنت نے ایک سو دس برس کی عمر پائی۔
قدر دان علم و فن ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی صاحب کمال اور
سخن سنج تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اہل عجم اپنے لٹریچر اور ملکی خصوصیات سے
بالکل الگ ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی شاعرانہ قوتیں بالکل
غیر زبان (عربی) پر صرف ہو رہی ہیں۔ خراسان اور بخارا میں سینکڑوں
ہزاروں شعرا موجود ہیں جو نسلاً عجمی ہیں لیکن دارالخلافہ بغداد کے اثر سے
جو کچھ کہتے ہیں عربی میں کہتے ہیں۔ ان اسباب سے اس خاندان نے
اپنی قومی اور ملکی زبان کی ترقی پر شاہانہ توجہ کی۔ شعرا کی بیش قرار تنخواہیں
مقرر کیں۔ خاص خاص مضامین پر استادوں سے لکھوائے۔ نصر بن احمد سامانی
نے رودکی کو حکم دیا کہ کلیلہ و دمنہ کو فارسی میں نظم کر دے۔ عجم کی تاریخ اب
تک نامرتب اور پریشان تھی۔ اس لئے دقیقی (وفات ۳۴۱ھ) کو اس
کام پر مامور کیا چنانچہ اس نے ہزار شعر لکھے اور یہ شاہنامہ (فردوسی)
کا پہلا سنگ بنیاد تھا۔

شعرائے سامانیہ میں ذیل کے شعرا خاص حیثیت رکھتے ہیں:

ابوالعباس۔ ابوشکور بلخی۔ ابواسحاق۔ جوئباری۔ ابوالحسن کسائی
شہید بلخی۔ رودکی۔ دقیقی۔ رابعہ وغیرہ۔

رابعہ۔ رودکی کی ہمعصر تھی اور اعلیٰ درجہ کے شعرائے صوفیہ میں شمار

پتغام = پیغام   ہتوستن = ہیوستن۔   اکاس = آگاہ۔
یکر = جگر   نکاس = نگاہ   گرنک = گروہ۔   نامک = نامہ
ورتک = ورد (گُل)

سوال: "فارسی شاعری کی ابتدا اور ترقی کب اور کیسے ہوئی؟ یا کیا یہ صحیح ہے کہ فارسی شاعری کی ترقی کی ابتدا سامانی خاندان سے منسوب ہے۔؟"

جواب: خاندان ساسانیہ سے پہلے شعر کا پتہ نہیں چلتا اور اگر کوئی ایک آدھ شعر مل بھی جاتا ہے تو وہ لوازم شعری سے کورا ہوتا ہے۔ تقریباً تمام فارسی تذکرہ نویس ذیل کے شعر کو بہرام گور کے نام سے منسوب کرتے ہیں:۔ ؎

منم آں شیر گلہ و منم آں پیل یلہ   نام من بہرام گور بوجبلہ

شعر کے الفاظ اس طرح الٹ پلٹ کر دیئے گئے ہیں کہ بحر اور وزن بالکل بدل گیا ہے۔

عوفی نے جس طرح لکھا ہے وہ نثر سے ملتی جلتی بحر ہے جو عرب کا مذاق ہے۔ بخلاف اس کے اور تذکرہ نویسوں نے اس کو آج کل کی مروّجہ فارسی بحروں کے موافق کر دیا ہے۔

غرض بہرام گور کے چند موزوں کلمات کو شاعری کا سنگ بنیاد نہیں کہہ سکتے۔ اصل یہ ہے کہ ایران میں خالص عرب کی حکومت نے فارسی شاعری کو دبائے رکھا۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں:۔ سلسلہ سامانیہ سے پہلے جو خاندان گذرے وہ طاہریہ اور صفاریہ تھے۔ طاہریہ عربی النسل تھا۔ اس

لئے فارسی شاعری کو اس زمانے میں عروج نہیں ہو سکتا تھا۔ صفاریہ نو دولت اور کم اصل تھے اور ان کی حیثیت ایک فتنہ جو باغی سے بڑھ کر نہ تھی (خاندان صفاریہ کا بانی یعقوب بن لیث الصفار یعنی ...... (COPPERSMITH) یا ٹھٹھیارا تھا) لیکن سامانی خاندان نسل کیان کی یادگار تھا۔ ان کی سلطنت نے ایک سو دس برس کی عمر پائی۔ قدر دان علم و فن ہونے کے ساتھ وہ خود بھی صاحب کمال اور سخن سنج تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اہل عجم اپنے لٹریچر اور ملکی خصوصیات سے بالکل الگ ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی شاعرانہ قوتیں بالکل غیر زبان (عربی) پر صرف ہو رہی ہیں۔ خراسان اور بخارا میں سینکڑوں ہزاروں شعرا موجود ہیں جو نسلاً عجمی ہیں لیکن دار الخلافہ بغداد کے اثر سے جو کچھ کہتے ہیں عربی میں کہتے ہیں۔ ان اسباب سے اس خاندان نے اپنی قومی اور ملکی زبان کی ترقی پر شاہانہ توجہ کی۔ شعرا کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں۔ خاص خاص مضامین پر استادوں سے لکھوائے۔ نصر بن احمد سامانی نے رودکی کو حکم دیا کہ کلیلہ و دمنہ کو فارسی میں نظم کر دے۔ عجم کی تاریخ اب تک نامرتب اور پریشان تھی۔ اس لئے دقیقی (وفات ۳۶۷ھ) کو اس کام پر مامور کیا چنانچہ اس نے ہزار شعر لکھے اور یہ شاہنامہ فردوسی کا پہلا سنگ بنیاد تھا۔

شعرائے سامانیہ میں ذیل کے شعرا خاص حیثیت رکھتے ہیں:

ابو العباس۔ ابو شکور بلخی۔ ابو اسحاق۔ جو یباری۔ ابو الحسن کسائی شہید بلخی۔ رودکی۔ دقیقی۔ رابعہ وغیرہ۔

رابعہ۔ رودکی کی ہمعصر تھی اور اعلیٰ درجہ کے شعرائے صوفیہ میں شمار

ہوتی ہے۔ گویا سامانیہ کے دور میں شعر و شاعری کا مذاق عورتوں میں بھی پھیلنے لگا تھا۔ ایرانی ادب کی ترقی کے متعلق مولانا آزاد کے الفاظ کس قدر موزوں ہیں :-

زبان فارسی کے لئے قدرتی سامان یہ ہوا کہ سامانیوں نے ماوراء النہر میں قومی سلطنت کا نشان قائم کیا۔ امیر اسماعیل سامانی نے ترکستان۔ خراسان۔ اصفہان وغیرہ پر حکومت پھیلا دی۔ جب تک خاص عرب حاکم تھے تب تک عربی زبان نے ملکی زبان کو دبائے رکھا۔ اب حاکم وقت خود اسی خاک کا پتلا ہوا۔ وہ بہرام چوبیں کی اولاد سے تھا جس طرح عرب کو اپنی عربی سے محبت تھی۔ اُسے اپنے باپ دادا کی زبان کی محبت ضرور ہوگی۔ غرض خواہ اُس محبت سے خواہ ملکی مصلحت سے اس نے عربی زبان کی وہ پابندی نہ رکھی ہوگی جو اب تک تھی۔ ۳۴۴ھ میں تمام دفاتر فارسی ہو گئے۔ ۳۵۰ھ کے قریب یہاں تک نوبت پہنچی کہ منصور سامانی کے وزیر نے تاریخ طبری کا ترجمہ فارسی میں کیا اور رودکی شاعر جیسے ناظم فارسی کا آدم اول کہنا چاہئے درباروں اور جلسوں میں غزلیں اور قصیدے گانے لگا۔" جدید تحقیقات کے مطابق گو فارسی شاعری کا آغاز اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ تذکرہ نویسیوں کے قول کے مطابق اولین فارسی شعرا دو ہیں۔ حکیم ابوحفص سغدی اور عباس مروی۔ یہ دونوں شاعر ایران کی آزادی کے زمانے سے پہلے ہوئے ہیں۔ سغدی نحوی بھی تھا اور لغوی بھی۔ وہ موسیقی سے بھی واقف تھا۔ عباس کو عربی زبان پر بھی عبور حاصل تھا اس کے فارسی اشعار وہ مشہور ہیں جو اس نے مرو میں خلیفہ مامون کے ورود

پر لکھے۔ اور ان میں اس کی مدح کی۔

سامانی خاندان سے پہلے طاہری اور صفاری خاندان ہوئے ہیں۔ ان کے عہد حکومت میں بھی فارسی کے شعرا ہوئے ہیں۔ طاہر نے خلیفہ مامون کی اپنے بھائی کے خلاف مدد کی تھی جس کے صلے میں طاہر کو خراسان کی امارت مل گئی۔ طاہر چونکہ فارسی النسل تھا۔ اس لئے اس نے فارسی زبان اور ادب کے فروغ میں دلچسپی لی۔ طاہریوں کے دور کا مشہور ترین شاعر حنظلہ بادغیسی تھا۔ وہ صاحب دیوان تھا۔

صفاری دور (۲۴۵ھ تا ۲۹۰ھ) میں فارسی زبان اور ادب کو طاہری عہد کی نسبت زیادہ ترقی نصیب ہوئی۔ صفاریہ خاندان کا بانی یعقوب بن لیث عربی زبان سے ناواقف تھا۔ اس لئے اس کی مدح میں جو عربی قصیدے لکھے گئے اس نے ناپسند کئے اور فارسی میں لکھنے کی تاکید کی۔ اس لئے یعقوب کی سرپرستی سے فارسی زبان اور ادب کو بڑی وسعت ملی۔ صفاریوں کے دربار کے مشہور ترین شاعروں میں فیروز مشرقی کا نام قابل ذکر ہے۔ اس نے فارسی شاعری میں اصلاح کی۔ اس کی وفات ۲۸۳ھ میں ہوئی۔ اس دور کا ایک اور شاعر ابوسلیک گرگانی ہے۔ یہ بھی فیروز مشرقی کی طرح عمرو بن لیث کا ہمعصر تھا۔ صفاری دور کا ایک اور شاعر محمد بن وصیف ہے۔ یہ یعقوب کا دبیر تھا۔ اور اس نے اس کی مدح میں فارسی شعر کہے تھے۔

دورِ سامانیہ

(۸۷۴ء تا ۹۹۹ء)

سوال :- ابوشکور بلخی کی زندگی اور شاعری سے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔

جواب : ابوشکور بلخی سامانی دور کے وسط (بو رحدود ۹۵۰ء) میں ہوا ہے وہ نوح بن نصر کے دربار سے وابستہ تھا۔ ابوشکور بلخی کو رباعی کا موجد تسلیم کیا جاتا ہے اور رباعی وہ صنفِ شاعری ہے کہ بعد کی صدیوں میں اس سے نہایت مفید اور دلکش کام لئے گئے ہیں۔ اگرچہ ابوشکور کے کلام میں عرفان۔ فلسفہ اور تصوف کے دقیق مسائل بیان نہیں کئے گئے۔ تاہم اس کی روانی۔ تازگی۔ اور سلاست قابل داد ہیں۔ ابوشکور کے منظومات میں ایک مثنوی بھی شامل ہے جس کا نام آفرین نامہ ہے۔ اس مثنوی کو شاعر نے ۳۳۳ھ میں شروع کر کے ۳۳۶ھ میں ختم کیا۔ بعض محققین کی رائے میں وہ پہلا مثنوی گو شاعر ہے۔ آفرین نامہ کے متفرق اشعار باقی رہ گئے ہیں۔ ان میں سے چند نمونہ کے طور پر نقل کئے جاتے ہیں:-

(۱)

خردمند گوید خرد پادشاست — کہ بر خاص و بر عام فرماں رواست

خرد را تن آدمی لشکر است — ہمہ شہوت و آرزو چاکر است

ان اشعار میں شاعر نے عقل کی قوت اور سرداری بیان کی ہے

انسان کی تمام خواہشات اس کی عقل کے تابع ہیں۔ گویا عقل حاکم ہے اور جسم محکوم۔ عقل سے ہی انسان خاص و عام پر حکومت کرتا ہے۔

(۳)

کسے کو بدانش بر روزگار | نہ او باز ماند نہ آموزگار

اس شعر میں بھی عقل کی فضیلت واضح کی گئی ہے۔ انسان پر واجب ہے کہ کامیاب زندگی کے لئے عقل سے کام لے اور پھونک پھونک کر قدم رکھے۔ ذیل کے شعر سے علم و ہنر کی اہمیت ملاحظہ ہو:

چوں دینار باید مرا یا درم | فراز آورم من ز نوکِ قلم

ابوشکور نے ذیل کے شعر میں ایک پتے کی بات کہی ہے۔ وہ یہ کہ دشمن پر کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ اس حقیقت کی تائید کے لئے تاریخ شاہد ہے:۔

بدشمن برت مہربانی مباد | کہ دشمن درختے است تلخ از نہاد

مندرجۂ ذیل اشعار میں موروثی خصلت کے اثر کو دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

درختے کہ تلخش بود گوہرا | اگر چرب و شیریں دہی مر ورا
ہماں میوۂ تلخت آرد پدید | از و چرب و شیریں نخواہی مزید

یونانی حکما کے فلسفہ کا ایک اہم نکتہ ذیل کے شعر سے ملاحظہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم و دانش کے سمندر کی کوئی تھاہ نہیں۔ اور انسان خواہ کتنا ہی عالم ہو آخر نادان ہی رہتا ہے:۔

تا بدانجا رسید دانش من | کہ بدانم ہمی کہ نادانم

سوال: حکیم کسائی مروزی کی زندگی اور شاعری پر نوٹ لکھئے:۔

جواب: حکیم کسائی مروزی سامانی عہدِ حکومت کا ایک بلند درجہ شاعر تھا۔ اس کے ہمعصر حکما اور شعرا اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے بعد میں آنے والے شعرا و مشہور شاعر ناصر خسرو نے بھی اپنے کلام میں اس کی عظمت کا دم بھرا ہے۔ ایک شاعر یوں اس کا ذکر خیر کرتا ہے:

من چاکرِ غلام کسائی کہ او بگفت	جان و خرد رونده بر این چرخِ اخضر ند

ذیل کے شعر میں عمارہ مروزی نے رودکی کی کنایتہً تعریف کے ساتھ کسائی کی بھی مدح سرائی کی ہے:

زیبا بود ار مرو بنازد بکسائی	چونانکہ جہاں جملہ باستاد سمرقند

حکیم کسائی کا پورا نام ابوالحسن مجدالدین اسحاق کسائی ہے۔ وہ ۳۴۱ھ میں پیدا ہوا اور لگ بھگ سو سال کی عمر پائی۔ جیسا کہ اس کے حضرت علی کی مدح میں کہے گئے اشعار سے ظاہر ہے وہ مذہباً شیعہ تھا۔ کسائی کی شاعری کے عام موضوع دینیات حکمت۔ پند و نصیحت سیرت و اخلاق ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے اس نے ناصر خسرو کے لئے میدان تیار کیا۔ چنانچہ ناصر خسرو نے مذہبی عقاید، علم و حکمت اور زہد و تقویٰ سے متعلق لمبے لمبے قصیدے لکھے ہیں۔ اور جابجا کسائی کا ذکر کیا ہے۔

حکمت اور اخلاق اور دینیات کے علاوہ کسائی نے حسنِ فطرت پر بھی توجہ دی ہے قدرت کے نظارے اسے بہت بھائے ہیں۔ پھولوں کو دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ نیلوفر سے اسے خاص طور پر عشق ہے۔ اسے وہ تیغِ آبدار سے مشابہ کرتا ہے۔ پھولوں کے پکنے اور خاک میں ملنے پر اسے بے حد افسوس ہوتا ہے۔ حسنِ فطرت کے

بیان میں وہ تشبیہات اور استعارات سے بھی کام لیتا ہے۔ جو سادہ اور اچھوتے ہیں۔ ان سے اس کے کلام کی تاثیر اور دلکشی بڑھ جاتی ہے۔
نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

نیلوفر کبود نگہ کن میان آب ۔۔۔ چون تیغ آبدادہ و یاقوت آبدار
ہمرنگ آسمان و بکردار آسمان ۔۔۔ زرد نقش در میانہ چو ماہ دہ و چہار

گل نعمتے است ہدیہ فرستادہ از بہشت ۔۔۔ مردم کریم تر شوند اندر نسیم گل
اے گلفروش گل چہ فروشی برائے سیم ۔۔۔ وز گل عزیزتر چہ ستانی بسیم گل

کسائی دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائداری سے متاثر تھا۔ اور اس کا ذکر جا بجا اپنے قصیدوں میں کیا ہے۔ خاص طور پر اس قصیدے میں جو اس نے اپنے حال پر لکھا ہے اس فانی دنیا اور ناپائیدار زندگی کا شدید رنج کے ساتھ رونا رویا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

درم خریدۂ آزم ستم رسیدۂ حرص ۔۔۔ نشانۂ حدثانم شکار ذلّ سوال
دریغ فر جوانی دریغ عمر لطیف ۔۔۔ دریغ صورت نیکو دریغ حسن جمال
کجا شد آں ہمہ خوبی کجا شد آں ہمہ عشق ۔۔۔ کجا شد آں ہمہ نیرو کجا شد آں ہمہ حال

سوال :- رودکی سمرقندی کی زندگی اور اس کے کلام پر تبصرہ کیجئے۔
جواب :- ابوعبداللہ جعفر بن محمد رودکی سمرقند کے قریب قصبہ رودک میں پیدا ہوا۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں: یہ صاحب ایجاد رہنے والا قصبہ رودک علاقہ سمرقند کا تھا۔ اگرچہ مادر زاد اندھا تھا (ڈاکٹر اتھے کو اس میں شک ہے) لیکن چھوٹی عمر میں بقدرِ ضرورت علم حاصل کیا۔ چونکہ خوش آواز

تھا علم موسیقی کی طرف راغب ہوئی اور بربط بجانے میں کمال حاصل کیا۔ اس ذریعہ سے چوتھی صدی ہجری کے شروع میں اس نے امیر نصر بن احمد سامانی کی قدردانی سے رتبۂ عالی حاصل کیا اس کی کثرتِ انعامات کے باب میں مولوی جامی نے کہا ہے :-

رودکی آنکہ دُر ہمے سُفتے مدح سامانیاں ہمے گفتے

صلۂ شعرہائے ہمچو دُرش بود دربار چار صد شترش

اس کے علاوہ عنصری۔ دقیقی۔ نظامی عروضی وغیرہم نے اپنے اپنے کلام میں اس کی نظم کی تعریف کی ہے۔ دولت شاہ کہتا ہے :- "رودکی دو سو غلام چھوڑ کر مرا تھا"۔ اس سے اس کے مال و اسباب کو قیاس کر لینا چاہیئے۔

اسماعیل بن احمد کا وزیر ابوالفضل البلعمی کہا کرتا تھا کہ اہلِ عرب یا اہل ایران میں رودکی کا کوئی ہم پایہ شاعر نہیں ہے۔

تمام تذکرہ نویسوں کو اس بات پر اتفاق ہے کہ رودکی ہی نے سب سے پہلے فارسی زبان میں دیوان مرتب کیا۔ سامانیوں کا نام آج تک رودکی کی بدولت ہی زندہ ہے :-

ازاں چندیں نعیم جاودانی کہ ماند از آل ساسان و آل سامان

ثنائے رودکی ماندست و مدحش نوائے باربد ماندست و دستان

رودکی نے کلیلہ و دمنہ کو فارسی مثنوی میں نظم کیا۔ اور اس کے صلے میں چالیس ہزار درہم انعام پایا۔

علامہ شبلی رودکی کی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں "رودکی کی شاعری کا عام انداز واقعہ گوئی۔ پند و موعظت اور حسن تاثیر ہے۔

عرب جاہلیت کی شاعری کا اصلی جوہر یہ تھا کہ اس سے بڑے بڑے قومی اور ملکی انقلابات پیدا کر دیے جاتے تھے۔ فارسی شاعری تفریح طبع کے سوا کسی کام کی نہ تھی۔ یعنی اس سے کبھی کوئی تاریخی واقعہ وجود میں نہ آیا۔ لیکن رودکی اس دھبے سے پاک ہے۔ اس کی شاعری میں اس قدر تاثیر تھی کہ اس کے شعر سنتے ہی دل پر اثر ہوتا تھا۔

ایک تاریخی واقعہ بیان کرنا واجب ہے۔ نصر بن احمد سامانی اپنے ایک سفر میں اپنے وطن بخارا کو بالکل بھلا بیٹھا۔ درباریوں کو گھر کی یاد نے ستایا۔ لیکن ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خود اپنے حاکم سے وطن کو لوٹنے کے لیے کہیں۔ چنانچہ رودکی سے درخواست کی گئی کہ وہ امیر کو بخارا واپس جانے پر آمادہ کرے۔ رودکی نے جھٹ کچھ شعر لکھے اور صبح کو امیر کی خدمت میں پیش کئے۔ اس قصیدے کا مطلع یہ ہے:

بوئے جوے مولیاں آید ہمے یادِ یارِ مہرباں آید ہمے

امیر کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ موزے پہنے بغیر بخارا کی طرف چل پڑا۔ بقول نظامی عروضی سمرقندی ابھی تک کسی سے اس قصیدے کا جواب نہ ہو سکا۔ اس کی فصاحت، حقیقت آرائی، روانی، ادگی اور حسن تاثیر اور جوش قابلِ داد ہیں۔

رودکی نہایت پُرگو تھا۔ رشیدی سمرقندی نے اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے۔ جب اس کی طبیعت شعر گوئی پر مائل ہوئی تو اس نے قصیدہ، رباعی، قطعہ، غزل، مرثیہ اور مثنوی سب کچھ ایجاد کیا۔

مضامین کے لحاظ سے بھی اس کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ واقع نگاری۔ خیال بندی۔ پند و موعظمت۔ عشق و محبت مدح و ثنا۔ صنائع بدائع سب چیزیں اس کے کلام میں پائی جاتی ہیں"۔ شبلی۔

رودکی نے تین تاریخی افسانے بھی نظم کئے۔ ان میں "وامق وعذرا" مشہور ترین ہے۔ اس کا ماخذ پہلوی ادب، تھا کئی اہل فن نے اس بیش قیمت نظم کی پیروی کی ہے۔ رودکی کا دیوان ایران میں چھپ چکا ہے۔

تقریباً تمام تنقید نگار رودکی کو "بابائے ادبیات فارسی" تسلیم کرتے ہیں۔ مشہور یونانی حکیم ایپیکیورس کے فلسفہ کو فارسی میں سب سے پہلے غالباً رودکی ہی نے روشناس کیا۔ اس فلسفے کا لب لباب یہ ہے:۔

خوش باش۔ ندانی زکجا آمدہ ای   مے نوش، ندانی کہ کجا خواہی رفت

رودکی کے کچھ اشعار سے حظ اٹھایئے گا۔

شاد زی با سیاہ چشماں شاد   کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد
ز آمدہ شادماں نہ باید بود   وز گذشتہ نکرد باید یاد
نیک بخت آں کسے کہ داد و بخورد   شور بخت آنکہ او نخورد و نداد
باد و ابر ست ایں جہاں افسوس   بادہ پیش آر ہر چہ بادا باد

مہتران جہاں ہمہ مردند   مرگ را سر فرو ہمے کردند
زیر خاک اندروں شدند آناں   کہ ہمہ کوشکہا بر آوردند
از ہزاراں ہزار نعمت و ناز   نہ بآخر بجز کفن بردند

برد از نعمت آنچہ پوشیدند / وآنچہ دادند وآنچہ را خوردند

زمانہ پندے کے آزادوار داد مرا / زمانہ راچو نکو بنگری ہمہ پند است
بروز نیک کساں گفت غم مخور زنہار / بسا کسا کہ بروز تو آرزو مند است

سوال۔ دقیقی کی زندگی کے حالات اور اس کے کلام پر روشنی ڈالئے۔

جواب۔ ابو منصور محمد بن احمد معروف بہ دقیقی بعض محققین کے عقیدے کے مطابق طوس کا رہنے والا تھا۔ اس نے ۳۶۷ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔ اس کی موت ایک غلام کے ہاتھوں ہوئی کچھ مورخوں نے دقیقی کے ایک آدھ شعر کی بنا پر اسے آتش پرست قرار دیا ہے۔ مگر امر اغلب یہ ہے کہ وہ مسلمان تھا۔ دقیقی کے شاہکاروں میں قصائد اور مقطعات کے علاوہ ایک مثنوی بھی شامل ہے جس کا موضوع ہے زرتشت پیغمبر کا ظہور اور ایران کے بادشاہ گشتاسپ کی تورانی حکمران ارجاسپ کے خلاف لڑائیوں کا حال اس مثنوی کے متعلق یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہزار کے قریب اشعار ہیں سچ تو یہ ہے کہ دقیقی نے یہ مثنوی لکھ کر شاہنامہ فردوسی کی سی یادگار زمانہ نظم کے لئے میدان تیار کر دیا۔ اگر دقیقی اپنے غلام کے ہاتھوں قتل نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ وہ اس مثنوی میں اور بھی بہت کچھ اضافہ کرتا۔ زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے دقیقی کے کلام اور فردوسی کے شاہنامہ میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے فردوسی اگر اپنے اشعار میں دقیقی اور اس کی مثنوی کا ذکر صاف صاف نہ کر دیتا تو ہو سکتا ہے کہ دقیقی کے اشعار خود فردوسی کی طرف منسوب کر دیئے جاتے۔

دقیقی کے یہاں بہاریہ۔ عشقیہ، مدحیہ غرض ہر قسم کے مضامین موجود ہیں۔ دقیقی کے کلام سے وطن پرستی کا جوش و خروش پوری بلند آہنگی کے ساتھ چھلک رہا ہے اس کے خیالات میں بلندی ہے اور مضامین میں جدت خالص فارسی کی مکمل فصاحت اس کے کلام کا خاص جوہر ہے جو اس کی پختگیٔ طبع پر اعتراف کی مُہر ثبت کرتا ہے۔

دقیقی کے بعض قصیدے اور قطعے غزل کی طرح پُرلطف ہیں۔ ان میں حسن و عشق ناز و ادا۔ اور شراب و مستی کے موضوع باندھے گئے ہیں تشبیہات رنگین اور نرالی ہیں۔ خیالات لطیف اور دلپذیر ہیں۔ بہار کے نظاروں کی تصویر کشی بھی قابل داد ہے۔ قصیدہ گوئی ہیں دقیقی کی اپنی روش اور اپنا رنگ ہے قصاید میں پند و موعظت کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی جذبات عالیہ مثلاً جراٗت و دلیری۔ کرم و سخاوت اور خیر د دانش کے حصول کی تلقین ہے۔

دقیقی سامانی خاندان کے عہد حکومت میں رودکی کے بعد سب سے بڑا شاعر ہوا ہے اسے منصور بن نوح اور نوح بن منصور (سامانی حکمران) کے دور میں شہرت نصیب ہوئی اس شہرت کا زیادہ مدار اس شاہنامہ پر ہے جو اس نے سامانی امیر نوح بن منصور کے فرمان پر نظم کرنا شروع کیا۔ لیکن بدقسمتی سے صرف ایک ہزار شعر ہی لکھے تھے کہ اپنے غلام کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔

دقیقی کے کلام کے نمونے کے طور پر ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

چناں گشت آزاد سرو بلند — کہ بر گرد او بر نگشتے کمند

بگیرد یکسر رہ زردہشت | بسوئے بُتِ چِلّیں برآرید پشت

زگل بوئے گلاب آید بر انسان | کہ پنداری گُل اندر گُل سرشتی
دقیقی چار خصلت برگزیدہ است | بگیتی از ہمہ خوبی و زشتی
لبِ یاقوت رنگ و نالۂ چنگ | مے چون زنگ و کیشِ زردہشتی

دو چیز است کو را ببند اندر آر | یکے تیغ ہندی دگر زر کانی
بہ شمشیر باید گرفتن مر او را | بدینار بستنش پاے ارتوانی
خرد باید آنجا وجود و شجاعت | فلک مملکت کے دہد رائگانی

سوال: سامانی دور کے نثری ادب پر جامع نوٹ لکھیئے۔
جواب: سامانی حکمران علم و ادب کے سرپرست تھے۔ انھوں نے نہ صرف شاعروں کی حوصلہ افزائی کی بلکہ نثاروں کی بھی۔ ان کے دربار شعر و شاعری اور نثر نگاری کی ترقی کے مراکز تھے۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی شاعری کی نسبت فارسی نثر کی ترقی کم ہوئی فارسی کے مقابلے میں عربی نثر نے زیادہ رواج پایا۔ اس لئے عربی زبان میں نثر کی بہت زیادہ کتابیں تالیف کی گئیں۔ ان تصنیفات میں سے کچھ تو انقلاب زمانہ کی نذر ہوگئیں اور کچھ بچ گئیں۔ ان میں سے ایک شاہنامہ (فارسی) کا مقدمہ ہے۔ یہ مقدمہ ۳۴۶ھ میں حاکم طوس ابو منصور بن عبد الرزاق کے فرمان پر لکھا گیا۔ اس کے بعد دوسری اہم تصنیف تاریخ طبری (عربی) کا فارسی میں ترجمہ امیر منصور کی فرمائش

پر کیا۔ یہ ترجمہ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں کیا گیا ہے۔ روانی اس کی خاص خوبی ہے۔

سامانی دور کے فارسی نثری ادب میں ایک اور قابل قدر اضافہ تفسیر طبری کا ترجمہ ہے یہ کتاب بھی امیر منصور بن نوح کے حکم سے لکھی گئی۔ مترجم کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ان تالیفات کے علاوہ قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیر کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے۔

عربی نثر کی تصنیفات: سامانی عہد میں ایرانی علما نہ صرف فارسی اور عربی میں شعر کہتے تھے بلکہ عربی نثر میں بھی تصنیف و تالیف کرتے تھے۔

ابن قتیبہ سامانی دور میں ایک مشہور مورخ اور ادیب گزرا ہے۔ اس نے ۲۷۶ھ میں وفات پائی۔ اس کی قابلِ ذکر تصنیفات یہ ہیں۔ کتاب الشعر والشعرا۔ عیون الاخبار، ادب الکاتب۔

محمد جریر طبری ایک شہرۂ آفاق مورخ اور مفسر ہوا ہے۔ اس نے ۳۱۵ھ میں انتقال کیا اس کی مشہور کتاب تاریخ طبری ہے۔ قرآن شریف کی تفسیر بھی اس نے لکھی۔

دینوری نے سیاست۔ تاریخ اور ادب پر کتابیں لکھیں۔ اس کی مشہور ترین کتاب اخبار الطوال ہے۔

ابنِ فقیہ ہمدان کا رہنے والا تھا۔ اس کی مشہور جغرافیہ کی کتاب "کتاب البلدان" ہے جو ۲۹۰ھ میں تالیف کی گئی۔

حمزہ اصفہانی مشہور تاریخ دان اور لغات نگار تھا۔ اس نے تاریخ پر "سنی ملوک العجم" کے نام کی کتاب لکھی۔ اس کی وفات ۳۶۰ھ میں ہوئی۔

محمد بن یعقوب کلینی سامانی دور کا عظیم المرتبہ محدث تھا۔ مذہب کا شیعہ تھا۔ اس کی اہم تصنیف، کتاب کافی ہے۔ اس نے ۳۲۹ھ میں انتقال کیا۔

اسحاق موصلی ایک نجیب النسل ایرانی تھا۔ موصل کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک بڑا عالم موسیقی ہوا ہے۔ علم ریاضی اور موسیقی سیکھے بغیر اس نے صلاحیتِ طبعی کے زور سے بے نظیر اصولِ موسیقی وضع کئے۔ اس کے علاوہ حدیث سے بخوبی واقف تھا۔ شعر و شاعری کا بھی مذاقِ سلیم رکھتا تھا اور خوب شعر کہتا تھا۔ پچاسی سال کی عمر پا کر ۲۳۵ھ میں وفات پائی۔

ابوبکر محمد بن زکریا رے کا رہنے والا تھا۔ ۲۴۰ھ میں پیدا ہوا۔ وہ اسلامی دنیا کا ایک مشہور حکیم اور ادیب ہو گذرا ہے۔ علم طب میں کمال حاصل کیا۔ آپ رے اور بغداد میں طبابت کرتے تھے۔ طب پر آپ کی مشہور تصنیف "حاوی" ہے۔ ایک اور کتاب "کتاب الطب المنصوری" ہے۔ آپ نے ۳۲۰ھ میں انتقال کیا۔

ابومعشر بلخی ایک اعلیٰ پایہ منجم اور عالم تھا۔ حساب اور ہندسہ میں کمال حاصل کیا۔ نجوم کے موضوع پر مستند کتابیں لکھیں جن کی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہے۔ آپ کی وفات ۲۷۲ھ میں ہوئی۔ آپ نے قریباً سو سال کی عمر پائی۔

غزنوی دور

سوال: "سلطان محمود غزنوی (۹۷۰ء تا ۱۰۳۰ء) اہل علم و فن اور شعر و ادب کی تربیت اور اپنی شاہانہ فیاضیوں کے لئے ایک ممتاز مقام رکھتا ہے" اس پر مفصل بحث سپرد قلم کیجیے۔

جواب: سلطان محمود سلسلۂ غزنویہ کا سب سے بڑا بادشاہ گذرا ہے در اصل یہ غزنوی سلسلہ سامانی حکومت ہی کی ایک شاخ تھی۔
یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ محمود کی فیاضیاں مدح پسندی کی غرض سے نہیں بلکہ علم و فن اور تاریخ و ادب کی ترقی کے مقصد سے تھیں اس نے فردوسی سے شاہنامہ لکھوا کر عجم پر یہ احسان کیا کہ عجم گو خود مٹ گیا۔ لیکن اس کے کارنامے آج تک نہ مٹ سکے۔ اسلامی فتوحات مسلمانوں کے مذہبی ترانے ہیں۔ لیکن مسلمان خالد و ضرار کے بجائے رستم و سہراب کے نام سے زیادہ آشنا ہیں۔ عبد الملک۔ ولید مقتدر۔ مستضد۔ معتصم۔ مستعصم کو کتنے آدمی جانتے ہیں؟ لیکن جم۔ کیخسرو۔ کیکاؤس و فریدوں۔ افراسیاب۔ و اسفندیار کو بچہ بچہ جانتا ہے۔ (شعر العجم)

عرفی نے لکھا ہے کہ خود سلطان محمود غزنوی اور اس کا بیٹا امیر ابو محمد بن یمین الدولہ بھی شعر کہا کرتے تھے۔ اس لئے تعجب نہیں اگر محمود جی جان سے شعرا کی قدر کرتا۔

شاعری اگرچہ ابتدائے ظہور سے روز افزوں ترقی کرتی جاتی تھی لیکن غزنویہ دور میں انتہائے کمال تک پہنچ گئی۔ فردوسی۔ اسدی طوسی۔ عنصری۔ فرخی۔ حکیم سنائی۔ منوچہری جن میں ہر شخص اقلیم سخن کا صاحب تاج و تخت ہے۔ اسی عہد کی یادگاریں ہیں۔ محمود جس طرح فاتح و کشورستان تھا اسی طرح علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا علم فقہ میں بھی ماہر تھا۔ اور اس پر خود اس کی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے۔ غزنی میں اس نے ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا تھا جس کے ساتھ ایک عجایب خانہ بھی تھا جس میں تمام دنیا کے نوادر موجود تھے (تاریخ فرشتہ)

ملک میں جو بڑے بڑے مشاہیر فن تھے اکثروں کو بلا کر دربار میں جگہ دی تھی۔ ان میں سے ایک ابوریحان بیرونی تھا جو متعدد فنون میں بوعلی سینا کا ہم پایہ تھا۔ بوعلی کو بھی اس نے خوان کرم پر دعوت دی تھی لیکن اس کو کچھ وہم پیدا ہوا اور نہ آیا۔

"شاعری پر اس نے حوصلہ شاہانہ سے توجہ دی۔ اور ایک مستقل محکمہ قائم کیا۔ اور عنصری کو ملک الشعرا کا خطاب دے کر اس کا افسر مقرر کیا۔ تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ محمود کے خوان کرم سے چار سو شاعر بہرہ یاب تھے جن کو حکم تھا کہ جو کچھ کہیں پہلے عنصری کو دکھا کر پھر دربار میں لائیں۔ ایک موقع پر جب شہزادہ مسعود خراسان سے غزنی میں آیا اور شعرا نے دربار عام میں قصائد پیش کئے تو ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور زینتی اور عنصری کو پچاس پچاس ہزار درہم عطا کئے۔ غضائری کو

دو شعروں پر دو توڑے دیئے۔"

عنصری نے ۱۸۰ شعروں کا قصیدہ لکھا جس میں محمود کی تمام لڑائیاں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیں (تذکرہ دولت شاہ سمرقندی) بدیعی بلخی نے نوشیرواں کا نصیحت نامہ نظم لیا۔ اسدی طوسی نے لغات فارسی کی تدوین کی۔ اور صنائع و بدائع فارسی پر ایک کتاب لکھی۔ تاریخ و اخلاق کے علاوہ محمودی شعرا نے اصل فن کو ترقی دی۔ اور شاعری کو اس قابل کردیا کہ جس قسم کے مطالب چاہیں ادا کر سکیں۔ واقعہ نگاری۔ معاملہ بندی۔ اظہار جذبات۔ قدرتی مناظر کی تصویر غرض شاعری کے جتنے انواع ہیں سب ان کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ غزل البتہ رہ گئی۔ لیکن ابھی اسلام کی ترقی کا شباب تھا۔ ابھی سے اس فتنۂ خوابیدہ کے جگانے کی کیا ضرورت تھی۔

"محمودی شعرا اگرچہ بے شمار ہیں لیکن جن ناموروں کو محمود نے ندما میں داخل کیا تھا اور جو آسمانِ سخن کے سبعہ سیارے کہے جاتے ہیں:۔
عنصری۔ فردوسی۔ اسدی۔ عسجدی۔ غضائری۔ فرخی۔ منوچہری (شبلی)

ان شاعروں کے علاوہ محمود کے دربار میں ہر فن کے استاد موجود تھے۔ مشہور مؤرخ البیرونی صاحب آثار الباقیہ و تاریخ الہند و تفہیم وغیرہ (پیدائش ۹۷۳ء) کا نام قابل ذکر ہے۔ عربی زبان کا مشہور ادیب ابو الفتح المتنبی کچھ عرصہ تک محمود کے دربار میں رہا۔ محمود نے عدیم النظیر حکیم اور اہل طب شیخ بوعلی سینا (پیدائش

۹۸۰ء) کو بھی اپنے دربار میں لانے کی کوشش کی۔ بوعلی حکمت اور سیاسی تدبر میں یکتائے روزگار تھا وہ ارسطو اور جالینوس کا پیروکار اور قرونِ وسطیٰ میں یورپ کو تعلیم دینے والا تھا۔ براکلمین نے بوعلی کی تقریباً ایک سو تصنیفات بیان کی ہیں۔ جن میں شفا۔ قانون اور دانش نامہ خاص طور پر قابلِ تعریف ہیں۔

عتبی نے اپنی کتاب تاریخ یمینی میں محمود کے دربار کی بے مثال شان کو خوب سراہا ہے۔ مقامات کا مخترع بدیع الزماں ابوالفضل احمد بھی محمود کے خاص درباریوں میں سے تھا۔ محمود رشوت سے طاقت و جبر سے اور لالچ دے کر غرضیکہ ہر ذریعے سے چاہتا تھا کہ اہلِ فن اس کے دربار میں جمع ہوں۔

سوال: عنصری کے احوال و آثار بیان کیجئے اور اس کی شاعری پر تنقید سپردِ قلم کیجئے۔

جواب: حکیم ابوالقاسم حسن بن احمد عنصری بلخ کا رہنے والا تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش کے متعلق کوئی یقینی علم نہیں۔ تاہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ سنہ ۹۶۱ء کے لگ بھگ پیدا ہوا ہوگا۔ اس کی موت سنہ ۱۰۴۰ء اور سنہ ۱۰۵۰ء کے درمیان واقع ہوئی۔ مولانا شبلی نے مختلف تذکرہ نویسوں کی بحثا بحثی کا ذکر کرتے ہوئے۔ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کی رائے میں عنصری نے ۴۳۱ھ مطابق سنہ ۱۰۴۰ء میں یعنی محمود غزنوی کی وفات کے قریباً دس سال بعد سلطان مسعود کے آخری ایام کے دوران میں انتقال کیا۔

عنصری کی ابتدائی زندگی کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہوسکے

ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نے اوائل عمر میں تجارت شروع کی لیکن ایک بار ثبت ہمانے کے بعد علومِ عقلی کی طرف متوجہ ہوا۔ سب سے پہلے وہ سلطان محمود غزنوی کے چھوٹے بھائی امیر نصیر حاکم خراسان کے دربار میں رہا۔ وقت گزرنے پر دربارِ غزنی سے متعارف ہوا۔ وہاں محمود کی قدردانیوں نے اُسے ملک الشعرا کے علاوہ بہت امیر بنا دیا۔ تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ دربارِ غزنی کے چار سو شاعر اس کے ماتحت تھے جن میں فرخی عسجدی اور منوچہری جیسے اہلِ فن شامل تھے اور وہ بڑے جاہ و جلال کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ یہاں تک کہ چار سو زرّیں کمر غلام رکاب میں ساتھ چلتے۔ خاقانی نے لکھا ہے ؎

بدہ بیت صد بردہ بدرہ یافت | زیک فتح ہندوستاں عنصری
شنیدم کہ از نقرہ زد دیگدان | ز زر ساخت آلاتِ خواں عنصری

عظیم المرتبہ قصیدہ گو منوچہری یوں عنصری کی تعریف کرتا ہے ؎

اوستادِ اوستادانِ زمانہ عنصری | عنصرش بے عیب و دل بے غش و دینش بے فتن
تا ہمے خوانی تو اشعارش ہمے خائی شکر | تا ہمے گوئی تو ابیاتش ہمے بوئی سمن

نظامی عروضی سمرقندی نے کہا ہے۔

بسا کاخا کہ محمودش بنا کرد | کہ از رفعت ہمے با مہ مرا کرد
نہ بینی زاں ہمہ یک خشت بر پائے | مدیحِ عنصری ماندست بر جا

ایسی تعریفوں کے علاوہ عروض۔ لغت۔ اور صنائع بدائع کی اکثر کتابوں میں عنصری کے کئی ایک اشعار مثال یا سند کے طور پر نقل کئے گئے ہیں۔ محمود غزنوی عنصری کے حق میں اس قدر اعتماد اور عزت رکھتا تھا کہ تمام درباری شعرا کو حکم تھا کہ اپنے شاہکار بادشاہ کے حضور میں

پیش کرنے سے پہلے عنصری کی منظوری اور اصلاح لے لیا کریں۔

عنصری کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہت بڑا فی البدیہہ گو تھا۔ ایک بار محمود نے نشے کی حالت میں اپنے محبوب ایاز کی زلفیں کٹوا دینے کا حکم دے دیا۔ جب نشہ دور ہوا تو بادشاہ کو اپنے کئے پر بہت پشیمانی ہوئی اور قلق کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایسے میں عنصری کی ایک فی البدیہہ رباعی محمود کی تسکین کا باعث ہوئی ؎

کے عیب سر زلف بت از کاستن است
چہ جائے بہ غم نشستن و خاستن است
وقت طرب و نشاط و مے خواستن است
کاراستن سرو ز پیراستن است

اگرچہ عنصری نے محمود اور امیر نصر کی مدح میں بہت سے قصیدے لکھے ہیں۔ تاہم اس نے بعد کے قصیدہ نویسوں کی سی چاپلوسی کا کہیں بھی اظہار نہیں کیا۔ اس نے یہ کوشش بھی نبھائی ہے کہ خودداری کے سر رشتہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ عنصری کو تقریباً ہر تقریب پر کوئی نہ کوئی قصیدہ لکھنا پڑتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کے قصاید کی کلیات بہت بڑی ہوگی۔ عنصری نے رودکی کی پیروی میں کچھ عشقیہ نظمیں بھی لکھیں لیکن اس میدان میں اس نے اپنی نسبتاً ناکامیابی کا خود اعتراف کیا ہے ؎

غزل رودکی وار نیکو بود   غزل ہائے من رودکی وار نیست

مجمع الفصحا میں لکھا ہے کہ عنصری نے کوئی تیس ہزار اشعار کا دیوان چھوڑا۔ لیکن عنصری کے مطبوعہ دیوان میں صرف تین ہزار کے لگ بھگ اشعار ہیں۔

مندرجہ ذیل پانچ مثنویاں بھی اس کے نام سے منسوب ہیں لیکن ہم تک ان میں سے کوئی بھی نہیں پہنچ سکی :

۱۔ عین الحیات۔ (۲) شاد بہر (۳) سُرخ بت (۴) خنگ بت (۵) وامق و عذرا۔

عنصری کی شاعری پر تنقیدانہ نگاہ

فارسی قصیدہ گوئی کے متقدمین میں عنصری کو ایک خاص رتبہ حاصل ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں رُودکی اس کا پیشرو ہے۔ لیکن قصیدے کو ایک مستقل صنعت کے درجے تک پہنچا کر اس میں فطری تصاویر کی جھلک پیدا کرنا عنصری ہی کا کام ہے۔ قصائد عنصری نے ایک ممتاز شاہ راہ ڈال دی جس پر چلنا متاخرین کے لئے باعث افتخار اور موجب ترقی ہوا۔ اس نے سب سے پہلے قصائد میں فلسفیانہ خیالات کو ادا کیا اور یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر اُسے حکیم کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ اُسے ایرانی شعرا میں وہی امتیازی رتبہ حاصل ہے جو المتنبی کو عرب شعرا میں۔ یہ خیال رشید الدین وطواط کے سے نقاد کا ہے۔

عنصری کے کلام کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:۔

زبان کا اعلیٰ معیار۔ پُرشوکت اسلوبِ بیان۔ خوشگوار طرزِ ادا۔ جدتِ تشبیہات۔ لطافتِ استعارات۔ ترصیع اور لف و نشر کی سی صنائع لفظی۔ حسنِ گریز۔ مناظرِ فطرت کی تصویر کشی۔ بلندیِ تخیل وغیرہ وغیرہ۔

عنصری کے قصیدوں کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ مذکورہ بالا خوبیوں کے علاوہ اس کا دامن بے غیرتی اور خوشامد کے بدنما دھبوں سے بہت حد تک پاک ہے۔ اور یہ کہ وہ حقیقت میں فارسی قصیدہ گوئی کا باوا آدم ہے۔ اگرچہ انوری اور خاقانی کے سے قصیدہ گو اُسے کئی پہلوؤں میں پیچھے چھوڑ گئے ہیں، پھر بھی اصلی افتخار تو اولین پیشرو کو ہی ہو سکتا ہے۔

سوال:۔ عسجدی اور غضاری پر مختصر نوٹ لکھو۔

عسجدی:۔ ابو نظر عبدالعزیز بن منصور متخلص "عسجدی" سلطان محمود غزنوی کے دربار کا ایک مشہور اور بلند مرتبہ شاعر گذرا ہے۔ اس نے ۴۳۲ھ میں وفات پائی۔ عسجدی کا بہت سا کلام ناپید ہے۔ اس نے سلطان محمود کی تعریف میں بہت سے قصیدے لکھے اور انعام و اکرام پایا۔ عنصری کی عزت اور ثروت پر رشک کھاتا رہا۔ اور اپنی حالت پر افسوس کھاتا تھا جیسا کہ اس کے اپنے کلام سے ظاہر ہے:۔

فغاں ز سقلی و علوی و ثابت و سیّار	فغان از دست ستم ہائے گنبدِ دوّار
ازاں بہرزہ شکایت ہمی کنند احرار	جفائے چرخ بسے دیدہ اند اہلِ ہنر

کہتے ہیں اس کے دیوان میں تین ہزار شعر تھے لیکن اب صرف چند قصیدوں قطعوں اور ایک مثنوی کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔

اس کے قطعات سے جو زمانے کی دستبرد سے بچ گئے ہیں۔ بخوبی ظاہر ہے کہ اُسے کلام پر عبور حاصل تھا۔ صنائع بدائع بھی اس کی شاعری کی خصوصیت تھی۔ تذکرہ نویسوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ

وہ قصیدہ جو اس نے سومناتھ کی فتح پر لکھا ہے سب سے زیادہ اچھا ہے۔

غضائری بھی غزنوی دور کا ایک بڑا شاعر تھا۔ اور زمانے کے رواج کے مطابق قصیدہ گو اور مدح سرا تھا۔ عنصری کا ہم عصر تھا۔ مگر بجائے سلطان محمود غزنوی کے بہاءالدولہ دیلمی کے دربار سے وابستہ تھا۔ اسی کی مدح میں شعر کہتا رہا۔ غضائری فن قصیدہ گوئی کا استاد تھا۔ مبالغہ اس کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ غضائری نے سلطان محمود غزنوی کی مدح میں ایک پُرزور اور فصیح قصیدہ لکھا جس سے اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ عنصری نے اس قصیدے کے جواب میں اسی وزن میں ایک قصیدہ لکھا اور پھر غضائری نے جواب الجواب میں ایک اور قصیدہ لکھا۔

سوال: فرخی کی زندگی اور شاعری پر مفصل نوٹ قلم بند کیجیے:۔

جواب: حکیم ابوالحسن علی فرخی سیستان میں پیدا ہوا بچپن میں موسیقی کی تعلیم پائی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ شعروشاعری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ فرخی نے جب بلخ کے حاکم حکیم ابوالمظفر احمد بن محمد چغانیان کی قدرشناسی اور شعرپروری کا حال سنا تو اس کے دربار میں قصیدہ لے کر حاضر ہوا۔ اسی امیر کے ذریعہ سے سلطان محمود غزنوی کے دربار میں پہنچنا نصیب ہوا۔ فرخی کے اکثر قصیدے محمود، مسعود اور محمود کے خاص درباریوں کی مدح میں لکھے گئے۔

فرخی نے علم عروض کے متعلق ایک نہایت مستند کتاب بھی لکھی جس کا نام ہے "ترجمان البلاغت"

رشید الدین وطواط نے اپنی مشہور کتاب "حدائق السحر" کے لکھنے میں ترجمان البلاغت سے بہت مدد لی۔ نکلسن کی رائے ہے کہ فرخی کے اولین قصیدوں میں بہت تصنّع ہے۔ ضرورت سے زیادہ صنائع لفظی و معنوی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کے کلام میں روانی صفائی اور سلاست آگئی جو اتفاقیہ طور پر حاصل نہیں ہوا کرتی بلکہ فن کی مشق سے پیدا ہوتی ہے۔ عوفی کے تذکرے میں فرخی کا ان سلیس اور صاف قصیدوں میں اور دوسرے اشعار کے ساتھ ذکر آیا ہے جنہیں ہم سہل الممتنع کہتے ہیں۔

فرخی نے ۴۲۹ھ میں وفات پائی۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ فرخی کے کلام کا عام جوہر زبان کی صفائی، سلاست اور روانی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صنائع بدائع کی بہتات ہے۔

قاآنی کا بڑا اعجاز یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ قصیدوں میں ہر قسم کے واقعات اس طرح بے تکلف ادا کرتا چلا جاتا ہے گویا دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ فرخی سے اس کا موازنہ کرنے پر صاف معلوم ہوگا کہ جو بات قاآنی کو ہزار برس بعد حاصل ہوئی فرخی کو اسی وقت حاصل تھی اس نے واقعہ نگاری کو بہت ترقی دی ہے۔ اسے خیالات کی ہو بہو تصویریں اتارنے پر خاص عبور حاصل تھا۔ سلطان محمود کی وفات پر جو مرثیہ اس نے لکھا اس میں جوش بیان کے ساتھ ساتھ گہرے درد و گداز کا عنصر غالب ہے۔ مرثیے کو کس شاعرانہ انداز سے شروع کرتا ہے ؎

شہر غزنی نہ ہماں است کہ من دیدم پار چہ فتادست کہ امسال دگرگوں شد کار

فرخی نے اپنے کلام میں عشقیہ خیالات کو بھی ایک جداگانہ خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ ادا کیا ہے ؎

ہمہ دشمنی از تو دیدم و لیکن — نگویم کہ تو دوستی را نشائی

ایک اور جگہ کس شاعرانہ طرز ادا سے کہتا ہے ؎

نہ بر خیرہ بد و دل داد محمود — دلِ محمود را بازی مپندار

فرخی کو محمود کے دربار میں ایک بلند اور باعزت مقام حاصل تھا۔ اور اس کے انعام و اکرام سے خوب مالامال ہوا۔ جیسا کہ خود ایک قصیدے میں کہتا ہے۔

با ضیعت آبادم و با خانہ آباد — با نعمت بسیارم و با آفت بسیار

ہم یار بہ اسپم ہم با گلہ میشین — ہم صنم چنینم و ہم بابت فرخار

ساز سفرم است و نوائے حضرم است

اسپان سبک سار و مستوران گرانبار

فرخی کے دیوان میں نو ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔ قصائد کے علاوہ غزلیات۔ قطعات۔ رباعیات اور ترجیع بند بھی لکھے ہیں۔ کئی بلند رتبہ شعرا اور فضلا نے فرخی کے کلام کی تعریف کی ہے۔

فرخی کے یہاں لطیف اور دلکش تشبیہات کی کثرت ہے۔ اس کا کلام تصنع اور تکلف سے پاک ہے سادگی اور صفائی اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کے کلام میں ابتذال نام کو بھی نہیں۔ خوش اخلاقی اور نیک سیرتی پر زور دیا ہے۔ تغزل اس کی شاعری کی جان ہے، مناظر فطرت کی خوب تصویر کھینچتا ہے۔ اس کے استعارات اور تشبیہات نرالے اور دلپذیر ہیں۔ جذبات نگاری میں خاص ملکہ پایا تھا۔ سوز و

گداز اس کے کلام کا خاص جوہر ہے کیونکہ اس نے ایک دردمند دل پایا تھا۔ وہ اہل عالم کے مصائب سے فوراً متاثر ہو جاتا۔ فرخی کے کئی اشعار میں تاریخی واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ وہ سلطان محمود کا ندیم تھا۔ اور ہندوستان کی کئی مہمات میں اس کا شریک تھا۔ اس لیے جو قصائد سلطان کی مدح میں لکھے ہیں۔ ان میں واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ اس لئے اس کے قصائد تاریخی اہمیت کے حامل ہیں تاریخی واقعات تاریخی ناموں اور مقامات کے ذکر میں فارسی نے تفصیل سے کام لیا ہے۔ بعض مقامات پر کلام میں اس زمانے کے رسوم و آئین کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔ سلطان کی مجالس کا ذکر۔ نوروز اور مہرگان کے جشنوں کا حال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سوال: منوچہری دامغانی کے احوال زندگی اور آثار کلام پر روشنی ڈالیے۔ اس کے اسلوب اور کلام پر تنقید بھی سپرد قلم کیجیے۔

جواب۔ ابوالنجم احمد منوچہری دامغان کا رہنے والا تھا۔ اس نے اپنا تخلص اپنے ممدوح فلک المعالی منوچہر بن قابوس کے نام پر اختیار کیا۔ اگرچہ منوچہری سلطان محمود غزنوی کے عہد میں بحیثیت شاعر شہرت پا چکا تھا لیکن اس کے دربار سے وابستہ نہ تھا۔ اور نہ ہی اس کی مدح میں کوئی قصیدہ لکھا۔ درحقیقت وہ سلطان محمود کے بیٹے سلطان مسعود کا درباری شاعر تھا اور اس کے بیشتر قصائد سلطان مسعود اور اس کے امرا و وزرا کی مدح میں لکھے گئے۔

منوچہری متقدمین کے اشعار اور بالخصوص عرب شعرا کے کلام کا

دلدادہ تھا۔ اور ان کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعض قصیدوں میں عربی الفاظ اور تراکیب کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ اسے عربی موضوعات اور عربی شاعری سے خاص انس تھا۔ عربی زبان پر اُسے کامل عبور حاصل تھا۔ لیکن اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس نے عربی ترکیبوں کو فارسی زبان کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے کہ وہ فارسی زبان کا حصّہ بن گئی ہیں۔

منوچہری کے کلام کا بیشتر حصّہ روانی اور شیرینی کا نمونہ ہے۔ اس کے قصائد کی ابتداء تغزل سے ہوتی۔ اور تشبیب کے بعد ممدوح کی تعریف شروع کر دیتا ہے اس کا کمال اسی تشبیب کے تغزل میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس میں کبھی حسن فطرت، کبھی حسن محبوب اور کبھی جذبات دل کی عکاسی ہوتی ہے۔

منوچہری کے کلام کی ایک اور خصوصیت سادہ۔ فطری اور دلپذیر تشبیہات اور استعارات کا استعمال ہے بعض اوقات وہ غیر فطری اور خیالی تشبیہات سے بھی کام لیتا ہے لیکن ان کی دلکشی اور ندرت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

منوچہری کو فطرت اور اس کی رنگینیوں سے خاص لگاؤ تھا۔ در حقیقت وہ فطرت کا پجاری تھا۔ فطرت کے حُسن پر لٹو تھا۔ اور اپنے کلام میں مناظر قدرت کی خوب تصویریں کھینچی ہیں، زبان پر قدرت سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ اس کے کلام کو پڑھنے والا اس کے جوشِ بیان۔ صدقِ احساسات اور حسنِ ادا پر عش عش کرنے لگتا ہے اور تہہ دل سے خراجِ تحسین ادا کرتا ہے۔ رات کی تاریکی کا بیان

ملاحظہ ہو ؎

شبے گیسو فروہشتہ بدامن | پلاسش معجر و قیرینش گرزن
بہ کردار زنِ زنگی کہ ہر شب | بزاید کودکِ بلغاری آں زن

طلوعِ خورشید کے نظارے کا بیان یوں کرتا ہے :-

سر از البرز برزد قرص خورشید | چوں خون آلودہ دزدے سر زمکمن
بکردار چراغِ نیم مردہ | کہ ہر ساعت فزوں گردوش روغن

ستاروں کا بیان کس شاعرانہ انداز سے ہے ؎

ثریا چوں منیژہ بر سرِ چاہ | دو چشم من برا و چوں چشم بیژن
ہمے برگشت گردِ قطب جدی | چو گرد با بزن مرغ کمشتن
بنات النعش گرد او ہمے گشت | چوں اندر دستِ مرد چپ فلاخن

منوچہری کے کلام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اشعار مسرت انگیز اور امید افزا ہیں - وہ نشاط و طرب کا پیامبر ہے اور یاس و قنوط کا مخالف - فارسی شعرا میں ایسے اشعار بہت کم ہیں جن سے منوچہری کے سے طربناک رنگ کی جھلک ظاہر ہو - منوچہری نے اس رنگ کو خاص طور پر مسمط میں خوب نبھایا ہے - اس کے مسمط قادر الکلامی کا نمونہ ہیں اور ان میں نشاط و مسرت اور رجائیت و سرور کی روح سموئی ہوئی ہے - وہ زندگی سے لطف اٹھانے کی تلقین کرتا ہے - حسنِ فطرت کے دیدار کی دعوت دیتا ہے - رقص و سرود کی محفلوں سے لطف اندوز ہونے کی تاکید کرتا ہے - در اصل وہ عمر خیام کے فلسفۂ عیش و عشرت کا مبلغ ہے -

منوچہری کی جذبات نگاری قابل داد ہے - اسے انسانی طبیعت

اور اس کے ارمانوں سے پوری پوری آگاہی ہے۔ اس کے کلام کا خاص جوہر سوز و گداز ہے۔ وہ ایک دردمند دل رکھتا ہے جو دوسروں کے مصائب و آلام پر پگھلنے لگتا ہے۔ وہ گرے ہوئے یا افسردہ دل کو اٹھانے اور ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔

قصیدہ گوئی کے علاوہ اس کو طب، نجوم، نحو اور حکمت سے بھی دل بستگی تھی۔

سوال: فردوسی کے احوال و آثار پر پوری پوری روشنی ڈالئے اور اس کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیجئے:۔

جواب: ابوالقاسم حسن (منصور) بن علی فردوسی شاداب (طوس) کے مقام پر ۹۳۵ء-۶ میں پیدا ہوا۔ وہ ایک امیر دہقان تھا بچپن سے ہی اُسے پرانی کہانیوں کے سننے کا شوق تھا۔ ابو منصور المعمری کی تالیف کی ہوئی کتاب جس میں قدیم بادشاہوں کے قصے درج تھے۔ فردوسی کی دلچسپیوں میں اور بھی اضافے کا سامان بنی۔ یہاں تک کہ بعض امرا کے کہنے سے اس نے شاہنامہ لکھنے کا اتنا بڑا کام ہاتھ میں لے لیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کا مقصد اپنی اکلوتی بیٹی کے بیاہ کے لئے مال و زر حاصل کرنا تھا۔ بہر حال شاہنامہ کی پہلی اشاعت پچیس برس کی محنت کے بعد ۹۹۹ء کے قریب مکمل ہوئی دوسری اشاعت جسے فردوسی نے محمود غزنوی کی خدمت میں پیش کیا ۱۰۱۰ء کے لگ بھگ تیار ہوئی۔ کئی محققین اس خیال کے ساتھ اتفاق نہیں رکھتے کہ محمود نے فردوسی کو شاہنامہ کی تکمیل کے لئے کہا اور ہر ایک شعر کے لئے سونے کی ایک اشرفی دینے کا وعدہ

کیا۔ خیر جیسے بھی ہوا بادشاہ نے یہ صلہ ادا نہ کیا۔ صحیح وجہ اب تک معلوم نہ ہو سکی ساٹھ ہزار سونے کی اشرفیوں کی بجائے چاندی کی مہریں ملتی دیکھ کر فردوسی بہت مایوس ہو گیا۔ اور محمود سے رنجیدہ ہو کر طوس کو چلا گیا۔ محمود کی پشیمانی کے متعلق کئی قصے مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ عام یہ ہے کہ اس نے ساٹھ ہزار سونے کی اشرفیاں یا ان کے برابر نیل اونٹوں پر لدوا کر طوس بھیجا۔ لیکن جب اونٹ ایک دروازے سے داخل ہو رہے تھے، دوسرے دروازے سے غمزدہ شاعر کا جنازہ نکل رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اونٹوں اور جنازے کی کہانی قصے کو شاعرانہ طور پر دردناک بنانے کے لئے گھڑی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ فردوسی نے محمود کی بدسلوکی کے سبب ایک ہجو بھی لکھی۔ لیکن اس امر کے متعلق بھی کئی مختلف خیال ہیں۔ کئی تنقید نگاروں نے اس ہجو کو بعد کے کسی شاعر کی اختراع بتایا ہے۔ کئی محققوں نے کہا ہے کہ یہ ہجو خود شاہنامہ میں سے کچھ اشعار نکال کر تیار کی گئی۔

شاہنامہ کے علاوہ فردوسی نے یوسف زلیخا کے قصے کو بھی نظم کیا۔ اس میں کوئی نو ہزار شعر ہیں۔ اور مایوسی کی جھلک ہے۔ وہ زندگی اور شگفتگی جو شاہنامے کے کچھ بزمیہ شعروں میں نظر آتی ہے اس نظم میں غائب ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ نظم بعد میں نظامی گنجوی ایسے پیے مثال مثنوی گو کے لئے نمونہ بنی۔

کچھ غزلیہ اشعار بھی فردوسی کے نام سے منسوب ہیں۔ لیکن تذکرہ نویسوں نے انہیں کوئی خاص اہمیت نہیں دی البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان شعروں سے کئی ایسی باتیں اخذ ہوتی ہیں جو شاعر

کی زندگی سے متعلق ہیں۔

فردوسی نے کوئی نوّے برس کی عمر پا کر سنہ ۱۰۲۱ء اور سنہ ۱۰۲۵ء کے درمیان انتقال کیا۔ شاہنامہ ان بلند پایہ کتابوں میں سے ایک ہے جو دنیا کے بہترین ادبی شاہکار خیال کیئے جاتے ہیں۔ فردوسی کو اس کی خاص صنف شاعری میں پیغمبر مانا گیا ہے۔ بہتوں نے اُسے مشرق کا ہومر کہا ہے کیونکہ جس طرح ہومر نے یونان کی روح کو بیدار کیا تھا اُسی طرح سے فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر ایران کے افتخار کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔ شاہنامہ دراصل قدیم ایران کی تاریخ اور تہذیب کا ایک نہایت رنگین اور پُر حاصل ذخیرہ ہے۔ فردوسی نے ایرانی تہذیب کا اتنا موثر اور صحیح نقشہ کھینچ کے رکھ دیا ہے کہ اس کا جواب ملنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ایران جدید میں ایک زبردست مصلح اور ایک بے نظیر ملّت پرست کا رتبہ دیا گیا ہے۔

شاہنامہ جہاں شاعری اور بلاغت کے اعتبار سے نظیر نہیں رکھتا وہاں بلحاظ مضامین بھی اس کی بلندی اور اہمیت کو بہت کم نظمیں پہنچ سکتی ہیں:ـ

چو فردوسی آں زندۂ جاوداں — کز و زندہ شد نام پیشینیاں

اس کے متعلق خود فردوسی نے بھی کہا ہے ؎

ہر آں کس کہ دارد ہش و رای و دیں — پس از مرگ بر من کند آفریں

نمیرم ازیں پس کہ من زندہ ام — کہ تخم سخن را پراگندہ ام

شاہنامہ کی بے نظیر مقبولیت کے کئی اسباب ہیں: قومی افتخار کی رُوح، زبان کی وسعت، قدیم الفاظ کا مطالعہ، حب الوطنی، پرانے

قصوں کا بیان وغیرہ وغیرہ فردوسی نے اپنے غیر فانی شاہکار کے لئے جن ماخذوں کو استعمال کیا وہ یہ ہیں :۔

۱۔ وہ قصّے کہانیاں جو سینہ بسینہ چلے آئے تھے۔

۲۔ نامۂ پہلوی۔ اس ماخذ کو خود فردوسی نے نامۂ پہلوی لکھا ہے کئی محققوں نے اس لفظ کی تفسیر نامۂ خسروی، نامۂ خسروان یا نامۂ باستان کی ہے۔ غالباً اس سے مراد خدائی نامہ ہے جس کا اکثر جگہ ذکر آیا ہے۔ یہی کتاب تھی جسے المقنّع نے عربی زبان میں "سیر ملوک العجم" کے عنوان سے ڈھالا۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ فردوسی نے شاہنامہ لکھنے میں جھوٹ سے بہت حد تک پرہیز کیا ہے۔ جس واقعہ کے متعلق اُسے یقین علم نہیں ہوتا وہ اسے ذرا سنبھل کر بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اشکانی بادشاہوں کے متعلق کہتا ہے ؎

از ایشاں جز از نام نشنیدہ ام نہ در نامۂ خسرواں دیدہ ام

حمزہ اصفہانی اور البیرونی نے ثابت کر دیا ہے کہ شاہنامہ کے ماخذ پہلوی زبان میں لکھی ہوئی مستند کتابیں تھیں۔

"فردوسی غیر فانی" نامہ کا مقالہ لکھنے والے صاحب فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے فردوس سے فردوسی کو خاص اس مقصد کے لیے پیدا کیا تھا کہ ایران کی تاریخ اہرمین (شیطان) کی امت یعنی تاتار لوگوں کے ہاتھوں تباہ ہو جانے کے اندیشے سے پہلے ہی محفوظ ہو جائے۔

جناب ہادی حسن فرماتے ہیں کہ شاہنامہ نظم کرنے میں فردوسی

نے جہاں اس بات کا خیال رکھا کہ وہ صرف اپنی ذات کے احاطے
میں محدود نہ رہے وہاں اُس نے قوم پرستی کی سرحد کے عبور کر
جانے کو بھی قبول نہ کیا۔ جس قدر کہ اس نے دوسری زبانوں
کے الفاظ سے پرہیز کیا اسی قدر ان کی تشبیہوں سے چشم پوشی کی
شاہنامے میں عربی الفاظ کی اتنی قلت نہیں جتنی کہ عرب بہادروں
کی۔ فردوسی جب ایرانی بہادروں کے لئے کوئی تشبیہ پیدا کرنا چاہتا
تو عرب بہادروں کا بیان کرنے کی بجائے قدرت کی طاقتوں کے
سامنے ہاتھ پھیلاتا۔ تیزی کا ذکر مطلوب ہوتا تو ہوا اور گرد کو درمیان
لے آتا۔ گرجنے اور غصے میں آنے کا مقام آتا تو بادل اور آگ کو
یاد کرتا۔

جناب ہادی حسن کا خیال ہے کہ فردوسی کو جو عبور حرکت کے
بیان کرنے پر تھا وہ آوازوں کو ظاہر کرنے میں حاصل نہیں تھا۔ ہماری
رائے میں فردوسی کو حرکت کے استادانہ بیان میں بھی اچھی دسترس
نہ تھی۔ اس کی تصویریں نہ صرف خاموش ہی ہیں بلکہ غیر موثر بھی۔
اگر اچھی آوازوں کے لئے "خروش" کے علاوہ اس کے پاس بہت کم
الفاظ ہیں تو تیزی رفتار کی مشابہت کے لئے بھی ہوا اور گرد کے
سوا اس کے پاس کچھ نہیں رکھا۔ لیکن جب شاہنامے کی عظمت
اور فردوسی کی لازوال خدمت کا سوال پیش آتا ہے تو ہمیں ان شاعرانہ
باریکیوں کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیئے۔

مولانا شبلی نے فردوسی اور شاہنامہ کے متعلق بہت تفصیل
کے ساتھ بہترین بحث کی ہے۔ ضروری اقتباس نثر کے طور پر

درج کیا جاتا ہے۔

شاہنامہ کی خصوصیات اور اہمیت

۱۔ فردوسی کی قدرتِ زبان یہ ہے کہ ساٹھ ہزار اشعار لکھ ڈالے اور عربی الفاظ اس قدر کم ہیں کہ گویا نہیں ہیں۔ اگرچہ اس خصوصیت کا موجد دقیقی ہے۔ لیکن اس کے یہاں کل ہزار ایک شعر اور چند معمولی واقعات ہیں۔ حیرت وہاں ہوتی ہے جہاں فلسفیانہ . . . اصطلاحیں آتی ہیں۔ اور وہ بے تکلفی سے سادہ فارسی میں ان کو ادا کرتا جاتا ہے کہ گویا روزمرّہ کی باتیں ہیں۔ شیخ بوعلی سینا اپنی کتاب "حکمت علائیہ" میں اس کوشش کو نبھا نہیں سکا۔

۲۔ شاہنامہ بظاہر تو محض ایک رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے لیکن عام واقعات کے بیان میں اس تفصیل سے ہر قسم کے حالات آ جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صرف شاہنامہ کی مدد سے اس زمانے کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کا پورا پتہ لگا سکتا ہے۔

۳۔ ایشیائی شاعروں کا عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی داستان کے بیان کرتے میں حسن و عشق کا کہیں اتفاقی موقعہ آ جاتا ہے تو اس قدر پھیلتے ہیں کہ تہذیب اور سنجیدگی کی حد سے کوسوں آگے نکل جاتے ہیں۔ نظامی اور جامی ایسے مقدس لوگ بھی اس حمام میں آ کر ننگے ہو جاتے ہیں۔ لیکن فردوسی باوجود اس کے کہ تقدس کا دعویٰ نہیں کرتا ایسے موقعوں پر آنکھ نیچی کئے ہوئے آتا ہے اور صرف واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ایک سرسری غلط انداز

نگاہ ڈالتا ہوا گذر جاتا ہے۔

۴۔ جہاں جہاں بزم کا موقع آتا ہے شاعری کا چمن زار کھل جاتا ہے۔ ہر چند کہ عام خیال ہے کہ فردوسی بزم اچھی نہیں لکھتا یا نہیں لکھ سکتا۔ بے شبہ یوسف زلیخا میں بزم کے پھیکے ہونے کا سبب فردوسی کی دل شکستگی اور کثرت الم تھا۔

فردوسی نکتہ سنجی۔ بلاغت شعاری مضمون آفرینی اور خیال بندی کے تکلفات سے نہایت خوبی کے ساتھ عہدہ برا ہوا ہے اس کے بزمیہ شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ادائیں موجود ہیں۔۔۔ استعارات اور تشبیہات کا بھی ہلکا سا رنگ ہے۔ شاعرانہ ترکیبیں بھی ہیں۔ وہ اپنے کیریکٹرز کے انداز خوب جانتا ہے۔ عشقیہ شاعری کا کمال دکھانے کے ساتھ ساتھ وہ متانت اور شایستگی کے سر رشتہ کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ متاخرین بلکہ نظامی اور سعدی تک کو بھی اتنا سہارا ہاتھ آجاتا تو خدا جانے کہاں نکل جاتے۔

۵۔ شاعری کا اصل کمال واقعہ نگاری اور جذبات انسانی کا اظہار ہے۔ فردوسی ان دونوں باتوں میں تمام شعرا کا پیشرو امام ہے وہ جس واقعہ کو لکھتا ہے اس کے تمام جزئیات اور گرد وپیش سے ہر قسم کے حالات ڈھونڈ ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے۔ پھر ان کو اس خوبی کے ساتھ ہو بہو ادا کرتا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

وہ استعارہ کے پاس ہو کر نہیں نکلتا۔ تشبیہیں وہی پاس کر لیتا ہے۔ مجاز کو بہت کم ہاتھ لگاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان باتوں

نہیں قاصر ہے بلکہ وہ جانتا ہے کہ یہ چیزیں واقعہ کے چہرہ پر نقاب
ڈال دیتی ہیں۔ استعارات اور تشبیہات سے جب اُسے طباعی اور
انشا پردازی کا زور دکھانا مقصود ہوتا ہے تو وہ دوسرے موقعے
تلاش کرتا ہے۔

اس کی تفصیلی واقعہ نگاری کی بدولت ہم کو بہت سے ایسے
محاوروں تک رسائی ہوتی ہے۔ جو یوں کبھی عام طریقہ، بیان میں نہیں
آسکتے تھے واقعہ نگاری جب بہت دور حد تک پہنچ جاتی ہے تو وہ
مرقع نگاری یعنی سین دکھاتے ہیں نہایت کامیاب رہتا ہے۔

۶۔ جب کبھی درد و غم کے اظہار کا موقعہ آتا ہے (ہر چند کہ
رزمیہ میں ایسے مواقع کم آتے ہیں) فردوسی نے کمال کر دکھایا ہے
بلاغت یہ ہے کہ وہ ایسے واقعات کو زیادہ پھیلاتا نہیں۔

۷۔ بلاغت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ جب کسی واقعہ کے
بیان کرنے میں حد سے زیادہ زور دینا مقصود ہوتا ہے تو لمبی چوڑی
تمہید اور تفصیل وہ کام نہیں دیتی جو ایک پرزور مختصر جملہ کام دیتا
ہے۔ شاہنامہ میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں ؎

کنوں جنگِ سہراب و رستم شنو دگرہا شنیدستی ایں ہم شنو

"ایں ہم" نے داستانِ سہراب و رستم کو بہت زیادہ اہمیت
دیدی ہے۔ سننے والوں کی توجہ ایک دم اور پوری طرح سے شاعر
کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ ان دو لفظوں نے وہ کام کیا ہے کہ
دس شعر بھی مشکل سے کر سکتے ہیں۔

نظامی نے اپنے تجربہ میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں

لیکن فردوسی کے صرف دو مصرعے سبب پر بھاری ہیں ؎

بسے رنج بردم دریں سال سی   عجم زندہ کردم دریں پارسی

رستم کی مار دھاڑ، ہنگامہ آرائی اور قتال و جدال کا سماں صرف چار مصرعوں میں دکھایا ہے ؎

بروزِ نبرد آں یلِ ارجمند   بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند

درید و برید و شکست و بہ بست   یلاں را سر و سینہ و پا و دست

ایک اور جگہ بہت سی باتوں کو صرف ایک ہی شعر میں بند کر دیتا ہے ؎

پئے مشورہ مجلس آراستند   نشستند و گفتند و برخاستند

۸- صنائع بدائع شاعری کے زوال کا پیش خیمہ ہیں۔ اس لئے فردوسی کے کلام میں ڈھونڈنا نہیں چاہیئے۔ لیکن جو محاسنِ شاعری ضمناً کسی صنعت میں آجاتے ہیں۔ اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں اور اعلیٰ درجہ پر پائے جاتے ہیں۔

شاہنامہ کی زبان کی خصوصیات:

۱- ضمیروں کی انوکھی ترکیب۔ ع

زشادی رخاں شاں چو گل بردمید

(رخاں شاں = رخ ایشاں)

۲- غیر جاندار چیزوں کی جمع الف نون کے ساتھ۔ ع

اگر عمر باشد مرا سالیاں

(سالیاں = سالہا)

۳- اسم اور فعل کے آخر میں الف زاید۔ ع

سپاہکے بر آمد برہنہ تنشا

(تنشا = تن)

ع بہ سر روز گیتی بہ پیما یدا

(پیمایدا = پیماید)

۴- فارسی الفاظ پر تشدید: خوشیّ - زرّ - خمّ - مژّہ وغیرہم

۵- بعض زائد حروف: چونان بجائے چنان - اشیوا بجائے اشیا -

۶- اندرون بجائے در - ع

بگویم ز ماذرش

(ماذرش = ماذرش - پدرش = پذرش)

ع بہ شادی ہمہ جان پر افشاندار

(افشاندند = افشاندرار)

۸- نے کے پہلے الف زاید ع

ع انے اونبا شیم در جنگ شاد

۹- کجا بمعنی کہ ع

درفشش کجا پیل پیکر بود

۱۰- تائے خطاب کا استعمال - ع

ہزارانت کودک وہم نوش لب

۱۱- میم متکلم کا گرا دینا - ع

اگر من نہ رفتے بہ مازندران

(رفتے = رفتمے)

ان کے علاوہ و یا بجائے یا - از بر بجائے ازیں - آزمون -

بجائے آزمائش۔

ان تصرفات کے علاوہ سینکڑوں الفاظ ہیں جو بالکل متروک ہو چکے ہیں یا ان کی صورتیں بدل چکی ہیں۔ یا ان کی بجائے اور اور الفاظ استعمال میں ہیں۔

فردوسی کے کلام میں جو خاص بات کئی جگہ دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ کوئی فلسفیانہ نصیحت کرنا چاہتا ہے تو وہ ایک بہت بڑے ریفارمر سے کم نظر نہیں آتا۔ ع

تو تا خاک یابی ہمہ دوست کار

ایک اور جگہ خوب کہتا ہے ؎

شنیدم ز دانا کہ دانش بسے است ولیکن پراگندہ با ہر کسے است

نیام بلند ار بہ غلطی بہ خوں بہ از زندگانی بہ تنگ اندروں

عقلمند کی باتوں کو غور کے ساتھ سننے اور ان پر عمل کرنے کی اس سے بہتر ترغیب کیا ہو سکتی تھی ؎

اگر دانشی مرد راند سخن تو بشنو کہ دانش نگردد کہن

شاہنامہ پر بہت سی زبانوں میں تنقیدیں لکھی گئی ہیں اور ترجمے کئے گئے ہیں۔

سوال: غزنوی دور کے مشہور علما اور ادبا پر نوٹ لکھئے!

جواب: غزنوی دور میں مندرجہ ذیل مشہور فضلا اور حکما ہوئے ہیں۔

۱۔ شیخ ابو علی سینا۔ شیخ ابو علی سینا ایک عظیم المرتبہ فلسفی اور جلیل القدر عالم ہوا ہے۔ اس کا والد نوح بن منصور کے دور حکومت میں بلخ چھوڑ کر بخارا آباد ہو گیا تھا۔ ابن سینا ۳۷۰ھ میں

پیدا ہوا۔ چھوٹی عمر میں ہی تمام علوم حاصل کر لئے اور قرآن مجید کی تعلیمات پر کبھی عبور پا لیا۔ اس کے بعد علم فقہ، منطق، نجوم، ریاضی اور طب کی تکمیل کی۔ اس کے صغر سنی میں اس قدر عالم و حکیم ہونے پر اس کے استاد دنگ رہ گئے۔ حکمت الہیہ اور باورالطبعیات کے مسائل پر خاص توجہ دی۔ اس طرح علم و فضل سے آراستہ ہونے کے بعد دقیق فلسفیانہ مسائل اور اصولِ طب کی تدوین کی اور امراض کے علاج میں مصروف ہو گیا۔ ان میں اُسے بے حد شہرت نصیب ہوئی۔

اوّل اوّل وہ سامانی حکمرانوں کے دارالخلافہ بخارا میں مقیم رہا اس کے بعد خوارزمشاہیوں کے پائے تخت کرکانج میں چلا گیا۔ یہاں مامون بن مامون خوارزمشاہی کے دربار میں اس نے بہت عزت کا مقام حاصل کیا۔ سلطان محمود غزنوی کے ظہور کے بعد وہ زیاریوں کے پائے تخت گرگان میں چلا آیا۔ یہاں سے رَے، ہمدان اور اصفہان گیا۔ شمس الدولہ بن فخرالدولہ دیلمی کی ملازمت اختیار کر لی اور دو بار ہمدان میں اس کی وزارت پر فائز ہوا۔ سفر کے مصائب اور حکومت کے فرائض منصبی کے باوجود اس نے علم و ہنر کے طالبوں کی مدد کی اور انہیں علم و حکمت کے نور سے مستفیض کیا۔ اور ساتھ ہی بلند درجہ تصانیف بھی مرتب کیں۔

شیخ صاحب کی تصانیف کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب "شفا" ہے جو حکمت، منطق،

طبعیات اور ریاضیات پر مشتمل ہے۔ دوسری شہرہ آفاق تصنیف کتاب "قانون" ہے۔ یہ طب پر ہے۔ اس کے پانچ حصے ہیں:۔
کلیات۔ ادویہ مفردہ۔ امراض مخصوصہ اعضا۔ امراض عمومی بدن۔ ادویۂ مرکبہ۔ ایک اور تالیف "اشارات" ہے۔ یہ کتاب منطق اور حکمت پر ہے۔ ان کتابوں کو دنیا کی اولین بڑی تصنیفات میں شمار کیا جاتا ہے۔

شیخ علم و ادب میں بھی کمال رکھتا تھا۔ عربی قصائد بھی لکھے ہیں۔ مثلاً قصیدۂ نفس۔ "سلامان" اور "ابسال" جیسے عربی قصے بھی لکھے۔ ایک عربی لغت بھی مرتب کی تھی جو نایاب ہے۔ شیخ نے فارسی زبان میں بھی تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ اس کی فارسی کتاب فلسفہ پر "دانش نامہ علائی" کے نام سے مشہور ہے۔ فارسی میں شعر بھی کہے۔ ۴۲۸ھ میں بمقام ہمدان انتقال کیا۔

۲۔ ابوالفضل بیہقی: ابوالفضل بیہقی نے اکثر ہمعصر علما کے برعکس عربی کے بجائے فارسی زبان کو اپنی تصانیف کا ذریعہ بنایا۔ اس نے غزنوی بادشاہوں کی ایک جامع اور مبسوط تاریخ تیس جلدوں میں تالیف کی جن میں سے بیشتر ناپید ہیں یہ ایک شاہکار ہے جو نہایت بلیغ اور دلکش فارسی زبان میں لکھا گیا۔ جو جلدیں اس تاریخ کی بچی ہیں وہ سلطان مسعود کے دور سے متعلق ہیں۔ یہ تاریخ مسعودی کے نام سے موسوم مگر تاریخ بیہقی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں واقعات اور حقائق کو صداقت اور غیر جانبداری

کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مبالغہ یا باطل نام کو بھی نہیں۔ در اصل اس نے تاریخ نگاری کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ ۴۵۱ھ میں یہ تاریخ تکمل ہوئی ۴۷۰ھ میں اس عالم مورخ نے وفات پائی۔

۳۔ بدیع الزمان: ابوالفضل احمد بن حسن بدیع الزمان ہمدانی غزنوی دور کا ایک بلند پایہ اور مشہور ادیب تھا۔ اس کی خط و کتابت ہمعصر بڑے بڑے علما و فضلا سے رہتی تھی۔ اس نے ادبی روایتوں اور کہانیوں کو مسجع عربی نثر میں لکھا اور مقالہ نویسی کا سبک ایجاد کیا۔ اس کی کتاب "مقامات بدیع الزمان" بدر اکیاون مقامات ہیں)۔ اور اسے سیستان کے امیر خلف بن احمد کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اسے عربی ادب میں ایک بلند درجہ حاصل ہے۔ بدیع الزماں فارسی زبان میں بھی شعر کہتا تھا۔ ۳۹۸ھ میں وفات پائی۔

۴۔ ثعالبی۔ ابو منصور عبد الملک بن محمد ثعالبی نیشاپور کا رہنے والا تھا۔ غزنوی دور کے بلند درجہ ادبا میں شمار ہوتا ہے قصص۔ امثال۔ حکم اور لغت پر اس کی متعدد کتابیں ہیں اس نے بہت سے عربی گو ایرانی اور عرب شعرا کے حالات اور منتخب کلام پر "یتیمۃ الدہر" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اور پھر اس کی تکمیل "تتمۃ الیتیمہ" کے نام سے کی ۴۲۹ھ میں انتقال کیا۔

۵۔ ابو علی مسکویہ۔ ابو علی محمد مسکویہ غزنوی دور عہد کا ایک عظیم القدر عالم اور مورخ گزرا ہے۔ کہتے ہیں پہلے زرتشتی (آتش پرست) تھا بعد میں اسلام قبول کر لیا۔ عضد الدولہ دیلمی کے

دربار میں اسے قرب حاصل تھا۔ اور اس کا خزانچی تھا۔ اس کی متعدد کتابیں تاریخ، طب اور اخلاق پر ہیں۔ اسلام اور ایران کی عام تاریخ پر اس کی مشہور تصنیف "تجارب الامم و تعاقب الہمم" ہے، اُسے تاریخ نویسی کے فن میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ایک اور مشہور تالیف "تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق" ہے جس میں اخلاق سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ مشہور فلسفی نصیر الدین طوسی نے اس کتاب کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ اس نے ۴۲۱ھ میں انتقال کیا۔

۶۔ بیرونی۔ ابوریحان محمد بن احمد بیرونی دنیا کے بلند پایہ حکما اور ایران کے جلیل القدر علما میں سے ہے۔ ۳۶۲ھ میں پیدا ہوا۔ بیرونی نزد خوارزم کا رہنے والا تھا۔ اوائل عمر خوارزم میں بسر کی۔ مامون بن مامون خوارزم شاہ اور گرگان کے حاکم .... شمس المعالی قابوس بن وشمگیر زیاری کی سرپرستی اُسے حاصل رہی۔ اس کے بعد سلطان محمود کے دربار میں رسائی نصیب ہوگئی۔ اور اس کے دربار میں تقرب حاصل کیا۔ سلطان محمود نے جو ہندوستان کے سفر کئے بیرونی سلطان کے ساتھ رہا اور ہندوستان کے چشم دید حالات بیان کئے۔ ہندوستانی زبان سنسکرت بھی سیکھی۔ البیرونی کی ایک مشہور تصنیف "الآثار الباقیہ عن قرون الخالیہ" ہے۔ اس میں ایرانیوں (مع سغدیوں۔ خوارزمیوں و پارسیوں) یونانیوں۔ یہودیوں۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کی تقویم سنین اور حالات وغیرہ لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۳۹۰ھ میں تالیف

ہوئی۔ اور اسے قابوس کے نام سے معنون کیا گیا۔ بیرونی کی ایک اور مشہور کتاب "تحقیق الهند" ہے۔ یہ ہندوستان کے حالات، واقعات اور اخلاق پر ہے۔

ہیئت۔ نجوم اور ہندسہ پر اس کی دو بلند پایہ تصنیفات ہیں۔ التفہیم الاوائل صناعتہ التنجیمہ" یہ تالیف ۴۲۰ھ میں غزنہ کے مقام پر پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اسے حسین خوارزمی کی بیٹی ریحانہ کے نام سے معنون کیا گیا۔ اس کا ایک حصہ فارسی زبان میں ہے۔ (۲) دوسری کتاب "قانونِ مسعودی" ہے۔ یہ کتاب ۴۲۱ھ اور ۴۲۷ھ کے دوران تالیف ہوئی۔ اور سلطان مسعود غزنوی کے نام معنون ہوئی۔ اس نے ۴۴۰ھ میں وفات پائی۔

سوال "سلجوقی عہد حکومت میں جو عروج قصیدہ گوئی کو نصیب ہوا۔ کسی اور دور میں نہیں ہوا" اس بیان پر تاریخی اور تنقیدی بحث کیجئے۔

جواب: سلجوق عہد حکومت سے پہلے محمود غزنوی کے وقتوں میں قصیدہ گو شعرا نے اپنا کمال دکھایا تھا۔ لیکن ان شاعروں کی قصیدہ گوئی درحقیقت ابھی ابتدائی منازل طے کر رہی تھی۔ سلجوق عہد کے قصیدہ نگار شعرا جن میں انوری کو ممتاز ترین رتبہ حاصل ہے فارسی قصیدہ کی تاریخ میں ایک لاثانی مقام رکھتے ہیں۔ ایران میں آج تک سلجوق عہد کا سا ماحول پیدا نہیں ہوا جس میں قصیدہ گوئی کو ترقی حاصل ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاتاریوں نے اس بزم کے چراغ کو گل کر دیا۔ نظامی گنجوی کے بعد شعر و شاعری میں فلسفہ بہت آ گیا تھا لیکن تاتاریوں

نے ایران کے امن و امان کے ساتھ فلسفیانہ خیالات کی رفتار کو بھی ایک عرصہ کے لئے ختم کر دیا۔ دورِ صفویہ آیا تو ایک بار پھر فلسفیانہ اور مذہبی شاعری کو ترقی نصیب ہوئی یہ زمانہ قصیدہ گوئی کے لئے سازگار نہ تھا اس لئے کہ صفوی بادشاہ شیعہ مذہب رکھتے تھے اور اپنے حق میں قصیدے نہیں سننا چاہتے تھے۔ جب محتشم کاشی شاہ صفویہ کی مدح میں قصیدہ لکھ کر لایا تو اسے یہ جواب ملا کہ "ہماری تعریف سے کیا فائدہ؟ جگر گوشۂ رسول ؐ کی شان میں کچھ لکھو تو اس دنیا میں بھی بھلا ہو گا اور اگلے جہان میں بھی نیکی پاؤ گے۔ چنانچہ ایران میں تو قصیدہ گوئی کا قصہ پاک ہو گیا۔ مغلیہ خاندان کے درباری شاعروں میں اچھے اچھے قصیدہ گو شاعر ضرور ملیں گے لیکن انصاف یہ ہے کہ اُن کا فن سلجوق عہد کے قصیدہ نگاروں کے سامنے مات نظر آتا ہے۔ ویسے بھی اس عہد میں غزل کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ ایران جدید میں تو قصیدہ کو مذہب کی مانند شعر سے دُور ہی رکھا جاتا ہے۔

"قدما کے کلام میں مترادف الفاظ اور مختلف اقسام کی لفظی صنعت گریاں اس کثرت سے ہیں کہ جی اکتا جاتا ہے اور چونکہ یہ اوصاف اکثر مشترک ہیں اس لئے جس کا کلام اٹھا کر دیکھو ایک ہی آواز آتی ہے غالباً سب سے پہلے اس طرز میں کسی قدر تبدیلی انوری نے کی۔ اس نے الفاظ کے خاص ناپ تول کا کام کیا اور بہت سے سادہ اشعار لکھے۔ جن میں لفظی خصوصیتوں کی رعایت نہ تھی۔ اس کے ساتھ مضمون آفرینی پر توجہ دی جس سے الفاظ کی بندش قدرے کم ہوئی

اور خیال دوسری طرف رجوع ہو سکا۔ ظہیر فاریابی نے دقت آفرینی اور مضمون بندی کا آغاز کیا۔ متوسطین اور متاخرین کی دقیق خیال بندیاں اُسی کے نمونہ پر قائم ہوئیں۔

سلجوقیہ کے اوجِ شباب کا زمانہ ملک شاہ اور سنجر کا زمانہ ہے اور یہی دَور فارسی شاعری کا معراج شباب ہے۔ سلجوقی شعرا کی فہرست نہایت وسیع ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں:۔

امیر معزی۔ ارزقی۔ لامعی۔ فخر الدین سعد شہابی خراسانی۔ عبد الواسع جبلی۔ انوری۔ حسن غزنوی۔ رضی الدین نیشاپوری۔ ادیب صابر۔ علی باخرزی۔ فتوحی مروزی۔ ابو المعالی۔ مجمع الفصحا کے دیباچہ میں اور بھی بہت سے نام لکھے ہیں۔ اس دور کی چند خصوصیات لحاظ کے قابل ہیں۔

اس عہد تک شاعری نے اگرچہ بے انتہا ترقی کر لی تھی لیکن یہ ترقی صرف مضمون اور فن کی حیثیت سے تھی۔ شاعری کی زبان اب تک ٹکسالی نہ تھی۔ شاعری کی بنیاد سامانی حکومت میں قائم ہوئی اور غزنویہ کے عہد میں اوجِ ترقی پر پہنچی۔ ان خاندانوں کے پایۂ تخت بخارا اور غزنی تھے۔ جہاں کی مادری زبان ترکی یا افغانی تھی۔ شعرا جس قدر تھے من حیث الاغلب سب کے سب انہیں مقامات کے رہنے والے تھے جو ایران کے اصلی مرکز یعنی شیراز، اصفہان اور نیشاپور سے دُور تھے۔ فرخی سیستانی تھا۔ عنصری بلخ کا رہنے والا تھا۔ منوچہری دامغان سے تعلق رکھتا تھا۔ عسجدی اور دقیقی مرو کی سرزمین سے اٹھے تھے۔ سلجوقیہ نے نیشاپور کو پایۂ تخت قرار دیا۔ اس تعلق سے ان لوگوں میں شاعری

پھیلی جو ایران کی زبان کے اصلی مالک تھے۔ اسی کا اثر ہے کہ اس عہد کے شعرا کی زبان زیادہ لطیف، شیریں اور محاورات و مصطلحات سے لبریز ہے۔

اسی عہد میں فارسی زبان کی ترقی کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ اب تک تمام اسلامی سلطنتوں کی علمی اور دفتری زبان عربی تھی۔ سلطان محمود غزنوی اپنی ملکی اور قومی خصوصیات کا بہت دلدادہ تھا تاہم دفتر کی زبان اس کے عہد میں بھی عربی ہی رہی فرامین اور توقیعات تک اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ لیکن الپ ارسلان سلجوقی جب تخت نشین ہوا تو اس نے حکم دیا کہ دفتر کی زبان فارسی کر دی جائے۔ چنانچہ دولت شاہ سمرقندی نے طبقہ اوّل کے شعرا کا جہاں ذکر شروع کیا ہے تفصیل سے اس واقعہ کو لکھا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ فارسی زبان جس کے عنصر میں ترقی کا مادہ موجود تھا، سلطنت کی زبان بن کر کس قدر ترقی کر گئی ہوگی۔

سلطان سنجر کی قدردانی اور حاتمانہ فیاضی نے پھر وہی محمودی دربار قایم کر دیا۔

سوال: سلجوق خاندان سے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے اور اس خاندان کے مشہور بادشاہوں پر مختصر نوٹ لکھئے۔

جواب: سلجوقی خاندان ترکمان قبیلوں میں سے ایک قبیلہ تھا جو گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں شمالی علاقوں کو فتح کرتا ہوا ایران میں داخل ہوا۔ غزنوی حکومت کی جڑیں اندرونی کشمکش کے باعث کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ اس لئے سلجوقیوں نے محمود غزنوی کے

جانشینوں کو ہندوستان کی طرف دھکیل دیا۔ساتھ ہی ساتھ وہ مغرب اور جنوب کی جانب بڑھے۔ اور دولت بویہ کے پرچچے اڑا دیئے۔ کیونکہ آل بویہ کے حکمران پہلے ہی زیاری خاندان کے بادشاہ قابوس بن وشمگیر اور محمود غزنوی کے ہاتھوں زک اٹھا چکے تھے۔ اب سلجوقیوں کے لئے ان کا صفایا کرنا مشکل نہ تھا۔

سلجوقیوں نے مزید پیش قدمی کر کے بغداد میں بھی کامرانی کے جھنڈے گاڑ دیئے یہاں سلجوقیوں کا سردار طغرل بیگ مسند خلافت پر ہو بیٹھا۔ اور اقتدار بڑھانا شروع کر دیا۔ طغرل بیگ کے بعد الپ ارسلان اور اس کے بعد ملک شاہ تخت نشین ہوا۔ سلطان سنجر اس خاندان کا عظیم المرتبہ حکمران ہوا ہے۔

ان عظیم الشان تاجداروں کی سلطنت افغانستان سے لے کر مصر کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے دربار میں اہل قلم کی چاندی تھی۔ چنانچہ عہد سلجوقیہ فارسی ادب کی تخلیق اور ترقی کے لئے خاص طور پر قابل ذکر ہے

الپ ارسلان : الپ ارسلان سلجوق بادشاہ طغرل کا بھتیجا اور اس کا جانشین تھا۔ کئی تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ اس کی پیدائش ۱۰۲۹ء میں ہوئی۔ ابن الاثیر نے اس کی پیدائش ۱۰۳۲ء میں اور صاحب راحتہ الصدور نے ۱۰۳۹ء میں لکھی ہے۔

ابن الاثیر لکھتا ہے کہ اس کی وسیع سلطنت ماوراالنہر کے دُور دراز حصوں سے لے کر شام کے دُور دراز حصوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ اس نے تقریباً بارہ سال سے زیادہ حکومت نہ کی

تاہم اس کا عہد نمایاں ترین واقعات سے منور ہے حکومت کے پہلے ہی سال میں اس نے ختلان، ہرات اور صغانیان کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے علاوہ یونانیوں کو ایشیائے کوچک کے اندر تک دھکیل دیا۔ ۱۰۶۵ء میں اس نے فارس اور کرمان میں ایک بغاوت فرو کی۔ فاطمی خلیفوں کی طاقت کو اس نے دبائے رکھا۔ اور حلب۔ مکہ اور مدینہ کو ان کے اقتدار سے نکال لیا۔ ۱۰۷۱ء میں اس نے پندرہ ہزار فوج کے ساتھ رومیوں کی دو لاکھ سپاہ کو ایشیائے کوچک میں شکست فاش دی۔ رومیوں کے جرنیل ڈائیوجینس رمانس کو نہایت ذلت آمیز شرطوں پر صلح کرنی پڑی۔ حتیٰ کہ بقول البیرونی اس کی رعایا نے اس کا نام رومی بادشاہوں کی فہرست سے ہمیشہ کے لئے محو کر دیا۔

۱۰۷۲ء میں الپ ارسلان ترکوں کے خلاف ایک مہم کے دوران دو لاکھ سپاہیوں کے ساتھ جیحون تک پہنچ گیا۔ ایک دشمن قیدی یوسف ترزمی نے موقع پا کر اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے سلجوق بادشاہ کو ہلاک کر ڈالا۔ الپ ارسلان کا نام اس لئے بھی مشہور ہے کہ اس نے نظام الملک جیسے قابل وزیر اور مشیر کی قدر کی۔

سلطان سنجر: سلطان سنجر سلجوق خاندان کا عظیم ترین بادشاہ تھا سنجر کا عہد سلجوق خاندان کا سنہری زمانہ ہے اس کی موت سے سلجوقیوں کے اقتدار کا جنازہ نکل گیا۔ سنجر ملک شاہ کا پوتا تھا۔ اس نے ۱۱۱۷ء سے ۱۱۵۷ء تک حکومت کی، اس کے اقتدار کا مرکز خراسان تھا۔ سنجر کی فتوحات اور اس کے شاہی وقار کی عظمت کا

اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ سنجر ہی وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے شاہی محل کے دروازے پر دن میں پانچ وقت نوبت کے بجانے کی رسم شروع کی۔ سنجر کی زندگی کے آخری پندرہ سال ناکامیوں اور مایوسیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ سنہ ۴۰-۱۱۴۱ء میں اتسز خوارزم شاہ نے خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے بغاوت کر دی۔ ۴۲-۱۱۴۱ء میں سنجر نے ترکوں کے ہاتھوں شکست فاش کھائی۔ اس کی ملکہ قید ہو گئی۔ اور ایک لاکھ سلجوقی جوان میدان جنگ میں کھیت رہے۔ کچھ وقت کے لئے مرو، نیشاپور اور بیہق اس کے ہاتھ سے جاتے رہے سنہ ۱۱۵۳ء میں غز ترکوں نے طوس اور نیشاپور پر ہلہ بول دیا۔ سنجر کو شکست ہوئی۔ اور وہ سنہ ۱۱۵۶ء تک ترکوں کی قید میں رہا۔ آخر اس کے کچھ وفادار ساتھیوں نے ترک پہرہ داروں کو رشوت دے کر اُسے قید سے چھڑا لیا۔ لیکن اتنی بڑی سلطنت کا زوال اور اتنے عظیم اقتدار کا انحطاط دل شکستہ سلجوق بادشاہ کی موت کا سبب بن گیا۔

سنجر کا زمانہ فارسی اور عربی نظم و نثر کی وسعت اور ترقی کے لئے نہایت روشن زمانہ ہے۔ اس کے عہد حکومت میں ذیل کے صاحب کمال پیدا ہوئے:۔

۱۔ خواجہ فریدالدین عطار (سنہ ۱۱۲۰ء)
۲۔ نظامی گنجوی (سنہ ۱۱۴۰ء)

ذیل کے شعرائے کرام نے وفات پائی:۔

۱۔ حکیم عمر خیام (۲۲-۱۱۲۱ سنہ ء)
۲۔ ازرقی (سنہ ۱۱۳۰ء)

۳۔ مسعود بن سعد (۱۱۳۱ء)
۴۔ ادیب صابر (۱۱۴۳ء)
۵۔ امیر معزی (۴۸۔ ۱۱۴۷ء)
(۶) عمعق بخاری (۴۹۔ ۱۱۴۸ء)

ذیل کے شعراء نے خوش کلام نے عروج پایا:۔
سنائی۔ عروضی سمرقندی۔ انوری۔ رشید الدین وطواط۔

سوزنی نثر میں ذخیرہ خوارزم شاہی (۱۱۱۰ء) ترجمہ کلیلہ و دمنہ۔ (۱۱۴۳ء) مقامات حمیدی (۱۱۶۰ء)، چہار مقالہ (۱۱۶۵ء) سب کے سب شاہکار وجود میں آئے۔

سنجر علم و ادب کا بہت بڑا قدر دان تھا۔ اس سلسلے میں وہ محمود غزنوی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس نے امیر معزی کو اپنا ملک الشعرا مقرر کیا۔ معزی کے رتبے کا یہ عالم تھا کہ سنجر نے حکم دیا تھا کہ اس کا لقب میرے لقب پر رکھا جائے۔ سنجر کا لقب معز الدنیا والدین تھا۔ اسی بنا پر ملک الشعرا کا تخلص معزی قرار پایا۔ بعد میں انوری کے سے یکتائے زمانہ کو ملک الشعرا کا رتبہ دیا گیا۔ اور سلجوقیوں کا سب سے بڑا تاجدار سنجر انوری سے ملنے اس کے گھر جایا کرتا تھا۔

سوال: "کلیلہ و دمنہ" پر نوٹ سپرد قلم کیجئے۔

جواب: "کلیلہ و دمنہ" دنیا کی ان مقبول ترین اور خوش قسمت کتابوں میں سے ہے جن کا ترجمہ دنیا کی غالباً ہر مہذب زبان میں ہو چکا ہے۔ شہرت، مقبولیت اور ہمہ گیر فواید عملی کے لحاظ سے دنیا کی بہت تھوڑی کتابیں کلیلہ و دمنہ کے مقابلے کا دعوے کر سکتی ہیں۔

قدیم ہندوستان کے کسی راجہ نے اپنے شہزادوں کی تعلیم پر ایک نہایت دانا برہمن کو مامور کر رکھا تھا۔ اس نے بچوں کی سائنٹفک اور بہترین تعلیم کے لئے چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیوں کا سنسکرت زبان میں ایک مجموعہ لکھا۔ ان مثالوں کی امداد سے شہزادے ہر مشکل سیاسی تدبر کو آسانی سے سمجھ جاتے انہیں بیدپائے (BIDPAI OR. (PILPAI کی کہانیاں کہتے ہیں۔ سیاست عملی کے موضوع پر آج تک اتنی کامیاب کتاب اور کوئی نہیں لکھی گئی۔ نوشیروان عادل کے عہد میں یہ اکسیر حیات بزرجمہر کی وساطت سے ایران پہنچی۔ وہاں شاہی حکم سے اس کا پہلوی زبان میں ترجمہ ہوا۔ پھر سریانی زبان میں منتقل ہوئی۔ ابن المقنع (۷۵۷ء) پہلوی اور عربی زبان کا ایک فاضل ادیب تھا۔ اس نے پہلوی ترجمے کو عربی زبان میں ڈھالا۔ اور یہی ترجمہ آج تک کلیلہ و دمنہ کے نام سے مشہور ہے۔ سنسکرت میں کلیلہ کی صورت کارتکا اور دمنہ کی صورت دمنکا ہے۔ یہ دونوں الفاظ دو گیدڑوں کے نام ہیں جو کتاب میں ایک بہت اہم اور نمایاں حصہ لیتے ہیں:

ابن المقنع کے عربی ترجمہ کی ابتدائی شکل کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی میں ملتی ہے جو غزنی کے ایک بادشاہ بہرام شاہ (۱۱۱۸ء تا ۱۱۵۲ء) کے نام سے منسوب ہے۔ فارسی مترجم کا نام نظام الملک نصر اللہ بن محمد بن عبدالحمید ہے۔ یہ خسرو ملک بن بہرام شاہ کے وزیر تھے اس ترجمے سے پہلے فارسی شاعری کے باوا آدم رودکی نے بھی کلیلہ و دمنہ کا فارسی مثنوی میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن یہ مثنوی نایاب ہے۔

سولھویں صدی عیسوی میں حسین واعظ کاشفی نے فارسی نثر میں انوار سہیلی کے نام سے کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ پیش کیا۔ انوار سہیلی میں تصنع، حاشیہ آرائی اور قافیہ پیمائی کی بہت بھرمار ہے۔ اکبر اعظم کے عہد میں ابوالفضل علامی نے انوار سہیلی کو آسان تر اور سادہ تر شکل میں پیش کر کے اس کا نام عیار دانش رکھا۔ صاحب مآثر الامرا کا قول ہے کہ ابوالفضل نے سادہ نگاری کا خوب حق ادا کیا ہے۔

صاحب ہفت اقلیم اور صاحبِ تاریخ وصاف نے کلیلہ ودمنہ کو فارسی نثر کی کتابوں میں یکتا اور بے مثال مانا ہے

مسٹر اوسلے نے انوار سہیلی کو ۱۸۵۷ء میں چھاپا۔ ایسٹ وک نے ۱۸۵۴ء میں اور والسٹن نے ۱۸۷۷ء میں اس کا ترجمہ کیا کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی ۱۸۸۷ء میں بمقام طہران چھپ چکی ہے ہندوستان میں بھی دو ایک فارسی ترجمے چھپ چکے ہیں۔ ترکی زبان میں "ہمایوں نامہ" کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ ہے۔

سوال: نظام الملک کے احوال و آثار پر روشنی ڈالئے۔

جواب: سلجوق بادشاہ قابلیت رکھنے والے لوگوں کی بہت قدر کرتے تھے۔ نظام الملک بھی ایسے ہی قابل آدمیوں میں نمایاں ترین شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ۱۰۱۷-۱۸ء میں طوس کے مقام پر پیدا ہوا۔ غیر موافق حالات کے باوجود اس نے علوم رائجہ اور عربی زبان کی خاطر خواہ تعلیم حاصل کی۔ اور بلخ میں ایک معمولی سے کام پر مامور ہو گیا۔ بالآخر وہ الپ ارسلان کا مشیر اور وزیر بن گیا۔ الپ ارسلان کی تخت نشینی کے بعد وزارت عظمیٰ کا

عہدہ اُسے حاصل ہوگیا۔ اس کی لیاقت اور سیاسی تدبر کا تمام تذکرہ نویسوں نے اعتراف کیا ہے۔ وہ ایک کٹر سُنی تھا۔ شیعوں اور اسماعیلیوں کے خلاف اس کے دل میں گہری نفرت تھی۔ اہل ادب کے حق میں وہ نہایت فیاض تھا۔ حکیم عمر خیام کا سا صاحب کمال بھی اس کے فیض سے مستفید ہوا۔ رفاہ عامہ، اشاعت مذہب اور تعلیم عوام کے سلسلے میں نظام الملک کی دلی کوششیں بے حد قابل تعریف ہیں۔ نظامیہ کالج بغداد جس کو حجت الاسلام ابوحامد محمد الغزالی کے سے شہرہ آفاق اہل کمال کو اپنے پروفیسروں کے زمرے میں رکھنے کا فخر اور شرف حاصل تھا اس کی بنیاد نظام الملک ہی نے رکھی تھی۔ نیشاپور اور بلخ وغیرہ کے مدارس نظامیہ میں بھی طالبان علم و فن کی تربیت کا کماحقہ انتظام کیا۔ نظام الملک کے بارہ بیٹے تھے اور تقریباً تمام کے تمام اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ گویا نظام الملک کا بلند پایہ خاندان اپنے کمال اور عروج کی کامیابیوں کے اعتبار سے برامکہ خاندان سے ٹکر لیتا ہے۔ لیکن اس خاندان کی قسمت میں بھی وہی سازشیں اور حاسدوں کی تباہ کاریاں لکھی تھیں۔ جو ان دونوں خاندانوں کی بربادی کا موجب بنیں۔ انجام الامر حاسدوں کی کارستانیاں سلطان جلال الدین ملک شاہ سلجوق پر کام کر گئیں۔ ملک شاہ کی بیوی ترکان خاتون پہلے ہی نظام الملک کے خلاف تھی۔ اب وہ ابو الغنائم تاج الملک فارسی کی تربیت کرنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نظام الملک کی جگہ تاج الملک کو مل گئی۔ اور وہ بدنصیب وزیر

جس نے اتنا عرصہ اپنی قابلیت سے سلجوق خاندان کی خدمت کی تھی سنہ ۹۲ء میں ایک دیلمی ملحد کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔

نظام الملک ادبی مذاقِ سلیم رکھتا تھا۔ سیاست نامہ اس کی مشہور ومقبول تصنیف ہے۔

سوال: سیاست نامہ سے متعلق آپ کیا جانتے ہیں اس کی اہمیت واضح کیجئے۔

جواب: نظام الملک کے ادبی مذاق اور غیر معمولی ذہانت نے اُسے مجبور کیا کہ وہ اپنے گوناگوں فرائض کی سرانجامی کے باوجود کسی ادبی خدمت کے لئے وقت نکالے۔ چنانچہ اس نے فنِ حکومت کے موضوع پر "سیاست نامہ" کے نام سے ایک قابلِ رشک کتاب لکھی اس کتاب میں حکمرانی کے جو اصول اور نظریات درج ہیں ان کی بنیاد قابل مصنف نے اپنی تاریخی معلومات اور وسیع تجربات پر رکھی ہے۔ "سیاست نامہ" کے پچاس باب ہیں۔ ان ابواب میں ہر قسم کے شاہی فرائض اور حقوق امتیازی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے حکومت کے ہر ایک محکمے کے متعلق پُر از معلومات بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے متعلق مشہور ہے کہ ملک شاہ نے اپنے قابل مشیروں کو سیاست علمی وعملی کے متعلق ایک مستند ترین کتاب لکھنے کے لئے کہا تھا۔ اس فرمائش کی تعمیل میں نظام الملک نے یہ معرکتہ الآرا شاہکار سنہ ۱۰۹۱-۹۲ء میں اپنی ہلاکت سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے پیش کیا تھا۔ پروفیسر براؤن سیاست نامہ کو فارسی نثر کی مفید ترین اور دلچسپ ترین کتابوں میں شمار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس

میں بہت سا دلچسپ تاریخی مواد ہے۔ اور کہ ایک ایسے عظیم المرتبہ وزیر اعظم کے سیاسی خیالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں جس پر مشرق کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔

"سیاست نامہ" کا انداز تحریر نہایت سادہ، صنائع بدائع سے پاک اور حقیقت حال کا پورا پورا ترجمان ہے "کتاب سیر الملوک معروف بہ سیاست نامہ نثرے سلیس دارد و خوانندگاں را باگاہی از رسوم جہانداری پیشینیاں بہرہ مند مے گرداند"

بعض اوقات تو مصنف تصنع سے بچتا ہوا قدیم انداز بیان کی الجھن میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ سات باب ملحدوں کا ذکر کرنے کو وقف کئے گئے ہیں۔ خاص کر فرقہ باطنی اور اسماعیلیہ کو بہت کوسا گیا ہے۔ یہ باب نہایت دلچسپ ہیں۔ نظام الملک کی رائے میں چھوٹے چھوٹے فرقوں، اور طبقوں کا وجود سلطنت کی طاقت اور اقتدار کو گھٹاتا ہے۔ مصنف شیعوں کے خلاف نہایت پُر جوش استدلال سے کام لیتا ہے اور ان میں سے بعض پر پیغمبر نما کمیونسٹ مزدک کے عقاید و نظریات کی پیروی کا الزام دھرتا ہے (مزدک ساسانی بادشاہ قباد کے وقت میں ایک بڑا فصیح و بلیغ شخص گذرا ہے۔ اس نے ایک نیا مذہب نکالا تھا۔)

سوال: "فرقۂ اسماعیلیہ پر مختصر نوٹ لکھیے۔"

جواب: یہ فرقہ شیعہ مذہب کی ایک شاخ ہے۔ سب سے بڑا فرق صرف یہ ہے کہ شیعہ لوگ بارہ امام مانتے ہیں۔ جب کہ

اسماعیلی صرف سات۔ ساتویں امام کا نام اسماعیل تھا یسیب سے آخری یعنی بارھویں امام مہدیؑ جواب تک چھپے ہوئے ہیں ایک نہ ایک دن آنے والی دنیا کا مصلح اعظم بن کر نمودار ہونگے اسماعیلی دو قسم کے امام مانتے ہیں۔ ایک تو ہیں وہ جو جناب رسول خدا کی نسل سے ہیں۔ اور دوسرے ہیں ساسانی بادشاہوں کی نسل سے۔ اسماعیلیوں کے نظام صوفیہ میں مسئلہ صدور (EMANATION) اور تجسّم (INCARNATION) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے نظامِ عقاید میں سات کا عدد بہت اہم ہے۔ اسی لیئے انہیں سبعی بھی کہا جاتا ہے۔

امام مہدی سنہ ۷۴-۸۷۳ء میں غائب ہوئے اور اسی اثنا میں اسماعیلیوں کا پرچار شروع ہونے لگا۔ اس فرقہ کے اصولوں کو سب سے پہلے تنظیم دینے والا عبداللہ بن میموں القدّاح تھا۔ گوئرڈ لکھتا ہے کہ اگرچہ فرقہ اسماعیلیہ شیعہ مذہب کی ایک شاخ تھی تاہم عبداللہ کے بعد دونوں میں اس قدر وسیع خلیج حائل ہوگئی کہ بالآخر شیعہ لوگ اسماعیلیوں کو ملحد (HERETIC) کہنے لگے۔ اسماعیلیہ۔ سبعی اور ملاحدہ کے علاوہ اس فرقہ کے اور بھی کئی نام ہیں۔ باطنی (ESOTERICTHE) فاطمی (THE FATIMID) جنہوں نے سنہ ۷۴-۸۷۳ء میں شمالی افریقہ اور مصر میں اپنی خلافت قائم کی جو سنہ ۱۱۷۱ء میں غازی صلاح الدین کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ تعلیمی (THE DOCTRINAIRE) اور قرامطی (THE

CARMATHIANS) حسن بن صباح کی تبلیغ کے بعد اس فرقے کا نام حشیشی (THE HEMPEATERS) بھی پڑ گیا۔

فرقۂ فاطمی نے مصر اور شام میں بہت مظالم توڑے لیکن گو کُرد اور ناصر خسرو بحیثیت مجموعی ان کی سلطنت کو سراہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں، جنوری ۹۳۰ء میں فرقہ قرامطہ کے سردار ابوطاہر نے تیس ہزار مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور مکہ شریف کو حجرالاسود (THE BLACK STONE) اور کئی دوسری مقدس یادگاروں سے محروم کر دیا۔

اسماعیلیوں کے عقیدے کے مطابق خداوند تعالیٰ کی ذات اور انسان کے درمیان صدور خمسہ (THE FIVE PRINCIPLES OF EMANATION) حائل ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔

عقل کل (THE UNIVERSAL REASON)
رُوح کل (THE UNIVERSAL SOUL)
ہیولیٰ (PRIMAL MATTER)
مکان (PLEROMA OR SPACE)
اور زمان (KENOMA OR TIME)

گویا صدور خمسہ، خدا اور انسان مل کر وجود کے سات درجے ہوئے۔

سوال: "تحریکِ اسماعیلیہ درحقیقت ایک سیاسی تحریک تھی

ناکہ مذہبی" اس قول کی وضاحت کیجیے۔

تحریک اسماعیلیہ

جواب: بظاہر تو اسماعیلیوں کی تحریک مذہبی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں سیاسیات مکمل طور پہ مذہب کو پس پشت ڈال رہی ہے۔ ویسے بھی تو اسلام کے مذہب اور سیاست میں کوئی ایسی نمایاں حدّ فاصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام کی اشاعت محض مشنریوں یعنی داعیان اسلام یا مبلغین کے پرچار سے نہیں ہوتی بلکہ غازیان قوم ہاتھ میں تلوار لے کر اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ سیاسی اقتدار جمانے کے لیے بھی خون بہانے میں دریغ نہیں رکھتے۔

عبداللہ بن میمون القداح ہی کو لیجیے۔ اس نے اپنے آپ کو مہدی ظاہر کر کے ابو محمد عبید اللہ نام رکھ لیا اور شمالی افریقہ سے ان لوگوں کی مدد سے جو اسماعیلی عقائد پر ایمان رکھتے تھے۔ خاندان اغلبد کا صفایا کر دیا اور مہدیہ کا شہر بسا کر فاطمی سلطنت قایم کر لی۔ سنہ ۹۶۹ء میں خاندان اخشید سے مصر چھین لیا اور دسویں صدی عیسوی کے آخر میں شام کے ایک بہت بڑے حصّے کو حلقۂ اقتدار میں لایا گیا۔ اسماعیلیوں کے چودہ خلیفے سنہ ۱۱۷۱ء تک اس وسیع سلطنت پر حکمران رہے۔

سنہ ۸۹۷ء کے لگ بھگ فرقہ قرامطہ نے ہتھیار سنبھالے

میسوپوٹامیہ، خوزستان، بحرین، یمن اور شام میں اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے داعیوں ذکرویہ اور الجنابی کی زیر سرکردگی بہت سے علاقوں پر تسلط جمالیا۔ ۹۰۰ء میں بصرہ کے سامنے خلیفہ وقت، کے لشکر کو تہس نہس کر دیا گیا۔ ایک سال بعد صاحب الناقہ اور صاحب الخال نے شام کو دمشق کے دروازوں تک دبالیا۔ ۹۲۴ء میں ابوطاہر الجنابی نے بصرہ اور کوفہ کو غارت و پامال کیا۔ ۹۳۰ء میں مکہ شریف پر آفت نازل کی۔

ان تمام فتوحات اور لشکر آرائیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ اسماعیلیہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ یا یوں سمجھئے کہ ان کے عقائد کی اشاعت ہی سیاسی اقتدار کا تقاضا کرتی تھی۔ حسن بن صباح نے بھی اپنی سیاسی زندگی کا آغاز قلعہ الموت اور دوسرے اہم فوجی ٹھکانوں پر قبضہ جما لینے سے کیا۔ اس کی تحریک کی خصوصیت تھی "مظالم آرائی اور تشدد پسندی" یہی وجہ تھی کہ ایک مدت مدید تک اس کا نام لوگوں کے دل دہلاتا رہا۔ حسن بن صباح نے اپنے لشکریوں میں ایک غیر معمولی جوش اور موت سے بے اعتنائی پیدا کرنے کے لئے انہیں حشیش (بھنگ) کا چسکا لگا دیا تھا۔ اسی لئے یہ لوگ حشیشی کہلاتے ہیں۔ ان امور واقعہ سے صاف روشن ہے کہ حسن بن صباح کا مقصد سیاسی تھا نہ کہ مذہبی۔

سوال: "سفرنامہ" اور اس کے مصنف ناصر خسرو پر مفصل نوٹ لکھئے۔

حکیم ناصر خسرو علوی

جواب: ابومعین ناصر بن خسرو ایران کا ایک عظیم المرتبت، مفکر اور اخلاقی شاعر گذرا ہے۔ وہ ۳۹۴ھ میں قبادیان (علاقہ بلخ) میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا پیشہ زمینداری تھا۔ لیکن اس نے اوائل عمر میں علوم متداولہ کا اچھا خاصہ مطالعہ کیا اور تحصیل علوم سے فارغ ہو گیا۔ ناصر خسرو کی عمر کے پہلے چالیس سال کی تاریخ بالکل تاریک اور مبہم ہے۔ تاہم اس کے دیوان اور ۷۶ ویں قصیدے میں کیے گئے اشاروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شیعہ مذہب پر اعتقاد رکھتا تھا۔ اور اپنے عقاید پر بہت ثابت قدم تھا۔ علم طبعیات کی تمام شاخوں میں اسے کافی دسترس حاصل تھی۔ طب، ریاضی، نجوم، فلسفہ اور قرآن میں ایک خاص ملکہ پایا تھا۔ عربی، ترکی اور یونانی کے علاوہ اس نے غالباً عبرانی زبان میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ ابتدائے عمر میں وہ شراب پینے کا عادی بھی رہا لیکن سرکاری ملازمت کرنے کے وقت بھی وہ اس عادت میں گرفتار تھا۔ ان دنوں خراسان میں سلجوقیوں کی عملداری کا آغاز تھا اور مرو خراسان کا پایۂ سلطنت تھا۔ ۴۳۷ھ میں اس کی زندگی میں اچانک ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔ خواب میں فرشتۂ رحمت کی ملامت سے متاثر ہو کر اس نے گناہوں سے توبہ کی اور حج کو روانہ ہوا۔ اس کی تصویر "سفرنامہ" میں پیش کی ہے۔ فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد ناصر خسرو مصر پہنچا۔

وہاں اس زمانہ میں المستنصر باللہ خلیفہ فاطمی حکمران تھا جو فرقۂ اسماعیلیہ کا پیشوا تھا۔ ناصر کو اس کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف نصیب ہوا۔ اور اس کی تعلیم و تبلیغ سے متاثر ہو کر ناصر نے اسماعیلی مذہب اختیار کیا۔ خلیفہ نے اسے حجتِ خراسان کا لقب عطا کر کے اس فرض پر مامور کیا کہ خراسان میں جا کر اسماعیلی عقائد کی تلقین و تبلیغ کرو۔ ناصر خسرو کو سفر میں کوئی سات برس کا عرصہ لگا اور اس دوران میں اس نے چار مرتبہ حج کیا۔ آخر عراق اور یمن سے ہوتا ہوا ۴۴۴ھ میں اپنے وطن کو واپس آیا۔

بلخ میں مقیم ہو کر ناصر نے اسماعیلی تبلیغ کا کام شروع کیا۔ لیکن لوگوں کی شدید مخالفت اور سخت گیری کی وجہ سے اس کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ پہلے وہ مازندران گیا۔ وہاں بھی امن نصیب نہ ہو سکا۔ یہ واقعہ "زاد المسافرین" کی تاریخ تصنیف یعنی ۴۵۳ھ (۱۰۶۱ء) سے پہلے کا ہے۔ ۴۵۶ھ میں وہ یمگان (علاقہ بدخشان) میں پہنچا اور وہاں مقیم ہو گیا۔ یمگان میں اس نے اپنی زندگی کے آخری تیس سال درویشی کی حالت میں بسر کئے۔ یہاں اس نے بہت سے لوگ مرید کرائے جن کی اولاد اب بھی ایران میں خال خال نظر آتی ہے اسی فرقے کا نام ہے ناصریہ۔ ناصر خسرو نے اپنی تمام کتابیں یمگان میں ہی لکھیں۔ بچاسی سال کی عمر پا کر وہ ۱۰۸۸ء میں فوت ہوا۔

ناصر خسرو کی تصنیفات

سفر نامہ، زاد المسافرین، وجہ دین، سعادت نامہ، روشنائی نامہ،

دیوان قصائد، خوان اخوان، اکسیر اعظم، کنز الحقائق۔ قانون اعظم، دستور اعظم، المستوفی، تفسیر قرآن، رسالہ طلسم وغیرہ وغیرہ۔

سفرنامہ

اس کتاب میں ناصر نے ہفت سالہ سیاحت (۱۰۴۵ء تا ۱۰۵۲ء) کا کل حال لکھا ہے۔ فارسی نثر کا یہ ایک نہایت دلفریب نمونہ ہے اس کا فرانسیسی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ناصر کی بہترین تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ واقعات و حقائق کی ہو بہو تصویر پیش کرنے میں کمال کا اظہار کیا ہے۔ ناصر نے اس میں مذہبی معلومات کو نہیں چھوا۔ اس وقت کے مقامی واقعات اور حالات کے متعلق مسالہ بہم پہنچانے کے اعتبار سے اس کتاب کو امتیازی وقعت حاصل ہے۔

صوفی شعرا

سوال: سلطان ابوسعید ابوالخیر کی شاعری پر تنقید و تبصرہ پیش کیجیے۔

جواب: ابوسعید ابوالخیر (۹۶۸ء تا ۱۰۴۹ء) فارسی زبان کے ان شاعروں کے پیشرو امام ہیں جن کے کلام میں تصوف اور معرفت کے گیت گائے گئے ہیں۔ مشرقی تنقید نگار مولانا روم کی پیروی میں حکیم سنائی کو پہلا اور خواجہ فریدالدین عطار کو دوسرا عظیم صوفی شاعر بیان کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اتیھے کی تحقیق کے

مطابق ابو سعید پہلا عظیم صوفی شاعر ہے جس نے فارسی شاعری کو تصوف سے روشناس کرایا۔ رباعی کو تصوف، معرفت، عشق حقیقی مذہب اور فلسفہ کی تجلیوں سے منور کرنیوالا وہی تھا۔ صوفیانہ شاعری کو اسی نے لطیف ترین حسن رنگ و بو کی چاشنی دی تھی۔ اینتھے کے علاوہ "اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابو سعید" "رسالہ حورائیہ" "ہفت اقلیم" "تاریخ گزیدہ" اور "نفحات الانس" وغیرہ کے قابل مصنفوں نے بھی ابو سعید کے حالات اور اس کی شاعری پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ لیکن اس کی زندگی ایسے خاص واقعات سے معمور نہیں کیونکہ وہ عالم آفاق کا نہیں بلکہ عالم ارواح کا رہنے والا تھا۔

ابو سعید کا فلسفہ نہایت وسیع ہے۔ وہ ہر حسین وجود میں محبوبِ حقیقی کی جھلک دیکھتا ہے۔ حقیقت اس کے لئے حسین ترین اور ازلی ہے۔ وہ دنیا میں رہتا ہوا بھی دنیا سے بالاتر ہے۔ عقاید مذہبی اور احکام شریعت کی اسے پروا نہیں۔ اس کی فراخدلی اور وسیع النظری قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لئے لامحدود راستے پیش کرتی ہے۔ بقول حافظ: ع

"ہر قبلہ، کہ باشد بہتر ز خود پرستی"

وہ خالق و مخلوق کے بھید بیان کرنے کے لئے دل کھول کر استعارات اور مجاز و کنایات کا سہارا لیتا ہے۔ بقول غالبؔ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۔ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اینتھے نے ابو سعید کی رباعیوں کو جمع کر کے ان کا ترجمہ کر دیا

ہے۔ اور یہ ترجمہ ۷۸-۱۸۷۵ء میں چھپ چکا ہے۔

ابوسعید کے متعلق مولانا شبلی کا ارشاد ملاحظہ ہو:۔

سب سے پہلے صوفیانہ خیالات حضرت ابوسعید ابوالخیر نے ادا کئے۔ وہ شیخ بوعلی سینا کے معاصر تھے۔ ان کی شیخ سے اکثر مراسلت رہتی تھی۔ شیخ مشکل مسائل ان سے دریافت کرتے تھے اور وہ جواب دیتے تھے۔ یہ مراسلات آج بھی موجود ہیں۔ وہ ابتدائی حال میں چودہ برس تک مجذوب رہے۔ سلوک میں آئے تب بھی جذب کا اثر باقی تھا۔ ۴۴۰ھ میں وفات پائی۔

کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

راہ تو بہر قدم کہ پویند خوش است
وصل تو بہر سبب کہ جویند خوش است
روئے تو بہر دیدہ کہ بینند نکو است
نامِ تو بہر زباں کہ گویند خوش است

غازی بره شهادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہید عشق فاضل تر ازوست
در روزِ قیامت ایں بداں کے ماند
کایں کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست

دل جز رہ عشق تو نپوید ہرگز
جز محنت و دردِ تو نجوید ہرگز
صحرائے دلم عشقِ تو شورستاں کرد
تا مہر کسے دگر نہ روید ہرگز

در کوئے خودم منزل و ماوی دادی
در بزم وصالِ خود مرا جا دادی
القصہ بصد کرشمہ و ناز مرا
عاشق کردی و سر بصحرا دادی

اے روئے تو مہر عالم آرائے ہمہ | وصلِ تو شب ورو ز تمنائے ہمہ
گر با دگران بہ زمنی وائے بمن | ور با ہمہ کس ہم چو منی وائے ہمہ

سوال: خواجہ عبد اللہ انصاری پر مختصر نوٹ لکھئے۔
جواب: سلطان ابو سعید ابو الخیر کے بعد خواجہ انصاری کو صوفیانہ شاعری کے لئے امتیاز حاصل ہے۔ آپ ناصر خسرو کے ہمعصر اور ہرات کے رہنے والے تھے۔ آپ کی تخلیقات نظم و نثر پر مشتمل ہیں جن میں تصوف۔ اخلاق۔ دینیات اور فلسفہ کی نمایاں جھلک ہے۔ خواجہ انصاری کی رباعیاں بہت مقبول ہیں۔ نثر میں آپ کا بہترین رسالہ مناجات ہے۔ جس میں دعاؤں کے علاوہ صوفیا کے لئے پند و موعظت کے چشمے بہائے گئے ہیں۔ مناجات کی تقریباً تمام نثر مسجع ہے اور اس قسم کی نثر کا قدیم ترین نمونہ ہے:-

۱۔ اگر بر آب روی خسے باشی، و اگر بہوا پری مگسے باشی، دل بدست آر تا کسے باشی۔

۲۔ آہستہ باید بود لیکن دانستہ باید بود۔ دانستہ باید بود۔ دانستہ بخرابات شدن رواست و نادانستہ بمناجات رفتن خطا ست۔

۳۔ بترس از کسے کہ نترسد و آنچہ کند از کس نپرسد۔

۴۔ دوست را از در بیرون تواں کرد۔ اما از دل نتواں کرد۔

۵۔ دی رفت و باز نیاید۔ فردا اعتماد را نشاید۔ ایں دم عزیز دار کہ نپاید۔

خواجہ کی رباعیات کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

پیوستہ دلم دم از رضائے تو زند — جان در تنِ من نفس برائے تو زند
گر بر سر خاکِ من گیاہے روید — از ہر برگے بوئے وفائے تو زند

سوال: حکیم سنائی کی زندگی اور شاعری پر تبصرہ قلم بند کیجئے۔

حکیم مجدود الدین عارف سنائی شرفائے غزنی کے خاندان سے تھے۔ علوم میں آپ کو مہارتِ کلّی حاصل تھی۔ یہ صاحبِ کمال شعر میں یگانۂ عصر تھا۔ اور دولت و جاہ سے فارغ البالی میں بسر کرتا تھا۔ سلسلۂ فقر میں اس طرح داخل ہوا کہ سلطان ابراہیم شاہ غزنوی نے ایک دفعہ سردیوں کے موسم میں ہندوستان کی طرف فوج کشی کی تیاری کی۔ سنائی نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ چاہتا تھا کہ دربار برخاست ہونے سے پہلے بادشاہ کی خدمت میں پہنچ جائے۔ ایک شراب خانے کے پاس سے گزرا سنا کہ ایک شرابی نشے کے سرور میں ساقی سے کہتا ہے۔ کہ "ایک جام سلطان ابراہیم کی اندھی آنکھوں کی یاد میں"۔ ساقی نے کہا "ایسے عادل بادشاہ کی شان میں کیا گستاخی کرتا ہے"۔ جواب دیا "ابھی غزنی کے انتظام سے عہدہ برآ نہیں ہوا اور سردیوں میں دوسرے ملک کا ارادہ کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی؟" پھر کہنے لگا "ایک اور جام حکیم سنائی کے اندھے پن کے صدقہ میں"۔ پھر ساقی نے کوسا "ایسے شاعر لطیف و خوش کلام کی برائی کیوں کرتا ہے"۔ مستان نے کہا: "شاعر کیا ہے۔ ایک احمق ہے۔ جھوٹے سچے واہیات جوڑ کر ایک احمق

کے آگے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے اور پڑھتا ہے"۔ حکیم سنائی پر ایک ایسی حالت طاری ہوگئی کہ گوشہ نشین ہوتے ہی بن آئی۔ اسی کے بعد یہ مردِ پاکباز ایسا خدا شناس ہوگیا کہ آج تک بڑے بڑے مولوی موحّد اس کے معتقد ہیں۔ امام غزالی ان کے مرید ہیں۔ مولانا روم اپنی اتنی عدیم النظیر عظمت کے باوجود فرماتے ہیں:۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او   ما از پے سنائی و عطار آمدیم

مولانا جامی فرماتے ہیں کہ حکیم سنائی کا بہترین شاہکار یعنی حدیقۃ الحقیقۃ ان کی موت (۱۱۳۱ء) سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے وجود میں آیا۔ سنائی کی کلیات میں سات مثنویاں اور ایک دیوان شامل ہیں۔ دیوان میں قصیدے۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ غزلیات اور رباعیاں ہیں۔ حدیقۃ الحقیقت اس کی بہترین اور مقبول ترین مثنوی ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اخلاق اور حکمت عملی سے بھری ہوئی ایسی مثنوی نے خواجہ فرید الدین عطّار کی مثنوی منطق الطیر اور مثنوی مولانا روم کے لئے میدان صاف کر دیا۔

حدیقۃ الحقیقت میں وحدت ایزدی۔ عقل۔ معرفت۔ فلسفہ ناپائداری حیات۔ عشق حقیقی اور تصوف وغیرہ کے متعلق بہت سے مسائل کو ایک خاص انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

جناب شبلی نعمانی نے حکیم سنائی کے کلام کی جو جو خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ تشبیب اور قصائد میں انھوں نے اپنے تمام معاصرین کی

طرح کوئی جدت پیدا نہیں کی لیکن پختگی۔ برجستگی اور صفائی میں ان کا کلام تمام معاصرین سے ممتاز ہے اور قدما میں بھی فرخی کے سوا اس خصوصیت میں کوئی ان کا ہمسر نہیں۔

۲۔ حکیم سنائی پہلے شخص ہیں جنہوں نے شاعری کو تصوف کے حقیقی مسائل و معارف سے روشناس کیا۔ اس سے پہلے حضرت ابوسعید ابوالخیر کی چند رباعیاں تصوف میں پائی جاتی ہیں لیکن ان میں صرف جوشِ عشق کو پُرزور طریقہ سے ادا کیا ہے۔ تصوف کے مسائل، اسرار و معارف نہیں۔ بخلاف اس کے سنائی کی تصنیفات تصوف کی مستقل تصانیف ہیں۔

۳۔ قدما کی شاعری اگرچہ نیچرل شاعری تھی لیکن طرزِ ادا شاعرانہ نہ تھا۔ جس بات کو کہنا چاہتے تھے صاف۔ بے تکلف۔ سیدھے سادے طور پر کہہ دیتے تھے معمولی بات کو انوکھی طرز میں ادا کرنا یا ایک معمولی واقعہ سے منطقیانہ استدلال پیدا کرنا متوسطین اور متاخرین کا جوہر ہے۔ لیکن اس جوہر کے موجد حکیم سنائی ہیں۔

۴۔ اخلاقی شاعری کی بنیاد بھی حکیم سنائی نے قایم کی۔

۵۔ جوش اور سرمستی جو حقیقی شاعری ہے۔ ایشیا کے شعرا میں بہت کم پائی جاتی ہے فارسی شعرا میں یہ نشہ مولانا روم پر چھایا ہوا ہے۔ خواجہ حافظ بھی کبھی کبھی بدمست ہو جاتے ہیں۔ لیکن حکیم سنائی ان سب کے پیشرو ہیں۔

۶۔ شاعری کے اجزا میں ایک بڑا ضروری جُز تشبیہ اور تمثیل ہے سعدی۔ صائب۔ کلیم وغیرہ تمثیل میں کمال رکھتے تھے۔ شاعری

کی اس صنف کے موجد بھی حکیم سنائی ہی ہیں۔ آپ کی تمثیلیں نادر اور موثر ہوتی ہیں۔

تقریباً تمام کے تمام مغربی تنقید نگار حدیقتہ الحقیقت کو اتنا پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ سنائی کی غزلیات کی لطافت رنگینی۔ جدت اور جوشِ بیان کے پیش نظر حدیقتہ الحقیقت سنائی کی تصنیف ہی معلوم نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے شبلی نعمانی فرماتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ حکیم سنائی کے قصائد اور مثنویاں تصوف سے لبریز ہیں۔ لیکن غزل میں تصوف کا نشہ نہیں۔ اور ہے تو کمزور ہے۔

حدیقہ الحقیقت ۱۸۸۶ء میں لکھنؤ کے مقام پر چھپ چکی ہے میجر سٹیفنسن نے اس مثنوی کے کچھ حصے کا تصحیح کے بعد ترجمہ کیا ہے اور یہ ترجمہ ۱۹۱۱ء میں بمقام کلکتہ چھپ چکا ہے۔

تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سنائی کے دیوان میں اشعار کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ تھی لیکن دیوان سنائی کے دستیاب نسخوں میں قریباً بارہ ہزار شعر موجود ہیں۔ یہ قصائد۔ غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ روانی۔ لطافت اور پختگی ان کی خصوصیات ہیں۔ سنائی کے کلام میں فن کی بجائے موضوع پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔

سنائی کے کلام سے ظاہر ہے کہ اس پر ایران کے عظیم المرتبہ شعرا منوچہری۔ فرخی اور مسعود سعد کا اثر نمایاں ہے۔ لیکن جب سنائی تصوف اور معرفت پر مائل ہو گئے تو سراسر طبع زاد

شعر کہنے لگے۔ اور ان کی عظمت کا مدار صوفیانہ کلام پر ہے جس میں وہ تزکیہ نفس۔ ترک تکبر اور ترکِ ظاہر و وضعداری کی تلقین کرتے ہیں۔

سنائی کی تعلیمات یا تصوف

جو علم خود شناسی کی طرف نہ لے جائے وہ سراسر جہل ہے۔ جاہ و ثروت کا غلام نہ بننا چاہیئے۔ سخاوت اور بخشش انسانیت کا جوہر ہے تصفیۂ باطن۔ خدمتِ خلق۔ ایثار اور ریاضت و عبادت سے ہی آدمیت حاصل ہوتی ہے۔ وضع داری اور مال و زر کی نمائش حقیقت سے دور لے جاتی ہے۔

ہوس و شہوت اور حرص و آز پر قابو پانا چاہیئے۔ اعتقادِ غیب ضروری ہے۔ انصاف پسندی۔ انسان دوستی اور راستی آدمیت کے جوہر ہیں۔ دیدارِ ذات کے لئے دل کی صفائی ضروری ہے۔ من و تو کی تمیز راہِ راست سے بھٹکاتی ہے۔ کسی جاندار کا دل دکھانا گناہ کبیرہ ہے۔ کسی کی حق تلفی شیطنت میں داخل ہے۔ ریاکاری اور مکر و فریب سے پرہیز لازم ہے۔ ایمان و عرفان سب سے بڑی دولت ہے۔ کسبِ دانش و حکمت انسان کا فرض ہے۔ یاوہ گوئی سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ عقل انسان کا سب سے بڑا رہنما ہے۔ دوسروں کے غم میں شریک ہونا اور مصائب میں آڑے آنا انسانیت کی دلیل ہے۔ شراب ایک لعنت ہے۔

تصنیفات: مثنویاں:۔ حدیقۃ الحقیقت۔ طریق التحقیق سیر العباد والی المعاد یا کنوز الرموز وغیرہ۔ کارنامہ۔ عشق نامہ۔

غریب نامہ۔ عفو نامہ۔
دیوان: قصائد۔ غزلیات۔ رباعیات۔
سنائی نے ۵۴۵ھ میں وفات پائی۔

سوال۔ بابا طاہر ہمدانی کی زندگی اور شاعری پر نوٹ قلم بند کیجئے۔

جواب: بابا طاہر کی زندگی کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہیں بعض صوفیہ کی کتابوں میں سے ان کے متعلق کچھ پتہ چلتا ہے وہ ہمدان کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے زندگی کا بیشتر حصّہ گمنامی اور گوشہ نشینی میں گذارا۔ وہ ایک صوفی درویش تھے۔ ریاضت اور عبادت میں مشغول رہتے۔ بڑے پرہیز گار اور متقی تھے۔ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں ان کو کافی شہرت حاصل تھی جیسا کہ سلجوقی بادشاہ طغرل کے ساتھ ۴۴۷ھ میں ان کی ملاقات سے ظاہر ہے شیخ طاہر ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں سوز و گداز نمایاں ہے۔ ان کے اشعار سے ان کا درد دل ٹپکتا ہے وہ عربی کے بھی عالم تھے۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے کچھ نثر کی کتابیں (رسالے) عربی اور فارسی زبان میں لکھے ہیں۔ وہ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوئے اور زندگی کے آخری دن ہمدان میں گذار کر وہیں انتقال کیا۔

شیخ صاحب کی شہرت کا انحصار زیادہ تر ان کی دوبیتیوں پر ہے۔ ان میں انہوں نے مختلف مضامین بیان کئے ہیں۔ کہیں اپنی

پریشان حالی۔ تنہائی اور بے نوائی کا ذکر کیا ہے اور کہیں وحدت، ذات ہجر و وصال اور طلبِ دیدار معنوی کا بیان ہے۔

ان کے موضوع اس طرح کے ہیں :۔

ہر جگہ خدا کا جلوہ نمایاں ہے ؎

کنشت و کعبہ و بت خانہ و دیر سرائے خالی از دلبر ندونندے (ندانند)

ناپائداری عالم ؎

یکے بر دیگرے نالون ذرین دشت بچشم خون فشاں آں لالہ کشت
ہمے گشت و ہمے گفت اے دریغا کہ باید کِشتن و ہشتن دریں دشت

وحدتِ عاشق و معشوق ؎

خرسم آناں کہ زتن جون (جان) ندونند ز جانون (جانان) جوں جانوں تدونند

نیکوں کی مظلومیت ؎

جرّہ بازے بُدم رفتم بہ نخچیر سیہ دستے زدہ بر بالِ مو تیر

محبّت ؎

دلی دیرم خریدارِ محبّت کز و گرمست بازارِ محبت
لباسے بافتم بر قامتِ دل ز پودِ محنت و تارِ محبت

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ باباؔ طاہر کی زبان قدیم فارسی اور پہلوی سے ملتی جلتی ہے جیسا کہ "ما" کی جگہ "مو"۔ جان کی جگہ جون نداند کی جگہ ندونند۔ شب کی جگہ شو۔ بینم کی جگہ وینم۔ گیم کی جگہ دتم۔ کند کی جگہ کرن وغیرہ۔

سوال: شیخ فریدالدین محمد عطّار کی زندگی اور اس کے

کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالئے۔

جواب: شیخ فریدالدین عطار سلجوقی دور کے ایک بلند پایہ صوفی شاعر ہیں۔ آپ کا تخلص عطار اس لئے تھا کہ آپ اوائلِ زندگی میں طبیب اور دوا فروش تھے۔ آپ کی ولادت چھٹی صدی ہجری کے وسط میں ہوئی۔ آپ نے بڑی لمبی عمر پائی۔ بعض محققین کی رائے کے مطابق آپ کی عمر سو سال سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن آپ کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی کم از کم ستر سال تھی۔ آپ کی بیشتر زندگی عارفوں کے حالات جاننے اور ان کے اسرارِ معرفت معلوم کرنے اور خود آتشِ عشق حقیقی میں جلنے میں گذری آپ آسمانِ عرفان پر ایک درخشندہ ستارہ بن کر چمکے اور صوفی شعرا میں بلند رتبہ حاصل کیا۔ بڑے بڑے صوفی شاعر آپ کو عارف شاعروں کا امام مانتے ہیں۔ مثلاً مولانا روم جو عالمِ عرفان کے تاجدار ہیں یوں فرماتے ہیں:

عطار روح بود و سنائی دو چشم او ما از پے سنائی و عطار آمدیم

پھر کہتے ہیں

من آں ملائے رومی ام کہ از نطقم شکر ریزد
ولیکن در سخن گفتن، غلامِ شیخ عطارم

اسی طرح محمود شبستری اور علاء الدولہ سمنانی جو خود صوفی بزرگ تھے عطار کے مداح تھے۔ عطار نہ صرف عارفِ کامل تھے بلکہ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ کتاب مجالس المومنین میں لکھا ہے کہ عطار کی تصانیف کی تعداد قرآنِ مجید کی سورتوں کی تعداد کے

برابر ہے۔ ان کا بیشتر کلام ناپید ہو چکا ہے۔ حسب ذیل مثنویاں ان کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں :۔

مصیبت نامہ۔ الٰہی نامہ۔ خسرو نامہ۔ پند نامہ۔ اسرار نامہ۔ شرح القلب۔ مختار نامہ۔ جواہر نامہ۔ وصیت نامہ۔ منطق الطیر۔ بلبل نامہ۔ حیدر نامہ۔ شتر نامہ۔ شاہنامہ۔ ان کے علاوہ ان کی غزلیات کا اور قصائد کا دیوان ہے جس میں دس ہزار کے لگ بھگ اشعار ہیں۔

عطار کی شہرت کا مدار ان کی مثنوی منطق الطیر۔ دیوان اور تذکرۃ الاولیاء پر ہے۔

آپ کے کلام میں بے حد روانی اور سلاست ہے۔ اور آپ کی شاعری کا سب سے بڑا وصف حسن تاثیر ہے یہاں تک کہ اہل فن نے آپ کے شعروں کو "تازیانۂ سلوک" کہا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی اپنے تذکرہ میں آپ کے کلام کا یوں جائزہ لیتا ہے۔

(عطار) شریعت و طریقت میں بے مثل تھا۔ شوق و نیاز اور سوز و گداز میں زمانے کی شمع تھا۔ معرفت کا دریا اور اعتقاد کا سمندر اس کی شاعری غیب کے واردات کا بیان ہے۔ اس نے اہل طریقت کی چار سو کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اور آخر میں درجۂ فنا حاصل کیا۔

بدیع الزماں خراسانی فرماتے ہیں :۔

ان کے کلام میں سب سے زیادہ مشہور منطق الطیر۔ اسرار نامہ اور تذکرۃ الاولیا ہیں جن میں صوفی بزرگوں کے حالات و کلمات بڑی سادہ اور سلیس زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ منطق الطیر میں شیخ

نے عرفان وسلوک کے مسائل استعارات۔ تمثیلات اور رمز وکنایہ کی امداد سے نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کئے ہیں۔ پندنامہ میں حکمت عملی اور اخلاق ونصائح کے دریا بہائے ہیں۔

خواجہ فریدالدین عطّار نے صوفیانہ شاعری کو نہایت وسیع کردیا۔ ان کی بدولت قصیدہ۔ رباعی۔ غزل۔ مثنوی تمام اصنافِ سخن تصوف سے مالامال ہوگئے۔ آپ کی مثنوی منطق الطیر کو بہت شہرت اور عزت حاصل ہے۔ خواجہ صاحب نے تصوف کے جو خیالات ادا کئے ہیں وہ حکیم سنائی سے زیادہ دقیق نہیں لیکن زبان اس قدر صاف ہے کہ اس وصف کا گویا ان پر خاتمہ ہے۔ ہر قسم کے خیالات اس بے تکلفی۔ روانی اور سادگی سے ادا کرتے ہیں کہ نثر میں بھی اس سے زیادہ صاف ادا نہیں ہوسکتے۔ وحدت وجود کا مسئلہ بادۂ تصوف کا نشہ ہے۔ خواجہ صاحب پر یہ نشہ ہے۔ خواجہ صاحب پر نشہ بہت چھایا ہوا ہے۔

شیخ عطّار کی قصیدہ گوئی کا نمایاں جوہر یہ ہے کہ بیہودہ مدح سرائی کے دھبّے سے پاک ہے۔ انہوں نے عمر بھر کسی حاکم یا بزرگ کی مدح نہیں کی جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں: ؏

"بعمرِ خویش مدح کس نگفتم"

آپ کے قصائد نعت اور پند وعرفان کے لئے وقف ہیں۔ ان کے قصائد تغزل سے عاری ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا موضوع یعنی عرفان وحقیقت متین وسنجیدہ ہے اور تغزل کی سبکی کو گوارا نہیں کرسکتا۔

عطار کی غزلوں میں بھی تصوّف اور معرفت کے خیالات غالب ہیں۔ در حقیقت عرفانی اور صوفیانہ غزلیات میں آپ یکتائے روزگار ہیں۔ اور ان کی اس استادی میں کوئی شاعر ان پر سبقت نہیں لے جا سکا۔ عظیم المرتبہ صوفی شاعر سنائی کا کلام یا غزل سوز و گداز اور وجد آفرینی کے اعتبار سے عطار کے پایہ کو نہیں پہنچتی۔ حافظ، سعدی، مولانا روم وغیرہ نے بھی عطار کی استادی کو تسلیم کیا اور ان کی پیروی کی۔

عطار کی وفات کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ سنہ ۶۱۸ھ میں بقید حیات تھے۔ ایک روایت کے مطابق سنہ ۶۲۷ھ میں وہ ایک مغل کے ہاتھوں شہید ہوئے، آپ کی قبر نیشاپور کے جنوب میں بمقام شادباخ موجود ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

روزہ حفظ دل است از خطرات — پس بود با مشاهده افطار
حج چه باشد؟ ز خود سفر کردن — به کجا؟ جانب هدایت کار
وحی چه بود؟ آنچه در دل تو — سر زند از نتائج اسرار

هر آن مستے که بشناسد سر از پا — ازاو دعوی مستی ناپسند است
اگر در عشق از عشقت خبر نیست — ترا این عشق عشقِ سودمند است

لبِ دریا همه کفر است دریا جمله دین داری *
ولیکن گوهر دریا ورائے کفر و دین باشد

سلجوقیہ دور کے دیگر نامور شعرا

سوال: ابو نصر علی بن احمد طوسی مشہور بہ اسدی کی شاعری پر تنقید و تبصرہ کیجئے۔

جواب: اسدی طوس کا رہنے والا تھا۔ اور پانچویں صدی ہجری کے دوران ہوا ہے۔

اس کی شہرت اس معرکتہ الآرا مثنوی کی بدولت ہے جس کا نام گرشاسپ نامہ ہے اور جو فردوسی کی پیروی میں لکھی گئی۔ یہ کتاب شاہنامہ فردوسی کی طرز اور اسی وزن میں لکھی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ گرشاسپ نامہ شاہنامہ کے حسن بیان۔ پختگیٔ فکر۔ فضیلت اور روانی سے محروم ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے اس نے ایسا مواد قدیم ایران سے متعلق بہم پہنچایا ہے جو شاہنامہ میں نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ گرشاسپ نامہ کی اپنی شاعرانہ خصوصیات بھی ہیں۔ اس میں استعارہ۔ مجاز اور کنایہ کی فراوانی ہے اور تاکید و تشبیہ میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً بعض اشعار میں بہت موزوں اور دلکش تشبیہات دی ہیں۔ جیسے کالی زمین کو آبنوس سے۔ کمان کو قوسِ قزح سے گل کو ترک سے۔ کلی کو موتی سے درخت کو طاؤس سے۔ آسمان کو ایوانِ مینا سے گرشاسپ نامہ زبان اور بیان کے اعتبار سے شاہنامہ کی نسبت موجودہ فارسی کے زیادہ قریب ہے۔ مولانا شبلی نے اُسے فردوسی کے بعد اقلیم سخن کا دوسرا تاجدار قرار دیا ہے۔ فارسی شاعری پر اسدی کا ایک بڑا

احسان یہ ہے کہ قصائد میں اس نے جدّت کا راستہ نکالا۔ اکثر قصیدوں میں اس نے مناظرے لکھے اور یہ اس کی خاص ایجاد ہے۔

جناب براؤن کا خیال ہے کہ ممکن ہے اسدی سے پہلے بھی کسی نے مناظرے نظم کئے ہوں لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اسدی نے اس صنف کو بہت ترقی دی۔ اسدی اگرچہ فردوسی کے دور میں شمار ہوتا ہے کم از کم اس کے دور سے قریب ہوا ہے لیکن تشبیہات اور مضمون بندی کے لحاظ سے وہ نظامی کے دوش بدوش ہے۔ اس کی تشبیہات اور مبالغات متوسطین بلکہ متاخرین کے انداز کی ہیں۔ واقعہ نگاری اور صورت حال کے منظر دکھانے میں اسے فردوسی سے کم مایہ نہیں کہا جا سکتا۔

گرشاسپ کی نصیحت اپنے بھتیجے نریمان کے نام ملاحظہ ہو:۔

نگر تا گنا ہست نباشد بسے	بیزداں زر بخت ننالد کسے
فرومایہ را دار دُور از برت	مکن آں کہ ننگی شود گوہرت
ازآں ترس کو از تو ترساں شود	دگر با تو ہزماں دگرساں شود
بفرمانِ ناداں مکن ہیچ کار	مشو نیز با پارسا پادسار
بکس بیشتی از اندازہ نیکی مکن	کہ گردد بد اندیش بشنو سخن

اسدی نے قصیدے بھی لکھے۔ ان میں اس کے یہ چار مناظرے بھی شامل ہیں:۔ مناظرہ شب و روز۔ مناظرہ نیزہ و کمان۔ مناظرہ آسمان و زمین اور مناظرہ منع و مسلم۔ اسدی نے ۴۶۵ھ میں وفات پائی۔

سوال: قطران تبریزی کی زندگی اور شاعری سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔

جواب: ابو منصور قطران سلجوقی عہد کے مشہور شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی ولادت تبریز میں ہوئی۔ یہیں اس نے نشو ونما اور تعلیم و تربیت پائی اور بڑے ہو کر شہرت حاصل کی۔ اس کی عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ عظیم المرتبہ شاعر ناصر خسرو جب تبریز سے گذرا اور قطران کے اشعار پڑھے تو انہیں بہت پسند کیا۔ قطران کے قصائد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آذربائجان کے سلاطین کی بہت مدح کی ہے۔ گنجہ کے حکمران ابوالحسن علی لشکری فضلون تبریز اور اس کے نواح کے اُمرا ابو منصور دہسودان اور ابو نصر دہسودان اور نخجوان اور اران کا حاکم ابودلف قطران کے ممدوحین تھے۔

قطران کی شہرت کا آغاز ابوالحسن لشکری کے زمانے میں ہوا۔ قطران کا وہ قصیدہ جو اس نے تبریز کے زلزلے پر لکھا نہایت پُر زور اور مؤثر ہے۔ تاریخ کی رو سے یہ زلزلہ ۴۳۴ھ میں رونما ہوا اور اس وقت خود شاعر وہاں موجود تھا۔ چونکہ شاعر نے چشم دید واقعات بیان کئے ہیں اس لئے اس قصیدے میں بڑی رقّت اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ قطران کا فارسی قصیدہ گو شعرا کی صفِ اوّل میں مقام ہے۔ اس کے قصیدے متانت اور صداقت کے عناصر سے مملو ہیں۔ اس کے کلام میں صنائع بدائع بھی پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر صنائع لفظی تجنیس ترصیع اور ذوقافتین

سے کام لیا ہے۔ واقعہ نگاری، منظر کشی اور فصول میں استاد تھا
کئی ایک شاعروں نے اس کی تعریف کی ہے۔
قطران کے قصیدوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ مدح
گوئی کے علاوہ اس نے طبعی حادثات اور تاریخی واقعات کے
بیان میں خاص دلچسپی لی ہے۔ دیوان کے علاوہ اس کی ایک
مثنوی قوس نامہ بھی ہے۔

سوال: مسعود سعد کی زندگی کے حالات سپرد قلم کیجیے
اور اس کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

جواب: مسعود سعد کے بزرگ ہمدان کے رہنے والے
تھے۔ اور غزنوی دور میں ہندوستان میں یہ خاندان آباد ہو گیا۔
مسعود کے باپ سعد اور دادا سلمان کا شمار اپنے زمانے کے علما
میں ہوتا تھا۔ سعد نے ساٹھ سال کے لگ بھگ غزنوی سلاطین
کی خدمت کی۔ مسعود نے بھی اپنے آپ کو ایام جوانی میں غزنوی
دربار سے وابستہ کیا۔ جب سلطان ابراہیم غزنوی کا بیٹا محمود
سیف الدولہ ۴۶۹ھ میں ہندوستان کا حکمران مقرر ہوا تو مسعود
بھی اس کی خدمت میں داخل ہو گیا۔ اکثر مسعود سیف الدولہ کی
مہمات کے دوران ہم رکاب رہتا اور بڑی عزت اور راحت کے
ساتھ زندگی بسر کرتا۔ لاہور میں اس کا ایک بڑا محل تھا سلطان
ابراہیم غزنوی اپنے بیٹے محمود سیف الدولہ سے ناراض ہو گیا۔
اور اس کی مع ندما کے گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ اور انہیں
قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ مسعود سعد کو بھی دشمنوں اور حاسدوں

کی غیبت پر گرفتار کر لیا گیا پہلے سات سال تک قلعہ دھک اور قلعہ سو میں اور پھر تین سال تک قلعہ نای میں محبوس رکھا گیا۔ مسعود نے بہرام نامی منجم سے اختر شناسی سیکھی۔ دس سال کی اسیری کے بعد سلطان ابراہیم نے اسے اپنے ایک درباری عمید الملک کی سفارش پر رہا کر دیا۔ مسعود سعد ہندوستان کو لوٹ آیا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کو ملا۔ امیر عمید الملک کی مدح میں ایک شکریہ کا قصیدہ لکھا۔

سلطان ابراہیم کے جانشین بیٹے سلطان محمود نے ہندوستان کی حکومت اپنے بیٹے امیر عضد الدولہ شیرزاد کے حوالے کی۔ ہندوستان کے اس نئے غزنوی حکمران کے شاعر مسعود سعد کے ساتھ بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ اس نے اس مظلوم شاعر کو جالندھر کی حکومت عطا کی۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد شاعر پھر غزنوی دربار کے عتاب کا نشانہ بن گیا۔ اور گرفتار کر لیا گیا۔ آٹھ سال تک قلعہ مرنج میں مقید رہا آخر ۵۰۰ھ میں سلطان محمود کے وزیر طاہر علی مشکانی کی سفارش پر اُسے آزادی نصیب ہوئی اور کچھ عرصہ وہ شاہی کتب خانے کی کتاب داری پر مامور رہا۔ لیکن اب اس کا دل بجھ گیا تھا۔ بڑھاپے نے غلبہ پا لیا۔ اور اس نے بادشاہوں کی خدمت سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

مسعود سعد ایک بلند پایہ قصیدہ گو شاعر ہے۔ خراسان کے شعرا مثلاً عنصری، منوچہری وغیرہ کے کلام کا اثر اس کی شاعری پر نمایاں ہے لیکن تقلید سے پاک ہے۔ اس کا اپنا اسلوب جوانی ہی

میں پختہ ہو چکا تھا۔ اور شاعری میں اس کا اپنا جداگانہ رنگ تھا۔
مسعودؔ کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پاکیزہ اور لطیف تغزل پایا جاتا ہے۔
مسعودؔ نثر نگاری میں بھی ماہر تھا۔ عربی اور ہندی سے خوب واقف تھا۔ عربی زبان میں بھی اس نے شعر کہے ہیں۔ مسعودؔ کا وہ کلام خاص طور پر موثر اور سوز و گداز سے معمور ہے جو اس نے قید کے دوران کہا۔ اس میں خاص زور اور رقّت نمایاں ہے۔ ایرانی ادب میں اس قسم کی شاعری بہت کم ہے۔ ان اشعار میں جذبات نگاری کا خوب حق ادا کیا گیا ہے۔ اپنی مصیبتوں کی بے نظیر عکاسی کی ہے۔ یہ شعر اس کے دردِ دل کے ترجمان ہیں۔ تخئیل یا مبالغہ کو ان میں مطلق دخل نہیں وطن سے دُوری۔ عزیزوں سے جدائی اور دوستوں سے علیحدگی نے اس کے دل کو بڑی ٹھیس لگائی تھی جو دردناک نالوں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔
مسعودؔ سعد کے قصیدوں کو دو حصّوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ اوّل وہ قصائد جو اس نے شکوہ کے طور پر سلاطین غزنی کی خدمت میں پیش کئے۔ ان میں ان کی مدح بھی کی اور اپنی مصیبتوں اور دشمنوں کی تہمتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ مدح مبالغہ یا باطل سے پاک ہے۔ چاپلوسی کا نام و نشان نہیں۔ حقائق کا بیان ہے۔ اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر طبعاً خوددار، متین اور حقیقت پسند تھا۔ عزّتِ نفس کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ دستِ سوال بڑھانے سے عار رکھتا تھا۔ اس کے دوسرے

قصیدے وہ ہیں جو اس نے وزرا اور امرا کی مدح میں لکھے ہیں۔ ان وزرا اور امرا نے اس کی مدد کی تھی۔ اس کی رہائی کی سفارش کی تھی۔ اس نیکی کے لئے شاعر ان کا شکر گذار ہے اور ان کی تعریف کے علاوہ اپنے ذاتی مصائب و آلام بیان کرتا ہے۔ قید کی تکلیفات کا دردناک پیرائے میں ذکر کرتا ہے۔ ماں باپ اور عیال و اطفال کی جدائی کا حال بھی ہے۔ اپنی بے گناہی اور حاسدوں کی تہمت تراشی کا بھی بیان ہے۔ پہلی قسم کے قصائد ذیل میں مذکور بادشاہوں کی مدح میں لکھے :-

سلطان ابراہیم غزنوی۔ سلطان محمود بن ابراہیم۔ شیرزاد بن ابراہیم۔ ملک ارسلان بن مسعود۔ بہرام شاہ بن مسعود۔ دوسری قسم کے قصائد مندرجہ ذیل امراء و وزرا کی مدح میں ہیں۔

ثقۃ الملک طاہر وزیر سلطان مسعود۔ ابوالقاسم خاص وغیرہ قید کی صعوبتوں کو مسعود سعد نے بڑی بردباری اور حوصلہ مندی کے ساتھ برداشت کیا اور قید کے دوران بھی تحصیل علم و دانش میں مصروف رہا۔ صبر و تسلیم سے کام لیا۔ اس کے قصائد کا موضوع شکوہ ضرور ہے لیکن یہ شکوہ متانت اور مردانگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بزدلی یا بے غیرتی کا مطلق اظہار نہیں کیا دل کے جذبات کا حقیقی بیان ہے۔ اپنی خودداری پر حرف نہیں آنے دیا۔ اس کی ہمت اور حوصلہ مندی دراصل اس کی جنگی مشاہدات کا نتیجہ تھی۔ وہ قصائد میں بزمیہ اور رزمیہ دونوں رنگ لاتا ہے۔

مسعود سعد کے تعلقات اس زمانے کے بڑے بڑے ایرانی شعرا کے ساتھ تھے۔ حکیم سنائی نے مسعود کا دیوان خود مرتب کیا تھا۔ ایک اور شاعر سید حسن غزنوی اپنا کلام اس کے پاس بھیجا کرتا تھا۔ ملک شاہ کا درباری شاعر رشید سمرقندی اپنا کلام اصلاح کے لئے ہندوستان میں مسعود سعد کے پاس بھیجتا تھا۔ ابوالفرج رونی بھی اس کے ساتھ شاعرانہ تعلقات رکھتا تھا۔ سلطان سنجر کا درباری شاعر ملک الشعرا معزی بھی مسعود کے کمال فن کی تعریف کرتا ہے:-

مسخر است سخن چوں پری سلیماں را شریف خاطر مسعود سعد سلماں را

خاقانی نے بھی اس کی استادی کو تسلیم کیا ہے۔ مسعود سعد نے ۵۱۵ھ میں وفات پائی۔

سوال: ابوالفتح عمر بن ابراہیم مشہور بہ خیام کی زندگی اور شاعری پر پوری روشنی ڈالئے۔

جواب: ملک الحکما شیخ عمر خیام نیشاپور میں پیدا ہوا۔ اس کی صحیح تاریخ ولادت کا علم نہیں لیکن اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ وہ گیارھویں صدی عیسوی کے شروع میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے آپ نے مختلف علوم وفنون کی تحصیل شروع کر دی۔ اس نے خراسان کے مختلف شہروں مثلاً بلخ۔ بخارا۔ طوس اور مرو کی سیاحت کی تھی۔ وہ بغداد بھی گیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق اس نے حج بھی کیا تھا۔ آپ کا شمار سلجوقی دور حکومت کے بڑے بڑے علما اور شعرا میں ہوتا ہے۔ اور اس کا تعلق عظیم

ہمعصر اشخاص کے ساتھ تھا۔ مثلاً غزالی اور خواجہ نظام الملک بھی اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سلطانی مجالس اور علمی و ادبی محافل میں اُسے صدر میں جگہ دی جاتی۔

حکیم عمر خیام کو نجوم۔ ہیئت اور حکمت میں بڑی دستگاہ تھی۔ سلجوقی بادشاہ ملک شاہ نے تقویم کی اصلاح کے لئے دوسرے جلیل القدر منجموں کے ساتھ عمر خیاؔم کو بھی مامور کیا۔ جب ملک شاہ کا بیٹا سنجر مرض آبلہ میں مبتلا ہوا تو خیاؔم نے ہی اس کا علاج کیا اور اسے صحت یاب کیا۔ حکمت اور دوسرے علوم میں وہ حجۃ الاسلام امام غزاؔلی کے سے بلند رتبہ علما و فقہا کے ساتھ بحث و مباحثہ کیا کرتا تھا۔

جب حکیم عمر خیاؔم طب۔ حکمت اور نجوم کے دقیق مسائل سے اُکتا گیا تو اس نے اپنی زندگی کی روش بدلی۔ اور ذہنی کوفت و تکان کو دُور کرنے اور تفریح طبع کی خاطر اس نے شاعری کی طرف رجوع کیا۔ اور رباعیات لکھنا شروع کیا۔ ان رباعیات میں اس نے فلسفہ تعیش (ایپیکورس) کا اظہار کیا۔ اور ہر حالت میں زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی تلقین کی ہے۔

حکیم عمر خیام اکثر باتوں میں الحکیم الوزیر الدستور شرف الملک ابوعلی الحسین بن عبداللہ بن سینا البخاری کی روش پر چلتے رہے لیکن طبیعت میں کچھ تنگی سی تھی۔ حافظہ بہت تیز پایا تھا۔ ریاضیات عربی لغات اور قرآن کریم کی تفسیر میں یہ طولےٰ رکھنے کے ساتھ ساتھ

آپ کو علم نجوم میں کامل دسترس حاصل تھی۔ یہاں تک کہ ایران میں آپ کو صاحبِ نجوم اوّل خیال کیا جاتا ہے اور معمولی شاعر بعد میں لیکن ایران کے باہر عمر خیّام کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہے۔ وہ بہت تھوڑے ایرانی شاعروں کو نصیب ہو سکی ہے۔ یورپ میں عمر خیّام کو رباعی لکھنے والوں کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ سلجوقی بادشاہ ملک شاہ آپ کی بہت عزّت کرتا تھا۔

رُباعیاتِ خیّام

عمر خیّام کی رباعیاں فلسفیانہ نکات اور عیش و عشرت کے مسئلوں سے بھری پڑی ہیں۔ ان رُباعیوں کا اسلوب حسن تاثیر تازگی اور لطافت اپنی مثال آپ ہیں۔ عبارت کے اعتبار سے یہ رباعیاں مختصر ہیں لیکن معانی و مطالب کا مخزن ہیں۔ وہ انسانی روح کو دنیا کی پستیوں اور ذلتوں مصیبتوں اور جھنجھٹوں سے بالاتر لے جاتا ہے اور مسرّت و راحت کی فضا میں اُڑنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ فطرت کے رموز اور اسرار سے منہ موڑ کر زندگی کی حقیقت پر زور دیتا ہے۔ وہ چند روزہ زندگی کو غنیمت سمجھنے اور اس سے پوری طرح لطف اٹھانے کی تاکید کرتا ہے۔

وہ ماضی کے مصائب کو بھول جانے اور مستقبل کے ممکنات سے بے نیاز ہو کر حال پر توجہ دینے کی تلقین کرتا ہے وہ رقص و سرود اور حسن و شباب کے مناظر کا مشتاق ہے۔ وہ شراب کی مستی میں آلام و آفاتِ عالم کو بھول جانا چاہتا ہے۔

خیام نے ریا کاروں اور نام نہاد زاہدوں کی بہت مٹی پلید کی بنائی ہے۔ صرف یہی نہیں۔ وہ تو خداوند تعالے کے ساتھ بھی جھڑپ لینے سے باز نہ آیا ؎

ابریق مے مرا شکستی ربّی ۔ بر من درِ عیش را بہ بستی ربّی
بر خاک بریختی مے لعل مرا ۔ خاکم بدہن کہ مست مستی ربّی

کہتے ہیں کہ اس گستاخی پر خداوند تعالیٰ نے اس کی گردن ٹیڑھی کر دی اس پر اس نے برجستہ کہا ؎

ناکردہ گناہ در جہاں کیست؟ بگو ۔ واں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست؟ بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی ۔ پس فرق میانِ من و تو چیست؟ بگو

انسان کی ناکامی۔ اس کے آلام و آفات۔ اس کی زندگی کی ناپائداری اور نام نہاد صوفیوں اور بزرگوں کی ریاکاری کے بیان کے بعد وہ انسان کی نجات کی تدابیر سوچتا ہے۔ اور مصائب کا مقابلہ کرنے اور صحیح طریق پر زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ بتاتا ہے۔ یہ ڈھنگ ہے عیش و عشرت کا، دنیا سے بے نیازی کا، ماضی کے رنج کو بھولنے اور مستقبل کے غم سے لاپرواہ ہونے اور حال کے دم کو غنیمت جاننے کا۔ زندگی کے چند لمحات میں زیادہ سے زیادہ لطف اُٹھانے کا۔ اور دل کی تمناؤں کو پورا کرنے کا، زندگی کے اوقات کی قدر کرنے کا ؎

روزے کہ گذشتہ است ازو یاد مکن ۔ فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
بر نامدہ و گذشتہ را بنیاد مکن ۔ حالی خوش باش و عمر برباد مکن

عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جو روانی شگفتگی اور نزاکت اس کی فلسفیانہ رُباعیوں میں ہے اور کسی شاعر کے کلام میں نام کو بھی نظر نہیں آتی۔ اگرچہ ایرانی شاعری کو سب سے پہلے رودکیؔ ہی نے ابیقیورس کے فلسفۂ تعیش سے روشناس کیا تھا۔ لیکن اس فلسفے کے بہترین ترجمان یعنی خواجہ حافظ شیرازی کے لئے میدان تیار کرنے والا عمر خیاؔم تھا۔ عمر خیاؔم کے خیالات میں حیرت انگیز طور پر موجودہ مغربی شعر و شاعری کی سی جدّت پائی جاتی ہے۔

خیاؔم نے جا بجا دقیق مسائل حیات و ممات کی تحقیقات کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ فلسفی شاعر کس لطیف پیرائے میں تواضع وانکساری کی تعلیم دیتا ہے ؎

در راہ چناں رَو کہ سلامت نہ کنند | با خلق چناں زی کہ قیامت نہ کنند
در مسجد اگر روی چناں رو کہ تُرا | در پیش نہ خوانند و امامت نہ کنند

خیاؔم نے اپنی زبان کو تمام عمر مدح سرائی کی آلائش سے پاک رکھا۔

خیاؔم کی اکثر رباعیوں میں اسلوب ادا اور مضمون کا فرق نظر آتا ہے بلکہ تضاد دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات بدلتے گئے۔ یا یہ ہوگا کہ دوسرے شعرا کی رباعیوں کو اس کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ مس کیڈل ۱۸۸۲ء میں لکھتی ہیں کہ کوئی بارہ سو کے قریب رباعیاں خیاؔم کے نام سے مشہور ہیں جن میں سے اڑھائی سو اور تین سو کے درمیان واقعی خیام کی رُباعیاں ہیں۔

خیام نے عربی زبان میں ایک رسالہ "جبر و مقابلہ" اور ایک رسالہ "اقلیدس کی بعض تعریفات پر لکھا۔ زیج ملک شاہی کی تصنیف میں اس کا کچھ حصہ ہے۔ خیام نے ۱۱۱۵ء اور ۱۱۳۵ء کے درمیان انتقال کیا (از روئے چہار مقالہ)

سوال: امیر معزی کی زندگی اور اس کے کلام پر روشنی ڈالیے۔

جواب: محمد بن عبدالملک معروف بہ معزی نیشاپور میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ عبدالملک برہانی سلجوقی بادشاہ الپ ارسلان کا درباری شاعر تھا مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیٹے محمد کی سفارش کے طور پر ایک قطعہ ملک شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس قطعہ کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

بگذاشتم این خدمتِ دیرینہ بفرزند | واندر سفر از علّت دہ روزہ بمردم
رفتم من و فرزند من آمد خلفِ صدق | او را بخدا و بخداوند سپردم

شروع شروع میں محمد بن عبدالملک کو سلطان ملک شاہ کا تقرب حاصل نہ ہوا۔ البتہ دربار میں رسائی ہو گئی۔ ایک روز ماہ رمضان کے دیدار کے لئے سلطان باہر نکلا۔ اور سب مصاحبین سے پہلے چاند کو دیکھ لیا۔ اس موقع پر معزی بھی موجود تھا۔ اس نے فی البدیہہ یہ رباعی بادشاہ کی نذر کی ؎

اے ماہ چو ابروانِ یاری گوئی | یعنی چو کمان شہریاری گوئی
نعلی زدہ از زرِ عیاری گوئی | در گوش سپہر گوشواری گوئی

سلطان اس رباعی سے بہت خوش ہوا اور شاعر کو انعام میں ایک گھوڑا عطا کیا۔

اس کے بعد شاعر کو ترقی کا موقع ملا اور دربار میں اس کو تقرب حاصل ہو گیا۔ سلطان اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے شاعر کو اپنا تخلص اپنے لقب (معزالدین) پر اختیار کرنے کا حکم دیا۔ اب معزیؔ کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ صاحب شان و شوکت و دولت و ثروت ہوا۔ سلطان سنجر کا ملک الشعرا بن گیا۔ اب اس کی عزت و حشمت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی۔

معزیؔ کے قصائد سے سلجوقی خاندان کے تاریخی واقعات کا بھی علم ہوتا ہے۔ خاص طور پر سنہ ۴۶۵ھ (سال تخت نشینی ملک شاہ) سے سنہ ۵۰۲ھ (سال وفات ملک شاہ) تک۔ ان سے سلطان ملک شاہ اور سلطان سنجر کے اخلاق و خصائل۔ اور ان کی لڑائیوں اور صلحناموں سے متعلق بھی واقفیت بہم پہنچتی ہے۔ ان سلاطین کے امرا اور وزرا خواجہ نظام الملک۔ اس کے بیٹے وغیرہ سے متعلق کافی تفصیلات حاصل ہوتی ہیں۔

شاعر کی موت کا واقعہ دردناک ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس بادشاہ (سلطان سنجر) کا وہ منظور نظر تھا۔ اسی کے ہاتھوں اس کی موت ہوئی۔ ایک روز سلطان سنجر تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ سلطان کی غلطی یا شاعر کی بدبختی سے ایک تیر معزیؔ کو جا لگا جس سے وہ سخت زخمی ہوا۔ اور کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد جاں بحق ہوا۔ یہ حادثہ سنہ ۵۴۲ھ میں رونما ہوا۔ حکیم سنائی نے اس کی وفات پر ایک پُر درد مرثیہ لکھا۔

کلام پر تنقید معزّی ایران کے مشاہیر شعر و سخن میں سے ہوا ہے اس کے بلند پایہ قصیدے بلحاظِ طرز اور موضوع عنصری اور فرخی کے قصائد سے ملتے جلتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ مشابہت بہت ہی نمایاں ہے عنصری اور فرخی کے کلام کے رنگ اور مضامین کے پرتو کی جھلک معزی کے اشعار میں صاف صاف نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ عسجدی کے کلام کا اثر بھی معزی کی شاعری پر پڑا ہے۔

معزی قصیدہ گوئی کا استاد تھا۔ اس نے بڑے بڑے قصیدہ گو شعرا کی روایات کو برقرار رکھا۔ اس کے کلام میں تشبیہ۔ مجاز اور استعارے کی صنائع موجود ہیں۔ اس نے غزلیں بھی کہی ہیں اور قطعات و رباعیات اور مسمط بھی۔ البتہ اس میں ایک عیب ہے۔ وہ اپنے ممدوحین کی تعریف میں بے حد مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ اس کے مرثیے بھی بلند درجہ کے ہیں۔ قصیدوں میں تصوف اور عرفان کے مضامین ہیں۔

نمونۂ کلام

نتواں گذشت از مژۂ کاتجا بیفتد مشکلے
از قصۂ سنگین دلے نوشیں لب سیمیں ذقن!

یارے برخ چوں ارغواں حورے بہ تن چوں پرنیاں
سروے بلند چوں ناروان ماہے بقد چوں نارون

میانِ بیم و امید اندرم کہ ہست مرا | بروز بیم فراق و بہ شب امیدِ وصال
وصال آبِ زلال است این چہ است حرام | فراق بادۂ تلخ است پس چرا ست حلال
کنوں کنارم اگر ز حادثاتِ فلک | ز دیدہ خالی دار ز خونِ دیدہ مالا مال

سوال۔ انوری کی زندگی اور شاعری کی خصوصیات پر پوری پوری روشنی ڈالیے۔

جواب: اوحدالدین علی بن محمد متخلص بہ انوری خراسان میں علاقہ خاوران کے گاؤں بدنہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ منصوریہ میں حاصل کی۔ جہاں اس نے اپنے دن بڑی تنگ دستی کی حالت میں بسر کئے۔ انوری نے اپنا سب سے پہلا مشہور قصیدہ انہی دنوں کے کچھ عرصہ بعد لکھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

گر دل و دست بحر و کان باشد | دل و دست خدا یگاں باشد

اس پر عظیم القدر سلجوقی بادشاہ سنجر (سنہ ۱۱۱۹ء تا ۱۱۵۷ء) اتنا خوش ہوا کہ انوری کو اپنے ساتھ مرو لے گیا۔ اگرچہ انوری سنجر کے بعد کوئی تیس سال تک زندہ رہا لیکن اس کی شہرت کا زمانہ سنجر کا عہد حکومت ہی ہے۔ اور اس کے بیشتر قصیدے اسی سلطان کی تعریف میں لکھے گئے۔ انوری کے قصیدوں میں خاقانی کی شوکتِ الفاظ، بلندیٔ تخیل اور مطلب کی گہرائی نہیں ہے لیکن دنیا نے اسے قصیدہ گوئی کا پیغمبر تسلیم کیا ہے۔

در شعر سہ تن پیغمبران اند | ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را | فردوسی و انوری و سعدی

مولانا شبلی فرماتے کہ انوری کی پیغمبری کے ثبوت میں

کوئی معجزہ نہیں۔ البتہ وہ اپنے معاصرین سے بعض باتوں میں امتیاز خصوصی رکھتا ہے۔ انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو کی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا۔

انوری کی تاریخ پیدائش کا مکمل پتہ نہیں تاہم یہ ضرور ہے کہ وہ گیارھویں صدی عیسوی کی آخری چوتھائی میں پیدا ہوا۔ اس نے دیگر علوم متداولہ کی تحصیل کے علاوہ، فلسفہ۔ نجوم۔ ہیئت منطق۔ موسیقی اور ریاضی میں کافی دسترس پائی تھی جس کا اس نے خود ذکر کیا ہے ؎

منطق و موسیقی و ہیئت بدانم اندکی   راستی باید بگویم با نصیبے وافرم
وز الٰہی آنچہ تصدیقش کند عقلِ صریح   گر تو تصدیقش کنی در شرح و تنظیم باہرم
نیستم بیگانہ از اعمال و احکامِ نجوم   ور ہمے باور نداری رنجہ شو من حاضرم

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انوری کی شہرت اس کی شاعری کی وجہ سے ہے۔ اور یہ کہ اس کے اپنے قول کے مطابق شاعری اس کے معاملات میں ایک ادنیٰ سی چیز تھی۔ اگرچہ انوری کو مجبوراً شاعری اختیار کرنی پڑی تاہم وہ اس فن کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور ابو علی سینا کی مانند ایک آزاد زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ وہ سچے دل سے بادشاہوں یا امرا کی تعریف نہ کرتا تھا ؎

غزل و مدح و ہجا ہر سہ ازاں می گفتم   کہ مرا شہوت و حرص و غضبے بود بہم

علامہ مرزا محمد قزوینی کی رائے میں انوری کی شہرت کا دار و مدار زیادہ تر ان قصیدوں پر ہے جو کسی کی مدح میں نہیں لکھے گئے۔ اس

نے غزلیں، رباعیات اور قطعات وغیرہ بھی لکھے۔ لیکن ان کا پایہ قصیدوں تک نہیں پہنچتا۔ اگرچہ بعض اوقات وہ نہایت لطیف خیالات اچھوتی ادا سے بیان کر جاتا ہے ؎

بوسہ می خواہم ازاں لب، توچہ فرمائی   گر صواب است بگو ورنہ خطائے بکنم

انوری کا ایک شعر صنعتِ عکس کا بہترین نمونہ ہے ؎

دلے دارم ہمیشہ ہمدمِ غم   غمے دارم ہمیشہ ہمدمِ دل

انوری کی برسوں یہ آرزو رہی کہ وہ سنجر کے درباری شعرا کے زمرے میں شامل ہو سکے۔ اس آرزو کی تحریک دولت شاہ سمرقندی کے بیان کے مطابق سلطان سنجر کے ملک الشعرا امیر معزی کی شان و شوکت دیکھ کر ہوئی۔ انوری نے خود اس خواہش کا ذکر کیا ہے؟

خسروا! بندہ را چو دہ سال است   کہ ہمی آرزوئے آں باشد

کز ندیمانِ مجلسِ او نہ شود   از مقیمانِ آستاں باشد

بالآخر جب اس کی یہ تمنا بر آئی تو سلطان کے دربار میں تقرب خاص حاصل ہو گیا۔ سنجر کے علاوہ انوری نے متعدد وزرا، امرا، شعرا، صدور اور قضاۃ وغیرہ کی مدح کہی جن میں صدر الدین محمد بن فخر الملک اور ابو الفتح ناصر الدین طاہر بن فخر الملک بھی شامل ہیں موخر الذکر کی تعریف کے لئے انوری کے بیشتر قصائد مخصوص ہیں۔

خزانۂ عامرہ میں مذکور ہے کہ ۵۸۱ھ میں انوری نے پیشین گوئی کی کہ اس سال فلاں تاریخ کو سبعہ سیارہ کا قران برج میزان میں ہوگا جس کی وجہ سے اس قدر سخت طوفان آئے گا کہ عمارتیں زیر و زبر ہو جائیں گی۔ لوگ اس تاریخ کو ڈر کے مارے تہ خانوں میں

چھپے رہے۔ لیکن اس دن طوفان کی بجائے ہوا اس قدر ساکن رہی کہ پتہ تک بھی نہ ہلا۔ یہ بات انوری کی ذلت اور ملامت کا موجب بنی یہاں تک کہ اُسے جان بچانے کے لئے نیشاپور اور بعد میں بلخ کی جانب بھاگنا پڑا۔ بلخ میں بھی اُسے چین نصیب نہ ہوسکا سوء اتفاق سے ایک اور واقعہ پیش آیا جس سے اس کی مزید تذلیل و تخفیف ہوئی۔ سوزنی یا فتوحی نے بلخ کی ہجو میں ایک نظم "خرنامہ" کے عنوان سے لکھی اور شرارت سے مقطع میں انوری کا نام جڑ دیا۔ اس پر بلخ کے لوگوں نے ستم زدہ انوری کی بہت بری گت بنائی اور عورتوں کا لباس پہنا کر گدھے پر سوار کرایا۔ اگر شہر کے بعض معزز حضرات جن میں قاضی حمید الدین صاحب "مقامات حمیدی" بھی شامل تھے مدد کو نہ آتے تو اہلِ بلخ انوری کی جان لینے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ انوری نے ان لوگوں کے شکریے میں وہ مشہور قصیدہ نظم کیا جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخ چنبری
وز نفاقِ تیر و قصدِ ماہ کیدِ مشتری
آسماں در کشتیٔ عمرم کند دائم دو کار
گاہِ شادی بادبانی وقتِ اندہ لنگری

جب سنہ ۱۱۴۷ء میں سنجر نے آتسز خوارزم شاہ کے خلاف لشکر کشی کی تو انوری اس کے ہمراہ تھا۔ جب سنہ ۱۱۵۳ء میں سنجر غز ترکوں کے ہاتھ گرفتار ہوگیا تو ملکہ ترکان خاتون نے انوری کو شہزادہ سمرقند محمود بن ارسلان خاں محمد بن سلیمان کے دربار میں صلح

کا وفد لے جانے پر مامور کیا۔ اس سفر کے دوران میں اس نے اپنی ایک بہترین نظم لکھی ؎

بر سمرقند اگر بگذری اے بادِ سحر | نامۂ اہلِ خراساں بہ بر خاقاں بر
نامۂ مطلع آں رنجِ تن و آفتِ جاں | نامۂ مقطعِ آں دردِ دل و سوزِ جگر
ریش گردد ممر صوت ازو گاہِ سماع | کور شود مردمکِ دیدہ ازو گاہِ نظر
نکند خطبہ بہ ہر شہر بنامِ غزاں آں کہ | در خراسان خطیب است کنوں نے منبر

یہ قصیدہ "اشک ہائے خراسان" کے نام سے مشہور ہے اور ۱۱۵۵ء کے لگ بھگ لکھا گیا اس میں انوری نے ترکوں کے مظالم اور خراسان کی تباہی کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ جذبات بالکل فطری و حقیقی ہیں۔ زبان رواں و صاف، طرزِ ادا پُر جوش اور دلکش، زبان، خیالات اور اسلوب کی ان گوناگوں خوبیوں کے علاوہ جو سب سے زیادہ قابل التفات چیز ہے وہ ہے قصیدے کی تاریخی دلچسپی۔ انوری نے نہایت سنجیدہ اور دردناک پیرائے میں ایسے تاریخی واقعات کو نظم کیا ہے جو بصورتِ دیگر ہم تک ذرا مشکل سے ہی پہنچ سکتے۔ یا اس طرح زندہ تصویروں کی مانند ہمارے سامنے نہ آسکتے۔ دولت شاہ سمرقندی، شیر خاں لودھی، لطف علی بیگ، امین احمد رازی اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے "اشک ہائے خراسان" کو فارسی ادبیات کے بہترین شاہکاروں میں شمار کیا ہے مغربی نقادوں نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ قصیدہ کل ۷۲ اشعار پر مشتمل ہے۔ خیالات، طرزِ بیان، جذبات اور بحر میں ایک عجیب مطابقت ہے۔

انوری کے کلام میں اس بات کا جا بجا ثبوت ملتا ہے کہ اسے مدح گوئی سے حد درجہ کی نفرت تھی۔ مجبوری قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ بیچارے کو چار و ناچار ہر کس و ناکس کے گن گانے پڑتے چنانچہ اس نے خود لکھا ہے ؎

نشاید بہر آداب ندیمی — دگر بر جان و دل زحمت نہادن
زباں کردن بنظم و نثر جاری — زخاطر نکتہائے بکر زادن
کہ باز آید ہمہ کار ندیمی — بسیلی خوردن و دشنام دادن

یہی وجہ ہے کہ ایک مدت شاعری میں مشغول رہنے کے بعد اس نے اس پیشے سے توبہ کرلی۔ اور باقی عمر گوشہ نشینی کی حالت میں بسر کی۔ مشہور ہے کہ علاء الدین غوری (۱۱۵۰ء تا ۱۱۶۱ء) نے اُسے اپنے دربار میں بلایا۔ انوری کو کسی طرح سے یہ بھید معلوم ہوگیا کہ غوری کا منشا اسے چند طنزیہ اشارات کی پاداش میں سزا دینا تھا۔ چنانچہ انوری نے ایک نظم لکھ کر معذرت پیش کی۔ اس نظم میں اس نے اپنی قناعت اور عزلت گزینی کا ذکر کرتے ہوئے شاہی درباروں سے بے نیازی کا اظہار کیا ہے ؎

کلبۂ کاندرو بروز و بہ شب — جائے آرام و خورد و خواب منست
ہر چہ در مجلس ملوک بود — ہمہ در کلبۂ خراب منست
دخل جراد و نان خشک برو — گرد خوان من و کباب منست
شیشۂ جرمن کہ بادا پُر — پیش من شیشۂ شراب منست
خدمت پادشاہ کہ باقی باد — نہ بہ بازوئے خاک و آب منست
نیست ایں بندہ را زبان جواب — جامہ و جائے من جواب منست

انوری میں شاعری کا مادہ فطری تھا۔ لیکن دربار داری کی زندگی نے اس کو خراب کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ قصائد نگاری کا پیشہ اختیار نہ کرتا تو وہ شعرا کی اس صف میں جگہ پانے کے قابل ہوتا جس میں ہم فردوسی۔ نظامی۔ سعدی اور حافظ کو جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ انوری کے کلام میں وہ صفائی روانی، بے محابا نگاری۔ شوخی اور علمیت ہے جو کچھ اُسی کا حصہ ہے اس کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس نے عربی زبان کے الفاظ اور تراکیب کو ایک نہایت خوش آیند صورت میں فارسی قصائد کے ضمن میں استعمال کرنے کی روش ڈال دی۔ فارسی اور عربی کی یہ بے مثل اور رنگین ترین آمیزش انوری کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اور شاید اس کی پیغمبری کے دلائل میں سے ایک بڑی دلیل ہے۔ واقعات اور معاملات کو نادر ترکیبوں اور خوش نما بندشوں میں ادا کرکے انوری نے زبان کے دائرے کو وسیع کر دیا۔ اور اس کے طفیل قصائد کا احاطہ زیادہ فراخ ہو گیا یہاں تک کہ قصیدہ ایک حد تک تقریباً ہر قسم کے خیالات ادا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

انوری نے غزلیں بھی کہی ہیں اور ان کا رنگ بھی خوب ہے۔ غزل گوئی میں اس کا رتبہ متقدمین سے کم نہیں۔ اس کی غزلوں میں سعدی جیسے استادوں کی تاثیر اور لطافت ہے۔ انوری کے قطعات میں بعض بے حد لطیف اور سود مند ہیں۔ اور وہ قطعات جن میں اخلاقی مضامین ادا کئے گئے ہیں بہت قدر کی نگاہ سے

دیکھے جاتے ہیں۔

بعض محققین کی رائے ہے کہ انوری کا اسلوبِ بیان یکسانیت کے عیب سے پاک نہیں۔ اور یہ عیب کسی حالت میں بھی پسندیدہ خیال نہیں کیا جاتا۔

انوری کی تصانیف میں صرف ایک کلیات ہے جو "کلیات انوری" کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اس میں کوئی چودہ ہزار اشعار ہیں۔

عام خیال ہے کہ انوری نے ۵۸۷ھ کے قریب وفات پائی لیکن علامہ مرزا محمد قزوینی کی تحقیقات اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ وہ ۵۵۶ھ کے لگ بھگ فوت ہوا۔ اس کے بعد کی کوئی تاریخ قرین صواب نہیں ٹھہرائی جا سکتی۔

سوال: ادیب صابر کی زندگی کے حالات مختصر طور پر بیان کیجئے اور اس کی شاعری کا جائزہ پیش کیجئے۔

جواب: شہاب الدین ادیب صابر بن اسماعیل ترمذ کا رہنے والا تھا۔ کہتے ہیں کہ شروع شروع میں وہ نیشاپور کے مقام پر خراسان کے حاکم کے دربار میں ملازم تھا۔ اس کی قابلیت اور ذہانت اور قادر الکلامی کا شہرہ دربار خراسان سے نکل کر ملک کے اکثر حصوں میں پھیل گیا۔ یہ شہرت سلطان سنجر کے کانوں تک بھی پہنچی۔ وہ ادب نواز تو تھا ہی فوراً حکم دیا کہ ادیب صابر کو بلا کر درباری شعرا کے زمرے میں شامل کیا جائے۔

روش کے اعتبار سے وہ زیادہ تر عنصری اور فرخی کا پیرو ہے اور مسعود سعد اور معزی کا عقیدت مند ہے۔ عربی زبان پر

پوری پوری قدرت حاصل تھی۔ اس زمانے کے بڑے بڑے شعرا و ادبا کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات تھے۔ مثلاً سنائی، عروضی سمرقندی، انوری۔ وطواط وغیرہ کے ساتھ دوستی تھی۔

صابر قسمت کا قائل تھا۔ اور اپنے آپ کو حادثات کے ہاتھوں مجبور و معذور سمجھتا تھا جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے ؎

ز روزگار حذر کن ز کردگار بترس | دگر نہ بر ہمہ آفاق دسترس باشد
چوں روزگار بر آشفت و کردگار گرفت | زوال دولت تو در یکے نفس باشد

ادیب صابر کی موت بہت دردناک طور پر واقع ہوئی۔

اتسز خوارزم شاہ نے جب خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے سنجر کے خلاف سرتابی کی تو سلجوق بادشاہ نے ادیب صابر کو خوارزم شاہ کے دربار میں بھیجا تاکہ وہ مصالحت کی کوئی صورت نکالے یا کوئی خفیہ اطلاع بہم پہنچائے۔ اگرچہ خوارزمشاہی دربار میں اس کا خیر مقدم کمال گرمجوشی سے نہیں کیا گیا تھا تاہم کوئی ایسی بے اعتنائی بھی نہیں برتی گئی تھی۔ ادیب صابر نے سنجر کی خدمت میں ایک سازش کا انکشاف ارسال کیا۔ اس سازش سے مطلوب تھا سلطان سنجر کا قتل۔ اسے ادیب صابر کی لاپروائی کہئے یا بدقسمتی کی انتہا کہ اتسز کو اس کے مراسلے کا علم ہو گیا۔ انتقام کے طور پر خوارزم شاہ نے ادیب صابر کو دریائے جیحوں میں ڈبو دیا۔ تذکرہ نویسوں نے یہ حادثۂ جانکاہ سنہ ۱۱۴۳ء اور سنہ ۱۱۵۱ء کے درمیان بیان کیا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی اسے سنہ ۵۲-۱۱۵۱ء لکھتا ہے۔ صاحب تاریخ جہانکشا سنہ ۱۱۴۷ء میں یا اس سے بھی پہلے اور ڈاکٹر ایتھے سنہ ۴۴-۱۱۴۳ء میں۔ ڈاکٹر ایتھے کا

خیال قرین صواب معلوم ہوتا ہے۔

ادیب صابر کے کلام میں کئی خاص خوبیاں ہیں۔ لیکن اس قدر نہیں کہ وہ اپنے شہرۂ آفاق ہمعصروں مثلاً امیر معزی یا انوری کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہو سکے۔ تاہم حیرانی کی بات ہے کہ ایک بار انوری نے ادیب صابر کے ساتھ کوئی مشابہت رکھنے پر فخر کا اظہار کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وطواط کو نسبتاً زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہے۔ اتسز خوارزم شاہ سلطان سنجر کی طرف سے قلعہ ہزار اسپ وغیرہ کا حاکم تھا۔

صابر نے پُرلطف اور دلکش غزلیں بھی کہی ہیں۔ اور ان غزلیات کی چند امتیازی خصوصیات ہیں۔ وہ جوش و خروش کے ساتھ عشق کا نغمہ الاپتا ہے مستی اور بے خودی کا رنگ غالب ہے عیش و نشاط کی تلقین کرتا ہے۔ ماضی کے تفکرات اور آلام کو چھوڑنے اور مستقبل کے خطرات سے لاپروائی اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ عمر خیام کے فلسفۂ تعیش کا قائل و عامل ہے۔ کسی روح کو آزار پہنچانے کا مخالف اور نیکی و ہمدردی کا حامی ہے۔

سوال: رشید الدین محمد معروف بہ وطواط کی زندگی اور کلام پر روشنی ڈالئے۔

جواب: رشید الدین محمد عبد الجلیل العمری المتخلص بہ وطواط ۴۸۱ھ میں پیدا ہوا۔ وطواط ابابیل کو کہتے ہیں اور یہ نام اسے بہت چھوٹے قد کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ جو بعد میں اس نے تخلص کے طور پر اختیار کر لیا۔ سلجوقی عہد کے شعراء میں وطواط کو ایک ممتاز درجہ

حاصل ہے۔ وطواط کی ترقیوں کا زمانہ سلجوقی خاندان کے آخری عظیم القدر بادشاہ سنجر (۱۱۱۹ء تا ۱۱۵۷ء) کے عہد حکومت کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ خوارزمشاہی خاندان کے بادشاہ سلطان اتسز (۱۱۲۷ء تا ۱۱۵۶ء) کی اسے خاص سرپرستی حاصل تھی وطواط اپنے شجرہ نسب کو خلیفہ ثانی حضرت عمر رضؓ سے ملاتا تھا۔

وطواط نے کچھ دنوں مدرسہ نظامیہ بلخ میں بھی تعلیم پائی تھی۔ اس کے اساتذہ میں ایک امام ابوسعید ہروی بھی تھے۔ وطواط نے فارسی اور عربی علم و ادب میں مہارت تامہ پیدا کی۔ اس نے کتابت یا دبیری کو باقاعدہ طور پر اپنا پیشہ بنا رکھا تھا حتیٰ کہ اسے الکاتب بھی کہا جاتا تھا۔

سلطان اتسز خوارزم شاہ کے دربار میں مستوفی یعنی کاتب و دبیر کی خدمت پر مامور تھا۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ایک کامل شاعر کا رتبہ رکھتا تھا۔ تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی میں مذکور ہے کہ وہ ایک کامل شاعر کا رتبہ رکھتا تھا۔ ایک بار نہایت گرم بحث کے دوران میں سلطان اتسز نے وطواط کے حقیر قد کی طرف مزاحیہ اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس قلمدان کو آگے سے ہٹا دو تاکہ میں دیکھ سکوں کہ اس کے پیچھے کون بیٹھا ہے"۔ وطواط نے فوراً اٹھ کر جواب دیا کہ "انسان اپنے دل اور زبان کی بدولت بڑا ہوتا ہے نا کہ قد و قامت کے لحاظ سے"

وطواط گنجا بھی تھا۔ ایک دن سلطان اتسز کے حضور میں وطواط ساغر و گل لینے کے لئے اٹھا۔ سلطان نے از راہِ مذاق کہا:

"بیٹھ بھی جا کہ تو ہمارے لئے خود ہی ساغر (شاعر) اور گل (کل گنجا) ہے"۔ ایک شعر سلطان اتسز کے نام سے منسوب ہے جس میں اس نے شاعر وطواط کی مزاحیہ انداز میں تعریف کی ہے ؎

از فضل سرت بر آسماں مے ساید　　زاں بر سر تو موی ہمے بر ناید

تاریخ جہانکشائے جوینی سے وطواط کے متعلق بہت اہم واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ جب ۱۱۴۷ء میں اتسز خوارزمشاہ نے اپنے ولی نعمت سلطان سنجر سلجوقی کے خلاف بغاوت کردی تو سنجر نے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ خوارزم پر چڑھائی کردی اور قلعہ ہزار اسپ میں اتسز کو محصور کر لیا۔ سلطان سنجر کا ملک الشعرا انوری بھی اس کے ہمراہ تھا۔ بادشاہ کے حکم سے اس نے ایک رُباعی لکھی جسے ایک تیر کے ذریعہ سے قلعہ کے اندر بھیج دیا گیا۔ رُباعی یہ تھی ؎

اے شاہ! ہمہ مُلک و زمیں حسب تراست
وز دولت و اقبال جہاں کسب تراست

امروز بیک حملہ ہزار اسپ بگیر
فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست

اُدھر اتسز کے ساتھ وطواط بھی قلعے میں موجود تھا۔ اتسز نے شاعر کو حکم دیا کہ اس رُباعی کا موزوں جواب فی البدیہہ لکھا جائے چنانچہ ذیل کی رُباعی تیر کے ساتھ بندھوا کر قلعے سے باہر پھینکی گئی ؎

اے شہ کہ بجامت مے صافیست نہ دُرد
اعدائے ترا ز غصہ خوں باید خورد

گر خصم تو اے شاہ شود رستم گرد
یک خر ز ہزار اسپ تو نتواند برد

سنجر کو اس بے باکانہ جواب پر بہت غصہ آیا اور اس نے قسم کھائی کہ جب قلعہ فتح ہو جائے گا تو اس کم بخت وطواط کے سات ٹکڑے کرا دوں گا۔ بالآخر جب اُتسز مقابلے کی تاب نہ لا کر قلعہ سے فرار ہو گیا تو سنجر کو فتح نصیب ہوئی اور وطواط کو کسی کونے کھدرے سے نکال کر سنجر کے حضور میں پیش کیا گیا۔ سلطان نے اپنی قسم کے مطابق حکم دیا کہ اس شاعر کے سات ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ خواجہ منتخب الدین بدیع الکاتب نے عرض کی کہ حضور وطواط تو ایک حقیر سا پرندہ ہے۔ نہایت مناسب ہو گا اگر اس کے صرف دو ٹکڑے کرنے کا حکم دیا جائے۔ سنجر کو یہ جواب اس قدر پسند آیا کہ وطواط کی جان بخشی کر دی۔ وطواط یہاں سے بھاگا بھاگا اُتسز کے پاس پہنچ گیا اور مرتے دم تک اِسی کی خدمت میں حاضر رہا۔

سنہ ۱۱۵۲ء میں اُتسز نے کسی بات پر خفا ہو کر وطواط کو جلا وطن کر دیا یہانتک کہ اُسے جان سے مارنے کی نیت بھی کر بیٹھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب غریب شاعر نے مندرجہ ذیل اشعار اُتسز کو مخاطب کر کے لکھے تو اس کی خطا معاف ہوئی اور دربار میں واپس بلا لیا گیا۔

سی سال شد کہ بندہ بصفِ نعالِ در
دانند خدائے عرش کہ ہرگز نہ ایستاد

بر دست مدح خوان تو بر تخت مدح خواہ
چوں بندہ مدح خوانے در ہیچ بارگاہ

اکنوں دلت ز بندۂ سی سالہ شد ملول	در دل بہ طولِ مدت یابد ملال راہ
لیکن مثل زنند چوں مخدوم شد ملول	جوید گناہ بندۂ بے چارہ بے گناہ

وطواط کی جرأت زبان درازی اور بیباک گوئی کے متعلق کئی قصے مشہور ہیں۔ قزوینی نے اپنی کتاب آثار البلاد میں لکھا ہے کہ سلطان اتسز کو وطواط سے اس قدر دل بستگی تھی کہ اس نے اپنے محل کے سامنے وطواط کے لئے ایک عالیشان محل بنوا رکھا تھا تاکہ سلطان کا جس وقت جی چاہے اس سے بات چیت کر سکے۔ ایک بار اتسز نے مذاق سے کہا کہ "وطواط تمہاری کھڑکی سے بھیڑیئے کا سر نکلا ہوا ہے۔" بھلا وطواط کوئی کم حاضر جواب یا نڈر تھا۔ جواب دیا "بادشاہ سلامت! یہاں کوئی بھیڑیا تو نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے کھڑکی میں ایک شیشہ لگوا رکھا ہے۔"

اتسز نے ۱۱۵۶ء میں وفات پائی۔ اس موقعہ پر وطواط نے یہ رباعی لکھی ؎

شاہا فلک از سیاستت می لرزید	پیشش از طوع بندگی می ورزید
صاحب نظرے کجاست تا در نگرد	تا ہمہ این سلطنت بدیں می ارزید

اتسز کے بعد اس کا بیٹا سلطان ارسلان (۱۱۵۶ء تا ۱۱۷۳ء) تخت نشین ہوا۔ ارسلان کے بعد سلطان تکش بادشاہ بنا۔ اس نے ایک بار وطواط سے کہا کہ مجھے ایک ایسی رباعی کے ذریعہ نصیحت کریں کہ جس میں میرے دادا، باپ اور خود میری خصوصیت کا ذکر ہو، وطواط نے بڑھاپے کی کلفت اور اعضائے رئیسہ کی کمزوری

کے باوجود یہ رُباعی چیست کردی ؎

جدّت ورقِ زمانہ از ظلم بشست   عدلِ پدرت شکستہا کرد درست
اے بر تو قبائے سلطنت آمدہ چست   ہاں تا چہ کنی کہ نوبتِ دولتِ تست

الیاقوت کے مطابق وطواط نے ۵۷۳ھ میں وفات پائی
دولت شاہ سمرقندی نے وطواط کی تاریخ وفات ۵۸۲ھ بتائی
ہے۔ یاقوت کا بیان ذرا زیادہ قرین صواب معلوم ہوتا ہے۔

وطواط کا فارسی دیوان کوئی سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔
اس میں زیادہ تر مدح کے قصائد ہیں۔ وطواط کے ۱۷۶ مراسلات
جو عربی زبان میں ہیں اور سرکاری معاملات کے علاوہ ذاتی خط و
کتابت سے بھی تعلق رکھتے ہیں بمقام قاہرہ طبع ہو چکے ہیں۔

وطواط نے فرخی کی کتاب ترجمان البلاغت کے نمونے پر
صنائع بدائع شاعری کے بارے میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے
حدائق السحر۔ اس کتاب کی کئی خوبیوں کے علاوہ ایک مفید مطلب
خصوصیت یہ بھی ہے۔ کہ اس میں قدیم شعرا کے کئی اشعار
بطور سند، حوالہ یا مثال کے پیش کئے گئے ہیں۔

وطواط کی ایک اور تصنیف موسوم بہ "صد کلمہ" ہے۔ اس
میں حضرت علیؓ کے ایک سو زرّیں اقوال فارسی اشعار میں نظم کئے
گئے ہیں۔ وطواط کو عربی زبان پر کامل عبور حاصل تھا۔ اس کا نتیجہ
یہ ہوا کہ اس کے اظہار خیالات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ اس
کے ساتھ ساتھ یہ اثر بھی رو پذیر ہوا کہ اس کے کلام میں صنائع و بدائع
اور قدیم طرز ادا کی بھرمار آگئی یہاں تک کہ زمانے کی رَو کے پہلو بہ پہلو

اس لئے کبھی اسلوب بیان کو حسنِ تخئیل پر ترجیح دی اس کے
کلام میں دیگر صنعتوں کے علاوہ صنعتِ ترصیع بہت کثرت کے
ساتھ ملتی ہے۔ مراسلات میں تصنع کے علاوہ عبارت تک بھی
مغلق ہے۔ اس سے یہ مطلب اخذ نہ کرنا چاہیئے کہ وطواط
ہر وقت رجحانِ زمانہ ہی کو پیش رکھتا۔ ہرگز نہیں۔ جہاں اس کے
کلام میں دُور از کار تشبیہات اور پُر تصنع استعارات ہیں وہاں
جدتِ خیال اور نزاکتِ ادا کی جھلک بھی جابجا نظر آتی ہے۔ اس
کے اشعار میں دلکش رنگینی ہے۔ علم عروض پر اس کی کتاب حدائق السحر
کو ایک مستقل سند خیال کیا جاتا ہے۔ قصائد نگاری میں اُسے ایک
خاص ملکہ حاصل ہے۔ اور وہ کبھی بھی اپنے پیشرو مدح نویسوں
سے پیچھے نہیں رہتا۔ قصیدہ مدحیہ کی اصلی کیفیت یہ ہے کہ شاعر
اُسے طبیعت پر زور دے کر پیدا کرتے ہیں۔ مبالغوں کی سرحد
سے کہیں دور نکل جاتے ہیں۔ ان میں جوشِ خیال اور مطابقتِ بیان
کا فقدان ہوتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو قصیدوں کو تاثیر سے عاری کردیتی
ہے۔ گویا آج اگر ہم وطواط کو جانتے ہیں تو حدائق السحر کی وجہ سے
نہ کہ اس کے ناپائدار قصیدوں کے سبب۔

سوال: ظہیر فاریابی کی زندگی اور شاعری پر نوٹ لکھئے۔

جواب: ابوالفضل طاہر بن محمد ظہیر الدین فاریابی فاریاب
میں پیدا ہوا۔ بچپن سے ہی شعر و سخن کا دلدادہ تھا۔ علوم متداولہ
کی تحصیل کی۔ عربی زبان بھی سیکھی۔ نجوم اور حکمت کا گہرا مطالعہ
کیا۔ اس کے علاوہ شاعری میں کمال حاصل کیا۔ فارسی کے علاوہ

عربی میں بھی شعر کہنے لگا۔ کسی قدر تعلّی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

بنظم و نثر چہ در پارسی چہ در تازی
کمالِ دانشِ من کور دیدہ کر بشنید

ظہیر کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ ایران کے بڑے بڑے شہروں اور مشہور علاقوں کا سفر کیا۔ اس میں نیشا پور، مازندران اور آذربائیجان کی سیاحت بھی شامل ہے۔

ظہیر زمانے کی ہوا کے رُخ کے مطابق قصیدہ گوئی پر مائل ہوا اور اس فن میں نام پیدا کیا۔ اپنے ہمعصر بادشاہوں اور امیروں، وزیروں کی مدح سرائی کی۔ مثلاً ان میں مندرجہ ذیل سلاطین و امرا کے نام قابل ذکر ہیں:۔

نیشاپور کا حاکم طغان شاہ، محمد بن ایلدیگیز، قزل ارسلان، مازندران کے باوندی خاندان کا بادشاہ حسام الدولہ اردشیر، آذربائجان کا اتابک نصرۃ الدین ابو بکر۔

جب ایک قصیدہ گو شاعر مطلب برآری میں ناکام رہتا ہے یعنی مناسب صلہ اور انعام و اکرام سے محروم ہوتا ہے تو بالعموم وہ شکوہ و گلہ پر اتر آتا ہے۔ ظہیر ان شعرا میں شامل ہے جنہوں نے ایسے قصیدے لکھے۔

ظہیر کے قصائد سے بخوبی ظاہر ہے کہ اس نے مصیبت اور افلاس کی زندگی بسر کی۔ اور اکثر مسافرت اور پردیس کے آلام و آفات جھیلے ؎

منم امروز و دلی زاندہِ گیتی بدو نیم
بیم آنست دلم را کہ بجاں باشد بیم
بحکم آں کہ خرابست صاحبا امروز
زند بادِ حوادث وجود را بنیاد

در پی ترتیب خورد و خواب نیامد ودر نگر کاندرو چو من کسے از چرخ
آخر ناکام و نامراد ہو کر ظہیر نے مدح سرائی ترک کر دی۔
۵۹۸ھ میں تبریز کے مقام پر وفات پائی اور مقبرۂ شعرا میں مدفون ہوا۔

ظہیر ایک بلند پایہ قصیدہ گو تھا۔ اعلیٰ معیار کے قصائد لکھے اسلوب فن، بلندیٔ تخیل، نزاکت مضمون اور صنائع بدائع کے اعتبار سے اس کے قصیدے متقدمین اور متوسطین کے پایہ کو پہنچتے ہیں۔ بعض قصیدے انوری اور خاقانی کے قصائد سے ٹکر لیتے ہیں۔ اس کے قطعات بھی خوب ہیں اور غزلیں بھی عمدہ اور پُر لطف۔ مجد ہمگر اُسے انوری کا ہم پایہ مانتا ہے۔

سوال: جمال الدین اصفہانی کی زندگی مختصر طور پر بیان کیجئے اور اس کے کلام کی خوبیاں واضح کیجئے۔

جواب: جمال الدین محمد بن عبد الرزاق اصفہانی چھٹی صدی ہجری کا شاعر ہے۔ اصفہان میں پیدا ہوا اور وہیں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذارا۔ جمال الدین کو سیر و سیاحت کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ اس نے مازندران، آذربائیجان اور گنجہ کا سفر کیا۔ اس کی زبان میں لکنت تھی (بولتے میں ہکلاتا تھا) جیسا کہ اس کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے ؎

گویند کج زبانم کج باش گو زبان چوں ہست در معانی و در لفظ استوار
طرفِ کلاہ خوباں خود کج نکوتر ست ابروئے زلفِ دلبر کج بہتر و دوتا

جمال کے کلام سے اور بھی نجی زندگی کے واقعات کا پتہ چلتا

ہے مثلاً ایک بار اس کی آنکھوں میں سخت درد ہوا۔ اور چھالے پڑ گئے۔
اس واقعہ کو وہ مزاحیہ انداز میں یوں بیان کرتا ہے ؎

طفلِ بصر در آبلہ گشتست شیر خوار | صد بار بیش خورد تو گوئی کہ ناشناست
در خونِ من شد آبلہ و من زابلہی | بر دیدہ مے نشانمش ایں خود چہ توتیاست

اس کے کلام سے اس کے اخلاق و کردار اور خیالات کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً وہ درویشانہ طبیعت رکھتا تھا اور مال و زر کی ہوس نہ رکھتا تھا۔ وہ دولت اور ثروت پر عزت نفس اور خودداری کو ترجیح دیتا تھا۔ وہ ایمان اور ضمیر کو سب سے بڑی پونجی سمجھتا تھا ؎

ایں ہمہ لاف مزن گرچہ ترا سیم و زر است | کہ زر و سیم بر اہلِ خرد محقر است
سرو آزاد ازاں شد کہ تہی دست آمد | غنچۂ دل تنگ بدانست کہ زر بند زر است

اس میں شک نہیں کہ اس نے بادشاہوں، امیروں اور وزیروں کی مدح سرائی کی ہے اور مبالغہ سے بھی کام لیا ہے لیکن اس کی آزاد منشی اور درویش صفتی کی جھلک جا بجا نمایاں ہے۔ اور کمینوں کے آگے تو اس نے کبھی بھی اپنی گردن جھکانا گوارا نہیں کیا ؎

کہ نزد ہمت من بس تفاوتے نکند | از آنچہ چرخ یمن داد یا ز من بہ بود
مرا تواضع طبعی عزیز آمد لیک | مذلتیست تواضع بنزد سفلہ نمود

جمال الدین عراقی قصیدہ گو شعرا کا سرتاج ہے تشبیہات اور مضامین کے اعتبار سے وہ متقدمین کی روش پر چلتا ہے۔ انوری، خاقانی اور نظامی وغیرہ اس کے ہمعصر تھے اور اس کا کلام ان کی شاعری سے متاثر ہوا ہے۔ لیکن اس کا سبک خراسانی ہے۔ اور زبان متاخرین کی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ اس کے کلام میں خاقانی اور انوری کی سی

تعقید لفظی و معنوی نہیں پائی جاتی۔ اس کی شاعری زیادہ صاف، سادہ اور زود فہم ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے اشعار میں مبالغہ آمیز مضامین کی کمی ہے یا لفظی و معنوی صنائع نہیں ہیں۔ اس کے کلام میں ادبی دلکشی اور لطیف نکتہ بیانی موجود ہے۔ اس کی شاعری میں فصاحت اور شیرینی کا جوہر نمایاں ہے وہ قصیدہ میں بلا تشبیب اور تغزل سیدھا ممدوح کی تعریف شروع کر دیتا ہے۔

قصیدوں کے علاوہ اس نے غزلیں اور ترجیع بند بھی بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ اس کے بیشتر قصائد عراق کے سلجوقی سلاطین مثلاً ارسلان بن طغرل اور اس کے بیٹے طغرل کی تعریف میں ہیں۔ ان کے علاوہ اس نے آذربائجان کے آتابک جہاں پہلوان محمد بن ایلدگز اور کچھ باوندی امیروں کی بھی مدح سرائی کی ہے اس نے اصفہان کے دو بڑے خاندانوں آل خجند اور آلِ صاعد کی تعریف میں بھی قصاید لکھے ہیں۔

مدحیہ قصیدوں کے علاوہ اس نے بعض امرا اور علما کے مرثیے بھی کہے ہیں۔ یہ مرثیے بڑے پُر تاثیر اور رقت انگیز ہیں۔ جمال الدین نے بعض قصائد حکمت اور پند و موعظت پر بھی لکھے ہیں۔ کچھ اشعار بڑے عبرت انگیز ہیں۔ بلند ہمتی اور نفس کشی کی تلقین کرتے ہیں۔ عجز و انکسار اختیار کرنے، حقیقت اور روحانیت کی کھوج کرنے، ظاہر پرستی اور نمود و نمائش سے اجتناب کرنے کی تاکید کرتے ہیں ؎

بخاک بازدہ ایں خاکِ سوئے علوی گرد — کہ جانِ پاک سزا نیست جز بعالم پاک
بجاں بمیر د بدل زندہ گرد و دائم ماں — کہ جانِ زندہ دلاں را ز مرگ نا ید باک

طاعتِ فرمانِ ایزد شفقت بر خلقِ او — در ہمہ حال ایں دو معنی را شعارِ خویش کن
آب در حلقِ ضعیفاں از کرم چوں نوش ساز — موئی بر اندامِ خصیم از بیم ہمچوں نیش کن
گر تکبر می کنی با خواجگانِ سفلہ کن — ور تواضع می کنی با مردمِ درویش کن
چوں کسی دردِ دلی گوید تراز احوالِ خویش — گوش بر دردِ دلِ آں عاجزِ دلریش کن
مصلحت از لفظِ دیندارانِ کاملِ عقل جوی — مشورت با رائے نزدیکانِ دور اندیش کن

اخلاقی اشعار دیگر فنی خوبیوں کے علاوہ لطفِ خیال۔ دقّتِ نظر اور ندرتِ تشبیہ کے حامل ہیں۔

ماں باپ کی عزّت روا رکھنا ہر انسان پر فرض اولین ہے اور دنیا میں بڑے سے بڑے علما، حکما اور ادبا نے ماں باپ کی خدمت کو سب سے بڑی سعادت قرار دیا ہے۔ چنانچہ جمال الدین اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے ؎

حق مادر نگاہدار و بترس — ز ایزدِ ذوالجلال و الاکرام
کانکہ با مادر و پدر بد کرد — نبود جز ہمیشہ دشمنِ کام

سوال: ابوالفرج رونی کی زندگی اور اس کے کلام کی خوبیوں سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔

جواب: ابوالفرج بن مسعود رونی ۱۰۳۴ء کے لگ بھگ رونہ میں پیدا ہوا ہے۔ حمد اللہ مستوفی صاحب "تاریخ گزیدہ" نے لکھا ہے کہ رونہ خراسان میں واقع تھا۔ لطف علی خاں آذر صاحب آتش کدہ نے اور صاحب مجمع الفصحا نے رونہ کو نیشا پور کے ضلع میں ایک گاؤں بتایا ہے۔ علّامہ محمد قزوینی نے نظامی عروضی سمرقندی

کی مشہور کتاب "چہار مقالہ" کے حواشی میں لکھا ہے کہ رونہ کو ایران کی سرزمین میں خیال کرنا غلطی ہے۔ اس کے ثبوت میں آپ نے لباب الباب کے مصنف عوفی اور تذکرہ ہفت اقلیم کے مصنف امین احمد رازی کو سند کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس سند کے مطابق رونہ لاہور شہر کے پاس کا کوئی گاؤں ثابت ہوتا ہے۔ اس اختلاف کو عوفی کا سب تذکرہ نویسیوں کی نسبت زیادہ قدیم اور مستند ہونا کافی تقویت دیتا ہے۔ لیکن آقا محمد علی نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ رونی کا ایران کی سرزمین سے اٹھنا زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ نیشاپور کے نزدیک اب بھی ایک گاؤں موجود ہے جس کا نام رونہ ہے۔ اس کے مقابلے میں پنجاب کی غالباً سب سے زیادہ مستند جغرافیائی تاریخ "خلاصۃ التواریخ" جو الہ آباد میں چھپی ہے رونہ کے بارے میں بالکل خاموش ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رونہ لاہور کے پاس نہیں تھا۔ اس غلط فہمی کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ رونی کچھ عرصہ کے لئے لاہور میں ٹھیرا تھا۔ مغل دربار کا مشہور شاعر فیضی رونی کا بہت زیادہ قائل رہا۔ فیضی کہتا ہے ؎

ذوقے کہ تواں گرفت از شعر — از شعر ابوالفرج گرفتم

ہندوستان کے مشہور اہل قلم مسعود بن سعد بن سلمان نے رونی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا وہ لکھتا ہے ؎

اے خواجہ ابوالفرج! بکنی یادِ من — تا شاد گردد ایں دلِ ناشادِ من
نازم بداں کہ ہستم شاگردِ تو — شادم بداں کہ ہستی استادِ من

اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ فارسی قصیدہ نگاروں کا بادشاہ انوری تک شروع شروع میں رونی کے کلام کو سامنے رکھ کر اشعار کہتا تھا۔ انوری نے خود تسلیم کیا ہے ؎

باز معلومش کہ من خادم بشعر بوالفرج تا بدیدستم ولوعے داشتم بس تمام

ابوالفرج رونی نے اوائل عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے محمود غزنوی کے پوتے سلطان مسعود کے بیٹے سلطان ابراہیم کی تعریف میں قصیدے لکھنے شروع کیے۔ سلطان ابراہیم نے ۱۰۹۹ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان جلال الدولہ مسعود سوم بن ابراہیم تخت نشین ہوا۔ میر خوند صاحب روضۃ الصفا لکھتا ہے کہ رونی سلطان مسعود بن ابراہیم کی مدح میں بھی قصیدے لکھتا رہا۔ سلطان مسعود بن ابراہیم کا چھوٹا بھائی سیف الدولہ محمود حاکم ہند رونی پر سب سے زیادہ مہربان رہا اور اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ لطف علی بیگ آذر لکھتا ہے کہ جب سلطان مسعود نے سیاسی سازش کے احتمال کی بنا پر شہزادہ محمود کو قلعہ غزنی میں قید کر دیا تو رونی لاہور چلا آیا تھا تاکہ کہیں اس پر بھی سازش کا الزام عائد نہ ہو جائے۔ رونی کی وفات ۱۰۹۶ء کے قریب ہوئی۔

رونی کے مطبوعہ دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ کلام ضرور تلف ہو گیا ہے یا سہواً اس میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔ اس دیوان میں چار ہزار کے قریب اشعار ہیں۔

رودکی نے قصائد نگاری میں ایک مستقل روش نکالی۔ یہاں تک کہ انوری ایسے بلند پایہ قصیدہ گو کے کلام میں رودکی کی پیروی کی جھلک نظر آتی ہے۔ رودکی کے اشعار کا خاص جوہر پروازِ تخیل رنگینیٔ استعارات اور لطف صنائع بدائع ہے۔ خیال اور طرز ادا کے لحاظ سے رودکی اور اس کے پیشرو اساتذہ میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ نہ ہی اُسے ان پر بحیثیت مجموعی کوئی فوقیت حاصل ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض اشعار میں وہ ان سے کچھ آگے نکل جاتا ہے اور یہی وجہ ہے جس کی بنا پر انوری اور فیضی ایسے مسلّمہ استاد بھی اس کی شاگردی کا دم بھرنے کو عار نہیں جانتے۔

عام روش کے مطابق رودکی بھی اپنے قصیدوں کو اکثر تغزل کے ساتھ شروع کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ قصیدہ کے دوران میں مناظرِ فطرت کی تصویریں بھی کھینچتا ہے۔ رودکی کے قصائد میں تاریخی اشارے بھی پائے جاتے ہیں کیونکہ وہ اکثر غزنوی سلاطین کی لڑائیوں کا ذکر کرتا ہے۔

سوال: محمد بن علی سوزنی کی زندگی اور اس کے کلام پر نوٹ لکھئے۔

جواب: محمد بن علی سوزنی شہر نسف میں پیدا ہوا۔ اور بخارا میں علوم کی تحصیل کی مولانا جامی کا کہنا ہے کہ سوزنی کی طبیعت میں تمسخر و استہزا کا مادہ فطری تھا۔ اُسے ہجو گوئی کا موجد کہا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے اربابِ متانت کی توجہ اس فنِ مستقل کی

طرف نہیں آئی تھی۔ اس فن کی بدولت سوزنی نے فارسی ادب میں
اپنے لئے ایک خاص مقام پیدا کر لیا ہے۔
سوزنی کا شمار چھٹی صدی ہجری کے مشہور شعرا میں ہوتا ہے
اس نے اپنے قصیدوں میں سمرقند کے امرا و وزرا کی مدح کی ہے۔
مختاری غزنوی، عمعق بخاری، شمس طبسی وغیرہ کی طرح اس نے ملوک
خانیہ کی بھی مدح سرائی کی ہے۔
سوزنی اپنی خوش طبعی، ظرافت، ہزل گوئی اور رکیک نگاری
کے سبب انوری کے ہمعصر شعرا میں شہرت رکھتا ہے۔ آخری عمر
میں توبہ نصوح کے بعد سوزنی نے حج کیا ہ
چار چیز آوردہ ام یا رب کہ در گنج تو نیست
حاجتی و نیستی، جرم و گنہ آوردہ ام!
ہجویات کو خیر باد کہہ کر حکیم سنائی کی شاگردی اختیار کر لی۔
اماموں کی تعریف میں نظمیں کہیں۔ توحید، نصائح، زہدیات اور
معارف کے مضامین پر بھی نہایت عمدہ قصیدے لکھے۔
سوزنی کے شاگردوں میں سے لامعی بخاری، جلتی، شمس حالہ
اور شطرنجی مشہور ہیں۔
سوزنی کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے روانی اور سادگی
۵۶۹ھ میں وفات پائی۔
نمونۂ کلام :-

رفتم براہِ دیو فتادم بدامِ او	وز دیوِ دیوتر شدم از سیرتِ تباہ
یک روز بے گناہ نبودم بعمرِ خویش	گویا کہ بود بیگنہی نزدِ من گناہ

فردا بروزِ حشر کہ امروز منکرم | اعضائے من شوند بر اعمالِ من گواہ
پیری رسید و موئے سیاہت سفید شد | یار سفید رُو و سیہ موئے را مخواہ

سوال: عمعق بخاری کی زندگی اور شاعری پر مختصر نوٹ لکھئے:

جواب: شہاب الدین عمعق بخاری ایک مشہور قصیدہ گو شاعر گذرا ہے۔ اس نے ملوک افراسیابیہ یا ایلک خانیوں کے ایک حکمران ابو الحسن شمس الملک نصر کی مدح سرائی کی ہے۔ اس کے علاوہ اس خاندان کے ایک اور بادشاہ خضر خاں کے دربار میں اُسے خاص تقرب حاصل ہوا۔ اور اس کا امیر الشعرا بن گیا۔

عمعق کی تاریخ ولادت کا علم نہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوا اور بڑی طویل زندگی پائی۔ چنانچہ ۵۲۴ھ میں جب سلطان کی بیٹی فوت ہوئی تو اس کے ماتم میں مرثیہ لکھنے کے لئے بوڑھے شاعر کو طلب کیا گیا لیکن وہ انتہائی ضعف کے باعث حاضر نہ ہو سکا۔ عمعق کی پیری اور ضعف کی تصویر اس کے مذکورہ ذیل اشعار سے ملاحظہ ہو۔

اگر مورے سخن گوید و گر موئے رواں دارد | من آں مورِ سخن گویم من آں مویم کہ جاں دارد
اگر با مور و با موئی شب و روزے شوم ہمراہ | نہ مور از من خبر یابد نہ موی از من نشاں دارد
بچشم مور در گنجم زبس زاری و بس سستی | اگر خواہد مرا موری بموا اندر نہاں دارد

عمعق بخاری کے قصیدے لطیف تشبیہات، چستی بندش، شیرینی تراکیب وغیرہ کا نمونہ ہیں۔ درد و سوز بھی اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ روانی اور تاثیر بھی اس کے کلام کا جوہر ہے۔ اس کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انوری ایسے بلند پایہ

شاعر نے اُسے اُستادِ سخن تسلیم کیا ہے۔ دوسرا رشید وطواط نے اس کے اشعار کو سند مانا ہے۔ مرثیہ گوئی کے فن میں عمعق کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ اس فن میں جو زور اور اثر اس نے دکھایا ہے اس کی جھلک ذیل کے اشعار سے واضح ہے جو اس نے سلطان سنجر کی بیٹی کے انتقال پر لکھے ہ

ہنگام آں کہ گل دمد از صحن بوستاں	رفت آں گل شگفتہ و در خاک شد نہاں
ہنگام آں کہ شاخ شجر نم کشد ز ابر	بے آب ماند نرگسِ آں تازہ ارغواں

عمعق نے ۵۴۳ھ میں انتقال کیا۔

نمونۂ کلام:

خیز اے بتِ بہشتی آں جام را بیار	کار دیہشت کرد جہاں را بہشت دار
نقش خورنق است ہمہ باغ و بوستاں	فرش ستبرق است ہمہ دشت و کوہسار
ایں افسر مرصّع شاخِ سمن نگر	دیں بردہ موشح گلہائے کامگار
گلبن عروس وار بیار است تو بشتن	وابرش مشاطہ وار ہمے شوید از غبار

سوال: خاقانی شروانی کی زندگی کے حالات بیان کیجئے اور اس کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیجئے:

جواب: حضرت خاقانی ۱۱۰۶ء میں گنجہ (شروان) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام افضل الدین بدیل بن علی ہے۔ شروع شروع میں آپ نے حقائقی لقب اختیار کیا۔ بعد میں خاقان اکبر منوچہر بن فریدوں شروان شاہ کے ساتھ انتساب کے باعث خاقانی تخلص رکھا۔ آپ کا والد علی نجاری کا کام کرتا تھا۔ آپ کی ماں عیسائی مذہب کی تھی لیکن بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا۔

خاقانی ملک الشعرا ابو العلائی گنجوی کے فاضل ترین شاگرد تھے اور اپنے استاد کی وساطت سے ہی خاقانی کو شروان شاہ منوچہر بن فریدوں کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ ابو العلائی کی بیٹی بھی خاقانی کے نکاح میں تھی لیکن استاد شاگرد کی زیادہ دیر نہ نبھ سکی اور دونوں نے ایک دوسرے کی ہجو لکھی۔

خاقانی کی زندگی انتہائی تنگ دستی میں گذری۔ اس افلاس کا ذکر انہوں نے اپنے قصیدوں میں جا بجا کیا ہے۔ بچپن میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ عین جوانی میں وہ اپنے سب سے بڑے سر پرست اور مہربان چچا کافی الدین عمر بن عثمان کی شفقتوں سے محروم ہو گئے۔ بڑھاپے میں جواں سال بیٹا رشید الدین بیس سال کی عمر میں مر گیا۔ ان مصائب کے علاوہ اپنی فضیلت و شہرت کے سبب وہ کئی درباری شعراء امراء کے حسد کا نشانہ بھی بنے اور اپنے ممدوحین کے عتاب کا شکار رہے۔ یہاں تک کہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ قید کے دوران آپ نے مشہور نظم "حبسیہ" لکھی۔ اخستان بن منوچہر کے حکم سے ۵۷۰ھ میں جب قید ہوئے تو ان کی عمر پچاس سال کی تھی جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے:۔

فلک کژرو تر است از خطِ ترسا مرا دارد مسلسل راہب آسا

مرا از بعد پنجہ سال اسلام نزیبد چوں صلیبی بند بر پا

۵۵۱ھ میں خاقانی نے مکہ معظمہ کی زیارت کی۔ سفر کعبہ کے دوران انہوں نے ایک نہایت عمدہ قصیدہ لکھا۔ یہ قصیدہ .. بیت الحرام کی مدح میں ہے اور ایک سو نو شعروں پر مشتمل ہے

مکہ کے خواص نے انہیں اس قصیدے پر دلی خراج تحسین ادا کیا۔ ۵۵۲ھ میں مکہ سے مراجعت کے وقت خاقانی کو وزیر جمال الدین اصفہانی نے خلیفہ بغداد کے حضور میں پیش کیا۔ خلیفہ نے ان کی بڑی عزت کی اور دبیری کا عہدہ بھی دیا لیکن خاقانی بغداد والوں سے رنجیدہ تھا۔ اس لئے یہ عہدہ قبول نہ کیا اور ایران کو لوٹ آیا۔ خاقانی نے ۵۹۵ھ میں تبریز کے مقام پر انتقال کیا۔

تبصرہ:۔ خاقانی کی شہرت کا دارومدار زیادہ تر قصیدوں پر ہے۔ آپ کا شمار ایران کے مشہور ترین اور اول درجہ کے قصیدہ گو شعرا میں ہوتا ہے۔ بادشاہ ہر قصیدے پر انہیں ایک ہزار روپیہ اور بیش بہا خلعت عطا کیا کرتا تھا۔ خاقانی کے یہاں عاشقانہ غزلیں بھی خوب ہیں۔ کلام اکثر نصیحت اور پند و حکمت سے لبریز ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہجو بھی بہت بیباک کہتے ہیں۔ آپ عربی اور فارسی دونوں میں شعر کہتے اور خط و کتابت کرتے تھے۔

خاقانی کے قصائد میں معانی کی دقت کے علاوہ زبان اور روش بھی دقیق اور مشکل ہے۔ آپ کے کلام کو سمجھنے کے لئے مختلف علوم و فنون، معرفتِ عقاید گوناگوں۔ لغات اور اصطلاحات پر عبور ہونا ضروری ہے۔ صنائع بدائع پر بھی شاعر کو قدرت حاصل تھی آپ کے تشبیہات و استعارات نرالے اور دلکش ہیں۔ آپ کے اشعار میں تجنیس، حسن التعلیل، لف و نشر، ایہام اور دیگر لفظی و معنوی صنعتیں بکثرت موجود ہیں۔ خاقانی کی شاعری بہت محکم اور استوار ہے۔ زبان کی لطافت اور خیال کی بلندی اور باریکی

قابل قدر ہے۔ آپ دوسرے قصیدہ گو شعرا کی روش سے الگ تھلگ ہو کر نئی ڈگر پر چلتے ہیں۔ فصاحت و بلاغت آپ کے کلام کا نمایاں جوہر ہے۔ علمیت کی گہرائی آپ کا خاص وصف ہے۔

خاقانی کی وسعتِ مطالعہ اور علم و فضل اس بات سے عیاں ہے کہ آپ کے کلام میں قرآن مجید کی آیات، ضرب الامثال، کنایات و اشارات، علوم و فنون سے متعلق مضامین بکثرت پائے جاتے ہیں آپ کی ترکیبیں اور بندشیں بھی اچھوتی۔ آپ کی یہ امتیازی خصوصیت خراسان کے شعرا کے کلام کے ساتھ مقابلہ کرتے سے صاف نمایاں ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایسی تراکیب "شہ طفان عقل" "نظافان سحر" "خرابان شعر" "چین صورت" "نکتہ دوشیزہ" "درع حکمت" "خاک سپران حسد" وغیرہ دوسرے شعرا کے پاس سرے سے نہیں ملتیں یا شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ کلام خاقانی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جابجا مقامی بولی کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ آذری (آذر یا ئیجانی) زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔

چونکہ خاقانی کی ماں عیسائی تھی۔ اس لئے انہیں نصرانی عقائد، انجیل اور عیسائیت کی تاریخ اور اس کی اصطلاحات سے بھی واقفیت تھی اس کا اثر بھی آپ کے کلام پر پڑا۔ اور آپ کے کلام کو دوسرے شعرا سے ممتاز کیا۔ مثلاً ذیل کے الفاظ نصرانیت کی اصطلاحات ہیں جو اس زمانے کے نسطوریوں میں مروج تھیں:۔ مطران۔ مخران۔ بطریق نسطور۔ بلکا۔ اسقف وغیرہ۔

عیسائیت کے علاوہ ان کے کلام میں اسلامی روایت۔ تاریخی

واقعات اور حدیث وفقہ کے مسائل کا بھی ذکر ہے۔ اس لئے آپ کے کلام کو صرف ایک عالم ہی سمجھ سکتا ہے جس نے ایرانی ادبیات، اسلام کی تعلیمات اور عیسائیت کے عقاید کا گہرا مطالعہ کیا ہو چنانچہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آپ خواص کے شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے قصائد کی بہت سی تشریحات لکھی گئی ہیں۔ آپ کی شاعری کو سمجھنے کے لئے فارسی کے علاوہ عربی زبان پر بھی عبور ضروری ہے۔ آپ کے قصیدے بڑے طویل ہیں بحریں بھی لمبی ہیں۔ عام طور پر ردیف بھی ہوتی ہے۔ تشبیب اور تغزل آپ کے قصائد کا لازمہ ہے۔

آپ کے کلام کا خاص جوہر سوز و گداز ہے۔ آپ کے اشعار آپ کے جذبات اور احساسات کی پوری پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ درد و غم کی تصویریں خوب کھینچی ہیں مناظر نگاری بھی قابل داد ہے۔ جزئیات اور تفاصیل کا بیان بھی قابل ذکر ہے۔ آپ کے قصائد میں وہ قصیدہ جو "مدائن" کی تاریخ اور خستہ حالی پر لکھا گیا سوز و الم کا بہترین اظہار ہے۔ شعر شعر سے عبرت ٹپکتی ہے۔ زبان کا زور اور جذبات کا طوفان اوّل سے آخر تک نمایاں ہے۔

سفر کعبہ کے متعلق ایک مثنوی "تحفۃ العراقین" کے نام سے لکھی اس میں تین ہزار اشعار نہایت فصیح و بلیغ، پر مضمون اور نصیحت آمیز ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

لبِ تو قیمتِ شکر بشکست   رخِ تو رونقِ قمر بشکست
من خود از غم شکستہ دل بودم   عشقت آمد تمام تر بشکست
نیشِ مژگان چناں زدی بر دل   کہ سر نیش در جگر بشکست

ہاں اے دلِ عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں — ایوانِ مدائن را آئینۂ عبرت داں
یک رہ ز لبِ دجلہ منزل بہ مدائن کن — از دیدہ دوم دجلہ بر خاکِ مدائن راں
خود دجلہ چناں گرید صد دجلۂ خوں گوئی — کز گرمیِ خونابش آتش چکد از مژگاں

سر میفراز تاکلہ داراں — سرت بے مغز چوں کلہ نکنند

سوال: مجیر الدین بیلقانی کی زندگی اور شاعری پہ مختصر نوٹ لکھیئے۔

جواب: مجیر الدین بیلقانی کی زندگی کے بیشتر حالات پردۂ تاریکی میں پوشیدہ ہیں۔ البتہ بہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ آذر بائجان کے شمال میں واقع ایک قصبہ بیلقان کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا قصیدہ گو تھا۔ وہ آذربائیجان اور عراق کے امیروں اور اتابکوں کا مدّاح تھا۔ اور ان سے انعام واکرام پاتا تھا۔

مجیر الدین خاقانی کا شاگرد تھا۔ لیکن کچھ ناخوشگوار واقعات کے سبب اس کی استاد کے ساتھ چپقلش ہوگئی۔ یہانتک کہ اس نے خاقانی کی ہجو میں شعر لکھے۔ تذکرہ نویسوں کے قول کے مطابق مجیر الدین اصفہان کا صدر دار مقرر ہوا تھا۔ لیکن اچھا حاکم ثابت نہ ہوا تو اہلِ اصفہان نے اس کی پرواہ نہ کی۔ مجیر نے اصفہانیوں کو ہجو کا نشانہ بنایا۔ اس سے اہلِ شہر مشتعل ہوگئے اور ایک اصفہانی شاعر جمال الدین عبد الرزاق نے مجیر اور خاقانی دونوں کی ہجو لکھ ڈالی۔ خاقانی کا اصفہان کی ہجو کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ اس نے اصفہانیوں کو خوش کرنے کے لئے اصفہان کی مدح میں ایک پُر زور قصیدہ لکھا جس میں مجیر کی ملامت

بھی کی۔ ایک راوی کے بیان کے مطابق اصفہان کے اوباش نے مجیر کو ۵۸۶ھ میں ہلاک کر دیا۔

قصائد کے علاوہ مجیر نے غزلیات، رُباعیات اور قطعات بھی لکھے ہیں۔ مجیر کا کلام موثر، لطیف اور شیریں ہے۔ لیکن علمیت اور روحانیت سے عاری ہے۔ خراسان کے شعرا کی طرح اس کے اشعار میں صنائع بدائع لفظی و معنوی بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کی تشبیہات واستعارات دلکش اور اچھوتے ہیں۔ مبالغہ کا مشتاق ہے۔ اس کے کلام میں اچھوتے مضامین اور بلند خیالی و نکتہ گوئی کی کمی نہیں۔ جذبات نگاری پر بھی اسے عبور حاصل تھا جیسا کہ سلطان ارسلان بن طغرل کی مدح میں کہے گئے قصیدوں سے ظاہر ہے۔ امیر خسرو دہلوی نے تو اسے خاقانی پر بھی ترجیح دی ہے۔

اپنے استاد خاقانی کی طرح مجیر کی زندگی بھی تنگ دستی اور پریشان حالی میں گذری۔ اپنے ایک قصیدے میں اس نے اپنے مصائب و آفات اور دشمنوں کی خست اور طعنہ زنی کا ذکر کیا ہے وہ موت کو خود داری کے ترک یا احسان برداری پر ترجیح دیتا تھا جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے ؎

تا دست خوش جہاں شدم من | در دست قناعتم ممکن!
خود را بہ ہزار فن گسستم | از ہمدمیٔ جہان پُر فن
از خود ز برائے خود بسازم | مانندۂ عنکبوت مسکن
شبدوست ازاں شدم کہ در شب | خورشید نتابدم بروزن

ان اشعار سے شاعر کی خستہ حالی، دشمنوں کا حسد اور

لوگوں کی بے اعتنائی اور زمانے کی ستم گاری ظاہر ہے۔

سوال: نظامی گنجوی کی زندگی کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیجئے اور اس کے کلام کی گوناگوں خصوصیات لکھیئے:

جواب: مولانا نظام الدین ابو محمد الیاس بن یوسف گنجوی ۵۳۵ھ (۱۱۴۰ء) میں بمقام گنجہ (گرجستان) پیدا ہوئے۔ آج تک آپ کو افسانوی مثنوی لکھنے میں کوئی شاعر نہیں پہنچ سکا۔ آپ کا خمسہ یا پنج گنج فارسی شاعری کے لئے سرمایۂ صد افتخار ہے۔ آپ دنیا کے زندۂ جاوید شعرا میں سے ہیں۔ اور ان خوش نصیب باکمالوں کے زمرے میں شامل ہیں جن کی شہرت ان کی زندگی میں ہی چار دانگِ عالم میں پھیل گئی اور ان کے مرنے کے بعد دنیائے ادب میں ان کے نام کی عظمت روز افزوں ہوتی گئی۔

نظامی بچپن سے ہی والدین کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی بھی تھے۔ جو بڑے ہو کر فن شعر گوئی میں پایۂ استادی کو پہنچے اور جن کا ذکر کتابوں میں قوامی مطرزی کے نام سے آیا ہے۔ دونوں بھائیوں کی پرورش ان کے چچا نے اپنے ذمے لی لیکن ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ چچا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ بیچارے لاوارث بھائیوں کو سخت جدوجہد اور کلفت و مشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان واقعات کا نظامی کے مستقبل پر یہ اثر پڑا کہ دنیا کی بے ثباتی اور اس کی ناپائیداری اس کے دل پر نقش ہو گئی اور اسی غمگینی اور افسردہ خاطری کی

جھلک آپ کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔ انہی ابتدائی ایام میں نظامی نے اس علم، مشاہدے اور تجربات کا ذخیرہ جمع کیا۔ جس پر اس کی اولین تصنیف یعنی مخزن الاسرار دلالت کرتی ہے۔ شروع سے ہی نظامی کی طبیعت کا میلان تنہائی، خودداری، راست شعاری اور پاکیزہ روی کی طرف تھا۔ اخلاق کے لحاظ سے ایران کا کوئی شاعر بھی آپ کی گرد تک کو نہیں پہنچ سکتا ؎

گر از مے شدم ہرگز آلودہ کام — حلال خدا بر نظامی حرام

لیکن خوبی یہ ہے کہ درویش مشربی اور بے نیازی کے باوجود بھی آپ میں ذرہ بھر غرور یا ترش کلامی نہ آسکی۔ نظامی کے زمانے میں ایران و عراق میں بہت چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں اور ان کے فرمانروا علماء و شعراء کی تربیت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ اسی تحریک کے باعث شاعروں کی تعداد بڑھ گئی اور مدح سرائی معراج کمال پر پہنچ گئی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن نظامی نے خوشامد گوئی کو گوارا نہ کیا۔ وہ درباداری کے پاس سے بھی ہو کر نہ گذرے۔ انہیں شعر و شاعری کے مرتبے کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ اسے قصیدے لکھنے میں صرف نہیں کر سکتے تھے ؎

پردۂ رازے کہ سخن پروری ست — سایۂ از پردۂ پیغمبری ست

پیش و پسے بست صف کبریا — پس شعرا آمد و پیش انبیا

نظامی نے مرتے دم تک اپنے شاعرانہ وقار کو قائم رکھا اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دیا۔ مدح گو شعرا کی ضمیر فروشی کے خلاف

ایک ٹھوس جہاد کیا۔ اس لحاظ سے آپ کو ایرانی شعرا میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت حاصل ہے لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آپ نے شاعری کو اپنا واحد مشغلہ بنا لیا تھا۔ اس لئے چار و ناچار کسبِ معاش کی خاطر کسی مربّی کا دامن پکڑنا ہی پڑا۔ اسی خیال سے آپ نے اپنی بیش بہا مثنویوں کو کسی نہ کسی حاکمِ وقت کے نام سے معنون و منسوب کیا۔

آپ کے خمسہ پنج گنج یعنی پانچ مثنویوں کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ مخزن الاسرار۔ یہ نظامی کی اولین تصنیف ہے۔ علم الاخلاق اور تصوف سے تعلق رکھتی ہے۔ حدیقۂ سنائی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ ملک فخر الدین بہرام شاہ والیٔ ارزنگان کی خدمت میں پیش کی گئی اور ۵۷۵ھ میں لکھی گئی۔

۲۔ خسرو شیریں۔ فردوسی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اشعار کی تعداد لگ بھگ سات ہزار ہے۔ ۵۷۶ھ کے قریب مکمل ہوئی اور اتابک محمد پہلوان اور اس کے بھائی قزل ارسلان (اتابکان آذربائیجان) کے نام پر معنون کی گئی۔ یہ پہلا تاریخی شاہکار ہے جس نے نظامی کو افسانوی مثنوی لکھنے کے لئے مجبور کیا۔

۳۔ لیلیٰ مجنوں۔ ۵۸۴ھ میں لکھی گئی اور ابوالمظفر جلال الدین اخشستان والیٔ شروان کے نام سے منسوب کی گئی۔ اس میں کوئی چار ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ پس منظر ایران کی بجائے عرب میں رکھا گیا ہے البتہ قصے کے لوازمات کو ایرانی انداز سے نبھایا گیا ہے۔

۴۔ سکندر نامہ: اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے کا نام اقبال نامہ

ہے اور دوسرے کا نام ہے خرد نامہ۔ یہی دو حصّے سکندر نامہ بحری و بّری کے نام سے بھی مشہور و موسوم ہیں اور کوئی دس ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔ نظامی نے اس کتاب کی پہلی اشاعت کو ۵۸۷ھ میں اتابک عزیز الدین مسعود والیٔ موصل کے نام سے منسوب کیا اور دوسری ایڈیشن کو ۵۹۷ھ میں اتابک نصرۃ الدین ابوبکر حاکم آذربائیجان کی خدمت میں پیش کیا۔ سکندر نامہ برّی میں سکندرِ اعظم کو ایک تاریخی فاتح کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور سکندر نامہ بحری میں اُسے ایک فلسفی اور پیغمبر کے لباس میں آشکار کیا گیا ہے۔ اشعار میں جابجا رنگِ تصوف اور مسئلہ وحدت الوجود کی جھلک ہے۔

نظامی کی مثنوی سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ یہ مولانا نظامی کے سحر کلام کا ہی کرشمہ ہے کہ مدرسوں کے چھوٹے بچے بھی سکندرِ اعظم کے نام سے بخوبی واقف ہیں۔ ہندوستان میں اس کتاب کے جتنے فرہنگ اور شرحیں لکھی گئی ہیں شاید ہی کسی اور کتاب کی لکھی گئی ہوں۔ ایران اور افغانستان میں بھی سکندر نامہ داخلِ نصاب چلا آرہا ہے۔ سکندر نامہ بری کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

۵۔ ہفت پیکر یا بہرام نامہ: یہ مثنوی ۵۹۳ھ میں لکھی گئی۔ اس میں ساسانی بادشاہ بہرام گور کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں جو سات کہانیوں پر مشتمل ہیں۔ نظامی کی یہ آخری مثنوی ہے۔ اور اتابک نصرۃ الدین ابوبکر حاکم آذربائیجان یا علاؤ الدین کرپ ارسلان والیٔ مراغہ کے نام پر معنون ہے۔

خمسہ نظامی کی شہرت، مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا اندازہ

اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس کی تقلید میں بڑے بڑے اساتذۂ فن نے خمسے مرتب کئے اور اس پر فخر کیا۔ ان استادانِ سخن میں خواجو کرمانی امیر خسرو، جامی اور فیضی ایسے یکتائے روزگار شامل ہیں۔ یورپ میں بھی خمسہ نظامی کی مختلف مثنویاں اور ان کے ترجمے جابجا شائع ہوئے ہیں۔

خمسہ کے علاوہ نظامی کا ایک دیوانِ غزلیات بھی بتایا جاتا ہے، لیکن اس بیان کی صحت میں شک نظر آتا ہے۔ تذکروں میں بعض غزلیں نظامی کی طرف منسوب ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس غزلوں اور اخلاقی قصائد کے مجموعے میں کوئی بیس ہزار اشعار ہیں۔ عوفی صاحب "لب الالباب" کا یہ بیان کہ خمسہ کے سوا نظامی نے اور کوئی کلام نہیں چھوڑا زیادہ قرین صواب معلوم ہوتا ہے۔ نظامی کی تاریخ وفات کے متعلق ابھی تک مختلف محققین میں اتفاق نہیں۔ فی الحال اتنا ہی کہنے پر قناعت کرنی چاہیئے کہ آپ نے ۵۹۷ھ اور ۶۰۷ھ کے درمیان وفات پائی۔

نظامی کے کلام کو بڑے بڑے تنقید نگاروں اور اعلیٰ پایہ شاعروں نے سراہا ہے۔ تنقید نگاروں میں عوفی، قزوینی، دولت شاہ اور لطف علی آذر شامل ہیں۔ شاعروں میں سعدی، حافظ، جامی اور عصمت ایسے یگانۂ روزگار ہیں۔ نظامی کے کلام میں جو بات پائی جاتی ہے اس کی پیروی میں لکھنے والے شعرا کے یہاں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔

مولانا شبلی نے نظامی کے کلام کی یہ خصوصیات ذکر کی ہیں:۔

۱۔ جامعیت یعنی آپ واقعہ نگاری کے دوران میں کسی بھی تفصیلی بیان کو چھوڑ نہیں جاتے۔

۲۔ زور کلام یا جوش بیان۔

۳- بلاغت یعنی خوش بیانی اور رنگین ادائی۔
۴- جدتِ استعارات و تشبیہات۔
۵- ایجاد و اختراع اور قوت تخئیل
۶- اولیات یعنی بہت سی باتیں اول آپ نے ہی ایجاد کیں مثلاً پانچ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھنا، مخزن الاسرار میں پانچ نصیحتیں کہنا، فلسفیانہ مباحث کو نظم کرنا، قصیدہ کو مدح سے پاک کرنا وغیرہ وغیرہ۔

نظامی نے مثنوی کا ایک بالکل امتیازی ڈھانچہ قایم کر دیا ہے۔ اکثر شعرا آج تک آپ ہی کی ڈالی ہوئی روش پر گامزن ہیں۔ آپ نے مثنویوں کو بالترتیب ان عنوانوں سے شروع کیا ہے:

۱- توحید۔ ۲- مناجات۔ ۳- نعت و بیانِ معراج۔ ۴- مدحِ سلطان زماں۔ ۵- تعریفِ سخن و سخن وران۔ ۶- سببِ تالیف و تصنیفِ کتاب۔

نام کے لئے غزل کی بنیاد سعدی سے بھی بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ قدما کے بوڑھے غمزے تھے۔ بے شبہ غزل کے موجد سعدی ہیں لیکن غزل کی اصلی روح یعنی عشقیہ شاعری کی ایجاد نظامی کا خاص کارنامہ ہے ؎

فلک جز عشق محرابے ندارد جہاں بے خاکِ عشق آبے ندارد

نظامی کے کلام میں فلسفہ بھی جا بجا ملتا ہے ؎

سخن گو چوں سخن بیخود نہ گوید اگرچہ بد بگوید بد نہ گوید
نا لیدن مکن بر مردہ بیداد کہ مردہ صابری خواہد نہ فریاد

نظامی کی بلند اخلاقی اور پاک مشربی کا اندازہ ان دو اشعار سے ہو سکتا ہے ؎

خدا از عابدان آں را گزیند | کہ در راہِ خدا خود را نہ بیند
بتفریبے کہ از حد بیش کردم | خجالت را شفیعِ خویش کردم

عام خیال ہے کہ رزمیہ کے بیان میں نظامی کا کلام فردوسی سے کم پایہ ہے لیکن بزمیہ میں تو آپ نے نہایت دل افروز گل افشانیاں کیں۔ مثال کے طور پر شیریں کے متعلق فرماتے ہیں ؎

نبوسیدہ لبش را ہیچ ہستی | مگر آئینہ واں ہم بُد بہ مستی
نکردہ دست او با کس درازی | مگر با زلفِ خود واں ہم ببازی
لبے لاغر تر از موئش میانش | لبے شیریں تر از نامش دہانش

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خیالات اور اسلوبِ ادا کی رفعت کے لئے نظامی کسی حد تک فردوسی کے شرمندۂ احسان ہیں:

اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت میں بھی شک کی گنجائش نہیں کہ اپنے افراد کی ہو بہو تصاویر پیش کرنے ـ عشق و محبت کی کیفیات کا نقشہ اتارنے اور انسانی جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی کرنے کے اعتبار سے نظامی کے روبرو کسی اور شاعر کو کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ فردوسی اور نظامی کے مراتب اضافی کو سمجھنے کے لئے ہمیں مولانا شبلی کے مذکورہ ذیل الفاظ کی حیثیت کو بہت حد تک تسلیم کرنا ہو گا۔

ایشیائی شعرا کا عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی داستان کے بیان کرنے میں حسن و عشق کا کہیں اتفاقی موقع ہاتھ آ جاتا ہے تو اس قدر

پھیلنے ہیں کہ تہذیب و متانت کی حد سے کوسوں آگے تجاوز کر جاتے ہیں۔ نظامی اور جامی ایسے مقدس لوگ بھی اس حمام میں آکر ننگے ہو جاتے ہیں۔ لیکن فردوسی باوجود اس کے کہ اس کو تقدس کا دعویٰ نہیں ایسے موقعوں پر آنکھ نیچی کیئے ہوئے آتا ہے اور صرف واقعہ نگاری کے فرض سے ایک سرسری غلط انداز نگاہ ڈالتا ہوا گذر جاتا ہے۔"

فردوسی نکتہ سنجی۔ بلاغت شعاری، مضمون آفرینی اور خیال بندی کے تکلفات سے نہایت خوبی کے ساتھ عہدہ برا ہوا ہے۔ اس کے بزمیہ شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ترکیبیں بھی ہیں۔ وہ اپنے کیریکٹرز کے انداز خوب جانتا ہے۔ عشقیہ شاعری کا کمال دکھانے کے ساتھ ساتھ وہ متانت اور شائستگی کے سررشتہ کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ متاخرین بلکہ نظامی اور سعدی تک کو بھی اتنا سہارا ہاتھ آجاتا تو خدا جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے!

اس سے ہرگز ہرگز یہ خیال نہیں کر لینا چاہیئے کہ نظامی کے کلام میں شائستگی، تہذیب یا متانت نہیں ہے۔ بلکہ مقصد اس کا یہ ہے کہ فردوسی میں شائستگی اور متانت نسبتاً زیادہ ہے۔ یوں تو نظامی بھی اس زیور سے آراستہ ہے۔

سوال: سلجوقیہ عہد حکومت کے دوران فارسی نثر کی ترقی کا جائزہ پیش کیجئے۔

جواب: سلجوقی دور میں فارسی شاعری کی طرح فارسی نثر

نے بھی خوب ترقی کی۔ سلجوقی سلاطین و امرا اور سلجوقیوں کے ہمعصر حکمران وانابک شعرا اور ادبا کے سرپرست تھے۔ اس لئے انھوں نے نثر نگاروں کی بھی دل خواہ حوصلہ افزائی کی اور انعام واکرام عطا کئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس عہد میں بعض شاہکار وجود میں آئے جو فارسی ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

اس دور میں ہر قسم اور ہر موضوع کی تالیفات مرتب ہوئیں۔ تصوف، تاریخ، اخلاق، ادب، طب وغیرہ پر بلند پایہ تصنیفات وجود میں آئیں۔ غزنوی حکمرانوں کے علاوہ خوارزمشاہیوں نے بھی علم وادب کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

اس دور کی نثر عام طور پر سادہ اور رواں ہے۔ لفظی و معنوی تکلفات سے پاک ہے۔ عبارت سلیس اور صاف مگر فصیح اور پختہ ہے۔

تصوف کی کتابیں

۱۔ کشف المحجوب: اس کتاب کا مصنف ابوالحسن غزنوی ہے اور پانچویں صدی ہجری کے وسط میں لکھی گئی۔ یہ اخلاقی اور صوفیانہ مضامین پر مشتمل ہے۔ صوفیوں کے عقائد کو فصیح زبان میں بیان کیا گیا ہے، فارسی نثر کا عمدہ اور قابل قدر نمونہ ہے۔ کہیں کہیں عربی اشعار اور عربی جملات بھی موجود ہیں۔

۲۔ تذکرۃ الاولیا: یہ بھی ایک بلند پایہ تصنیف ہے جس میں صوفیوں کے عقائد واقوال کو بیان کیا گیا ہے۔ صوفی بزرگوں کے

صفات اور مقامات کا حال بھی درج ہے۔ صوفیانہ مضامین کو دلچسپ حکایات اور دلکش نصیحتوں کے رنگ میں ادا کیا گیا ہے۔ طرزِ بیان بہت موثر اور پُرزور ہے لیکن عبارت آسان اور سادہ ہے۔ اس کتاب کی تالیف پر کشف المحجوب کا اثر صاف صاف ظاہر ہے۔ دونوں میں نہ صرف طرزِ بیان میں بلکہ معانی و مطالب میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس تصنیف کے مصنّف شیخ فرید الدّین عطّار ہیں۔ یہ کتاب ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں تالیف ہوئی۔

۳۔ اسرار التوحید :۔ یہ تصوف پر ایک قابل قدر تصنیف ہے۔ اس کا لکھنے والا محمد بن منور ہے جس کا سلسلۂ نسب شیخ ابو سعید ابو الخیر سے ملتا ہے۔ اس کتاب کا طرزِ تحریر سادہ اور شیریں ہے۔ یہ کشف المحجوب کے سو سال کے بعد لکھی گئی۔ اس میں شیخ ابوسعید ابوالخیر کے حالات، اقوال، عقاید اور کرامات کا ذکر ہے۔ ضمنی طور پر اس میں صوفیانہ حکایات اور اشعار بھی آ گئے ہیں۔ شیخ ابوسعید کی مناسبت سے کئی دوسرے ہمعصر صوفیا اور علما کا حال بھی مذکور ہے۔

تاریخی کتب

۱۔ زین الاخبار : یہ قدیم تاریخی تصنیف ہے۔ اس کا مصنّف ابوسعید عبدالحی بن ضحاک بن محمود ہے۔ یہ آدمی گردیز کا باشندہ تھا جو غزنہ سے ایک دن کی مسافت پر واقع تھا۔ یہ کتاب سلطان

محمود غزنوی کے بیٹے عبد الرشید کے عہد حکومت میں تالیف ہوئی۔
اس میں مصنّف کے زمانے تک کی تاریخ ایران (مختصراً) ظہورِ
اسلام کے بارے میں اور خلفا کی تاریخ اور واقعات کا بیان ہے۔
سامانی اور غزنوی خاندانوں کی تاریخ کے مطالعہ میں یہ کتاب بڑی
اہمیت کی حامل ہے۔

۲۔ تاریخ بیہقی۔ اس تاریخی شاہکار میں غزنوی خاندان کے
حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ چونکہ اس کے مصنّف ابوالفضل
بیہقی نے اکثر مذکورہ واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لئے
اس کی اہمیت اور قدر و قیمت میں کوئی شک نہیں۔ مصنّف نے
لگ بھگ بیس سال غزنوی دربار کے دیوانِ رسائل میں منشی گیری
کے فرائض انجام دیئے تھے۔ اس لئے وہ حکومت کے کئی مخفی معاملات
سے بھی واقف تھا۔

تاریخ کی قدر و منزلت اس وجہ سے بھی بڑھ گئی ہے کہ مصنّف
ایک اعلیٰ پایہ نثر نگار تھا۔ اس نے یہ کتاب نہایت فصیح اور پُر زور
مگر شستہ، سادہ اور ادبی زبان میں لکھی ہے۔ بیان واقعات
کے ضمن میں کہیں کہیں مناسب حال اور مفید مطلب اشعار بھی
استعمال کئے ہیں۔ اس لئے یہ کتاب فارسی نثر کے شاہکاروں
میں شمار ہوتی ہے۔

اس کتاب کی تیس جلدیں تھیں لیکن صرف چند جلدیں باقی
ہیں بیشتر ناپید ہو چکی ہیں۔ جو جلدیں زمانے کی دستبرد سے بچ گئی ہیں
وہی تاریخ بیہقی کے نام سے مشہور ہیں۔

جو جلدیں محفوظ ہیں ان میں سلطان محمود کے بیٹے سلطان مسعود کے حالات درج ہیں۔ اس لحاظ سے اسے تاریخ مسعودی بھی کہتے ہیں۔ مصنف حق پسند، نیکوکار اور انصاف پرور شخص تھا۔ اس لئے اس نے واقعات کے بیان میں جھوٹ یا مبالغہ سے مطلق کام نہیں لیا۔ بطور ایک مورخ کے اس نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔

۳۔ مجمل التواریخ والقصص۔ اس کتاب کا مصنف ابو الحسن علی بن زید بیہقی ہے۔ یوں تو اس میں ابتدائے دنیا سے ۵۲۰ھ (سنِ تالیف کتاب) تک کے واقعات اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن ایران کی تاریخ کا خاص ذکر ہے۔ تاریخ کے ضمن میں جا بجا داستانوں اور قصے کہانیوں سے کام لیا گیا ہے جس سے اس کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے وسط میں تالیف ہوئی۔ اس میں ولایت بیہق کی تاریخ اور اس علاقے کے بزرگوں، عالموں اور حکیموں کے حالات مندرج ہیں۔ ان بزرگوں میں ابو الفضل بیہقی بھی شامل ہے۔

۴۔ راحت الصدور۔ راحت الصدور ایک بلند پایہ تاریخ ہے۔ اس کا مصنف ابو بکر محمد راوندی ہے جو کاشان سے قریب موضع راوند کا رہنے والا تھا۔ راحت الصدور میں سلجوقیوں کے حالات اور واقعات مذکور ہیں۔ اس کتاب میں سلجوقی خاندان کی مکمل تاریخ ابتدا سے آخر تک بیان کی گئی ہے۔ ابو بکر محمد سلجوقیہ خاندان کے آخری حکمران طغرل بن ارسلان کی خدمت میں رہ چکا تھا۔ اور سلجوقی دربار سے بخوبی واقف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کی تاریخی

اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے آخر میں لکھی گئی اور روم کے سلجوقی حکمران کیخسرو بن قلج ارسلان کے نام پر معنون کی گئی۔ شاہی دربار میں راوندی کو بلند درجہ اور عزت حاصل تھی۔

تاریخی اہمیت کے علاوہ اس کتاب کی ادبی حیثیت بھی قابلِ قدر ہے۔ اس میں کئی شاعروں اور عالموں فاضلوں کے نام مذکور ہیں۔ اور ان کے اشعار اور قصیدے بھی نقل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں عربی امثال بھی جا بجا ملتی ہیں۔

راوندی کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ اس نے راحت الصدور میں اپنے کئی قصیدے کیخسرو اور قلج ارسلان کی مدح میں دیئے ہیں۔

ادبی، اخلاقی اور طبّی کتب

(۱) چہار مقالہ۔ عہد سلجوقیہ کے وسطی زمانہ کو چہار مقالہ پر بجا طور سے ناز ہے۔ اس کتاب کا لکھنے والا ابوالحسن احمد سمرقندی ملقب بہ نظامی عروضی ہے۔ یہ ماوراءالنہر کے شاہانِ غور کے دربار میں ۴۵ سال تک فارسی نثر اور نظم کی خدمت کرتا رہا۔ اس نے ۵۶۰ھ کے پس و پیش میں مجموع النوادر اور کتاب چہار مقالہ حکمت علمی اور آدابِ خدمت ملوک میں لکھی۔ چہار مقالہ اصل میں دبیری، شاعری، نجوم اور طب کے اربابِ فن کا ایک پُر حکمت اور سیر حاصل تذکرہ و تبصرہ ہے۔ اس میں ایک دیباچہ اور چار باب ہیں۔ ہر باب میں نہایت دلچسپ حکایتیں اور اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ تاریخی

نقطۂ نگاہ سے چہار مقالہ مستند ترین کتابوں میں سے ایک ہے اگرچہ ادھر اُدھر مصنّف کے بیانات میں شکوک کی گنجایش ہے۔ یہ کتاب غزنوی شہزادے ابوالحسن حسام الدین علی کے نام سے منسوب کی گئی۔
عروضی نہ صرف فارسی انشاپردازی کا استاد تھا بلکہ خود شعر بھی کہتا تھا اور عالم و فاضل تھا۔ اس کتاب میں چونکہ بہت سے شعرا اور علما وادبا کے حالات مذکور ہیں اور ان میں سے بیشتر شعرا اور علما مصنف کے قریب العہد تھے یا ہمعصر تھے اس لئے اس تصنیف کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔
۲۔ مقامات حمیدی۔ یہ کتاب مسجع عبارت آرائی کی وجہ سے بہت شہرت رکھتی ہے۔ اس کا مصنف حمید الدین ابوبکر بن محمود ہے جو بلخ کا رہنے والا تھا اور شہر کا مشہور قاضی تھا۔ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے وسط میں لکھی گئی۔ حمید الدین کی فضیلت اور علمیت کی تعریف بڑے بڑے شاعروں نے کی ہے۔ مثلاً انوری نے اپنے اشعار میں اس کی مدح کی ہے ۔۔ اور اُسے ایک بلند پایہ ادیب کا درجہ دیا ہے یہ کتاب ۲۳ مقامات پر مشتمل ہے اور اس میں ادبی مباحث و مناظرات اور مطائب و چیستان درج ہیں۔
۳۔ حدائق السحر: اس کتاب کا مصنف مشہور قصیدہ گو شاعر رشید الدین وطواط ہے۔ کتاب کا پورا نام حدائق السحر فی دقائق الشعر ہے۔ اس میں صنائع لفظی و معنوی کا بیان ہے اور فارسی زبان میں اس موضوع پر یہ قدیم ترین دستیاب تصنیف ہے۔ یہ کتاب درحقیقت فرخی کی کتاب ترجمان البلاغت پر لکھی گئی تھی جو ناپید ہے، حدائق السحر

فصیح و بلیغ زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس میں عربی اور فارسی نظم و نثر کی امثلہ دی گئی ہیں۔

۴۔ مرزبان نامہ۔ یہ کتاب کلیلہ و دمنہ کی طرز پر لکھی گئی ہے اور اس میں کئی قسم کی حکایات اور قصص مذکور ہیں۔ اس کا مصنف خاندان باوندیان کا حکمران مرزبان بن رستم بن شروین تھا جس نے اسے قدیم طبرستانی زبان میں تالیف کیا تھا۔ بعد ازاں ساتویں صدی کے شروع میں ملشی سعد الدین وراوینی نے اسے ادبی فارسی زبان میں منتقل کیا۔ یہ آذربائجان کا رہنے والا تھا۔ اصلی طبرستانی ایڈیشن چوتھی صدی ہجری کے آخر میں شائع ہوئی تھی۔

۵۔ کیمیائے سعادت۔ اس کتاب کا مصنف مشہور ادیب امام غزالی ہے جس نے اسے پانچویں صدی ہجری کے آخر میں تالیف کیا۔ اس کتاب کا موضوع دین و اخلاق ہے۔ کیمیائے سعادت دراصل مصنف کی عربی تصنیف احیا العلوم کا فارسی زبان میں خلاصہ ہے۔ اس میں اسلام کی تعلیمات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور اخلاق و مذہب اسلام پر بہترین اور مستند ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

۶۔ سیاست نامہ۔ خواجہ ابوعلی نظام الملک طوسی مشہور سلجوقی بادشاہوں کا وزیر اس کتاب کا مصنف ہے۔ اس کے ادبی مذاق اور غیر معمولی ذہانت نے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے گوناگوں فرائض کے باوجود کسی ادبی خدمت کے لئے وقت نکالے۔ چنانچہ اس نے فن حکومت کے موضوع پر سیاست نامہ کے نام سے ایک قابل قدر

کتاب لکھی۔ اس کتاب میں حکمرانی کے جو اصول اور نظریات درج ہیں ان کی بنیاد قابل مصنف نے اپنی تاریخی معلومات اور وسیع تجربات پر رکھی۔

سیاست نامہ کے پچاس ابواب ہیں۔ ان ابواب میں ہر قسم کے شاہی فرائض اور حقوق امتیازی کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے حکومت کے ہر ایک محکمے کے متعلق پُراز معلومات بحث کی گئی ہے اس کتاب کی تصنیف کے متعلق مشہور ہے کہ ملک شاہ نے اپنے قابل مشیروں کو سیاست علمی و عملی کے متعلق ایک مستند ترین کتاب لکھنے کو کہا۔ اس فرمائش کی تعمیل میں نظام الملک نے یہ معرکتہ الآرا شاہکار ۹۲-۱۰۹۱ء میں یعنی اپنی ہلاکت کے تھوڑا ہی عرصے پہلے پیش کیا تھا۔ پروفیسر براؤن سیاست نامہ کو فارسی نثر کی مفید ترین اور دلچسپ ترین کتابوں میں شمار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں بہت سا دلچسپ تاریخی مواد ہے اور کہ ایک ایسے عظیم المرتبت وزیراعظم کے سیاسی خیالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں جس پر مشرق کو بجا طور سے ناز ہو سکتا ہے۔ سیاست نامہ کا انداز تحریر نہایت سادہ و صنائع و بدائع سے پاک اور حقیقت حال کا پورا پورا ترجمان ہے۔ بعض اوقات تو سیاست نامہ یا سیر الملوک کا مصنف تصنع سے بچتا بچتا قدیم اندازِ بیان کی الجھن میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ سات باب ملحدوں کا ذکر کرنے کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ خاص کر فرقہ باطنی اور فرقہ اسماعیلی کو بہت کوسا گیا ہے۔ یہ باب نہایت دلچسپ ہیں۔ نظام الملک کی رائے میں چھوٹے

چھوٹے فرقوں اور طبقوں کا وجود سلطنت کی طاقت اور اقتدار کو ضعف کی طرف لے جاتا ہے۔ مصنف شیعوں کے خلاف نہایت پُرجوش استدلال کرتا ہے اور ان میں سے بعضوں پر پیغمبر نما کمیونسٹ مزدک کے عقاید و نظریات کی پیروی کا الزام دھرتا ہے (مزدک ساسانی بادشاہ قبادؔ کے وقت میں ایک بڑا فصیح و بلیغ شخص گذرا ہے۔ اس نے ایک نیا مذہب نکالا تھا)

سیاست نامہ نہایت اہتمام کے ساتھ سنہ ۹۷-۱۸۹۱ء میں بمقام پیرس چھپ چکا ہے۔

۶۔ قابوس نامہ۔ قابوس نامہ کا مصنف زیاری حکمران قابوس بن وشمگیر کا پوتا کیکاؤس بن اسکندر تھا۔ جس کا لقب عنصر المعالی تھا۔ اس نے سنہ ۴۱۲ھ میں ولادت اور سنہ ۴۷۵ھ کے بعد وفات پائی۔ قابوس نامہ سنہ ۴۷۵ھ میں لکھا گیا۔ کتاب کسی حد تک سیاست نامۂ نظام الملک کا جواب ہے۔ کیکاؤس نے یہ مشہور زماں کتاب اپنے بیٹے گیلان شاہ کے استفادہ کے لئے لکھی۔ اس میں کل چوالیس باب ہیں جو حکمت عملی، تدبیر منزل، سیاست مدن، تدبیر شاہی اور نصائح اخلاقی کے سے مفید مضامین پر مشتمل ہے۔ بحث کی تاثیر اور دلکشی کے چمکانے کو قابل مصنف نے ایران کی نامور ہستیوں ہوشنگ، جمشید، لقمان اور نوشیروانِ عادل کے سے ارباب تدبیر و تدبر کی حکمت عملی کا سہارا لیا ہے۔

قابوس نامہ میں دلچسپ اور حکمت آمیز کہاوتوں کی بھرمار ہے۔ زبان نہایت فصیح، رواں اور بے تکلّف ہے۔ یہاں تک کہ

فارسی نثر کی بہت تھوڑی کتابیں اس شاہکار کی سطح پر رکھی جا سکتی ہیں۔

سوال: حجۃ الاسلام امام غزالی کی زندگی اور ادبی خدمات پر مختصر نوٹ لکھیئے۔

جواب۔ آپ ۱۰۵۸ء اور ۱۰۶۰ء کے درمیان یعنی الپ ارسلان کی تخت نشینی کے لگ بھگ طوس کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ آپ کے باپ کا ایک صوفی دوست تھا جس نے آپ کی تعلیم و تدریس شروع کی۔ پھر آپ طوس کے ایک کالج میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد امام ابونصر الاسماعیلی کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کیا۔ پھر نیشاپور گئے جہاں آپ کے مضامین خاص و عام کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے لگے ۱۰۹۱ء و ۱۰۹۲ء میں نظام الملک نے آپ کو نظامیہ کالج بغداد میں ایک پروفیسر کی حیثیت سے لے لیا۔ آپ نے خانہ کعبہ کا حج کیا اور وہاں سے شام پہنچے۔ جہاں آپ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف احیاء العلوم الدین مکمل کی۔ یہ کتاب عربی زبان میں تھی۔ بعد میں آپ نے اسے اختصار کے ساتھ کیمیائے سعادت کے نام سے فارسی زبان میں ڈھالا۔ ازاں بعد طوس کی طرف مراجعت کی۔ ۱۱۱۱ء میں وفات پائی۔

آپ کی متعدد تصانیف میں سے بعض فرقۂ اسماعیلیہ یا باطنی کے خلاف استدلال سے لبریز ہیں۔

آپ کو اہلِ اخلاق، اہل کلام اور اہل تصوف کے زمرے میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ احیاء العلوم الدین دینیاتِ اسلام

کا ایک جامع اور مکمل ذخیرہ ہے۔ مصنف کے عقائد و نظریات تصوف کی طرف مائل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود الغزآلی نے دینِ مبین کے بنیادی اصولوں کی جو دقیق اور بلیغ وضاحت کی ہے اس نے اس کے لئے حجت الاسلام کا لقب حاصل کر لیا ہے، بلکہ السیوطی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر حضرت محمدؐ کے بعد کوئی پیغمبر ہو سکتا تو یقینی طور پر وہ الغزآلی ہوتا۔

الغزآلی نے تصوف کی ایک بے نظیر خدمت کی ہے صوفی شعراء نے جن تعلیمات کو اس خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ ان کی ترتیب و تدوین کا سہرا الغزآلی کے سر ہے۔ اُس زمانہ میں امام غزالی کی بدولت فلسفہ، منطق اور علم کلام نصاب میں شامل ہو گیا تھا۔ اور ان علوم کی تعلیم علمائے معقولین کے دائرہ سے نکل کر عام ہو گئی تھی۔ شیخ ابو علی فارمدی جو امام غزآلی کے پیر تھے حکیم سنائی کے دادا تھے اس رشتے سے سنائی امام غزالی کے بھتیجے تھے۔ یہ بھی اس بات کا سبب ہوا ہو گا کہ سنائی کو علم کلام کے ساتھ لگاؤ تھا۔ چنانچہ صوفیانہ مسائل کے ساتھ علم کلام کے دلائل بھی درج کرتے ہیں۔

سوال: خوارزم شاہان اور ان کے کارناموں پر مفصل نوٹ لکھیے۔

جواب: سلطان سنجر کے عہد میں سلجوق اقتدار کا شدید مقابلہ کرنے والی تین طاقتیں تھیں:۔

۱۔ خاندان غور جس نے شاہان غزنی کی گھٹتی ہوئی طاقت کا

خاتمہ کردیا۔

۲۔ فرقہ اسماعیلیہ یا ملاحدہ۔ جس کی طاقت ایران اور شام میں روز بروز ترقی کرتی گئی۔

۳۔ خاندان خوارزم شاہان جس نے سلجوقیوں کی طاقت پر کاری ضرب لگائی۔ خوارزم کا علاقہ دریائے جیحوں کے کنارے بحیرہ اسود تک پھیلا ہوا ہے۔ اسے خیوا بھی کہتے ہیں۔ اس کا کچھ حصہ ایرانی سلطنت کے ساتھ ملحق تھا۔ کچھ حصے پر توران (پارتھیا) کا تسلط تھا۔ خوارزم پر حکومت کرنے والے ہر بادشاہ کو اور خاص کر علاء الدین محمد (سنہ ۱۲۰۰ء تا سنہ ۱۲۲۰ء) کو خوارزم شاہ کے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔ ان بادشاہوں کا سلسلہ ملک شاہ کے ایک غلام انوشتگین سے سنہ ۱۰۷۷ء میں شروع ہوتا ہے۔

اتسز کی تخت نشینی (سنہ ۱۱۲۷ء) کے بعد خوارزم شاہی سلطنت کی طاقت روز افزوں ہونے لگی۔ اتسز نے سنہ ۱۱۴۰-۴۱ء میں خود مختاری کا اعلان کر کے سنجر کے خلاف بغاوت کر دی۔ سنجر کو شکست فاش ہوئی۔ ابن الاثیر لکھتا ہے کہ سنجر کی یہ پہلی شکست تھی اور شدید ترین تباہیوں کی تمہید اس میں مضمر تھی۔

رشید الدین محمد وطواط بلخی صاحب "صد کلمہ" "حدائق السحر" اسی اتسز کا درباری شاعر اور صاحب دیوان تھا۔ سنجر کے مشہور شاعر ادیب صابر کو بھی اسی اتسز نے بقول دولت شاہ سمرقندی سنہ ۱۱۵۱-۵۲ء میں دریائے جیحوں میں ڈبوا دیا تھا اس لئے کہ ادیب صابر نے سنجر کو اس سازش کی اطلاع دے دی تھی جو

آتسز کے ایک کارندے نے سنجر کو قتل کرنے کی غرض سے سوچ رکھی تھی۔

تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اتسز کا پڑپوتا علاء الدین محمد خوارزم شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ سلجوقی طاقت تو ایک مدت سے ختم ہو چکی تھی۔ خوارزمشاہی طاقت پورے جوبن پر آ گئی۔ لیکن عباسی خلیفہ الناصر اور محمد خوارزم شاہ کی باہمی کشمکش اسلام کے اقتدار پر اثر انداز ہونے لگی۔

آخر چنگیز خاں کے خونیں حملوں کی آفت (۱۲۱۹ء تا ۱۲۲۷ء) ایران پر نازل ہوئی۔ ان حملوں کے دوران کفر شعار دشمنوں کے خلاف اسلام کے آخری محافظ خوارزم شاہ جلال الدین منکوبرنی بن سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ آج تک اہلِ تذکرہ تعریف کرتے ہیں۔

سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے سوانح نگار اور صاحب دیوان النسوی نے اپنے تذکرے میں سلطان جلال الدین کے حالات عربی زبان میں قلم بند کئے ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۲۴۱-۴۲ء میں مکمل ہوا۔ تاریخ جہانکشائے جوینی میں بھی سلطان جلال الدین کے کارناموں کا ذکر آتا ہے۔ اس تاریخ کی دوسری جلد حالات و واقعاتِ خوارزم شاہان کے لئے وقف ہے۔

ذخیرہ خوارزمشاہی عہدِ خوارزم شاہان کی مشہور یادگار ہے۔ یہ کتاب علمِ طب کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جسے زین العابدین ابوابراہیم اسماعیل الجرجانی نے بارھویں صدی عیسوی کے

آغاز میں مرتب کیا۔ اور اتسنر کے باپ قطب الدین خوارزمشاہ کے نام پر معنون کیا۔ یہ کتاب حقیقت میں شیخ ابو علی سینا کے شاہکار کا فارسی زبان میں خلاصہ ہے۔

سوال۔ تصوف کی تعریف و توضیح کیجئے اور فارسی شاعری میں اس کی اہمیت بیان کیجئے۔

جواب۔ تصوف صوفیوں کے مذہب کا نام ہے۔ یعنی وجدان ذوق اور مشاہدہ اہلِ تصوف کو صوفی اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے دل صاف ہوتے ہیں یا اس لئے کہ وہ صُوف کے کپڑے پہنتے ہیں۔ انگریزی میں تصوف کو THEOSOPHY یا MYSTICISM کہتے ہیں۔ تھیوسوفی کی تعریف یہ ہے۔

"THE KNOWLEDGE OF DEITY OBTAINED BY SPIRITUAL ECSTASY, DIRECT INTUITION OR DIVINE ILLUMNATION"

اہلِ فلسفہ کے نزدیک تمام چیزوں کے ادراک کا ذریعہ حواس ظاہری ہیں۔ لیکن اربابِ تصوف کے نزدیک ان سب کے علاوہ ایک اور حاسۂ باطنی ہے جو مشق اور ریاضت سے پیدا ہوتا ہے اس حاسہ سے کشف، مشاہدہ یا الہام پیدا ہوتا ہے۔ عالمِ غیب یعنی خدا، ملائکہ، آخرت، بہشت، دوزخ کے متعلق اہلِ شریعت اور فلسفہ جو کچھ جانتے ہیں قیاس اور استدلال کے ذریعہ سے جانتے ہیں۔ لیکن صوفی جانتا نہیں بلکہ دیکھتا ہے۔ تصوف میں ایک حالت

طاری ہو جاتی ہے جس سے خود بخود اخلاق پیدا ہوتے ہیں تصوف میں فلسفہ بھی شامل ہے تصوف کے مسائل یہ ہیں:۔

وحدت وجود یعنی ہمہ اوست تصوف کی اصلی بنیاد علم باطن یعنی تزکیۂ نفس ہے۔ کشفِ حقایق اور عشق حقیقی تصوف کا خمیر ہے ارباب حال کے نزدیک ذات باری کا وجود کسی استدلال کا محتاج نہیں بلکہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں اُسی محبوب روحانی کی جھلک ہے۔ تزکیہ نفس اور مجاہدہ سے روح کو ایک اور ادراکِ غیبی حاصل ہوتا ہے۔ عرفانِ الٰہی کا یہی ذریعہ ہے۔ سالک کے لئے آخری منزلِ مقصود "فنا فی اللہ" ہے۔ صوفیا فنا کو بقا کا دیباچہ جانتے ہیں۔ عارف جس حالت میں بھی اُسے قیدخانہ اور حبس سمجھتا ہے۔ وہ ہر وقت اس حالت سے آگے ترقی کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ اگر عشقِ حقیقی دل و دماغ کی وسعتوں پر چھا جائے تو اس کے مقابلہ میں ذکر و تسبیح بیکار ہے۔ صوفی کی سرشت کا تقاضہ ہے کہ وہ بے اختیار ہو کر لطف الٰہی کی خواہش یا عتابِ ربانی کے ڈر کے بغیر پاکیزہ ترین زہد و عبادت میں مستغرق رہے۔ روح ایک ازلی و ابدی جوہر ہے جو اپنے عوارض کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ انسان خود ہی تمام عالم اور صانع عالم کا مظہر ہے۔ وہ خود کو جان لے تو گویا اس نے صانع ازل اور اس کی صنعت کے حقائق کو جان لیا۔ کائنات کے اسرار معلوم نہیں ہو سکتے اور پھر بہت سے اسرار ایسے ہیں کہ ان سے پردہ اٹھانا خلافِ مصلحت ہے۔ صوفی کا مسلک رسوم و قیود اور زمان و مکان

کی حدود سے بالاتر ہے۔ صوفیا خدا کی رضا میں راضی رہتے ہیں۔ تسلیم و قناعت ان کا شیوۂ اولین ہے۔ ارباب تصوف انسان کی قوتِ خیر کو فرشتہ اور اس کی قوتِ شر کو شیطان تصور کرتے ہیں۔

فارسی ادب میں تصوف کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ہم جناب شبلی نعمانی، ڈاکٹر براؤن، پروفیسر نکلسن، دین شاہ جے ایرانی، لیوی اور ایسے ہی دوسرے اربابِ تنقید کی ادبی کاوشوں کے علاوہ صوفی شاعروں کے تذکروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔

بقول شبلی "فارسی" شاعری اس وقت تک قالب بے جان تھی جب تک اس میں تصوف کا عنصر شامل نہیں ہوا۔ شاعری اصل میں اظہار جذبات کا نام ہے۔ تصوف سے پہلے جذبات کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ قصیدہ مداحی اور خوشامد کا نام تھا۔ مثنوی واقعہ نگاری تھی۔ غزل زبانی باتیں تھیں۔ تصوف کا اصلی مایۂ خمیر عشقِ حقیقی ہے۔ جو سرتاپا جذبہ اور جوش ہے۔ عشقِ حقیقی کی بدولت عشقِ مجازی کی بھی قدر ہوئی اور اس آگ نے تمام سینہ و دل گرما دیئے۔ اب زبان سے جو کچھ نکلتا تھا گرمی سے خالی نہ تھا۔ اربابِ دل ایک طرف، اہلِ ہوس کی باتوں میں بھی تاثیر آگئی۔ سب سے پہلے صوفیانہ خیالات حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر نے ادا کئے۔

اس زمانے تک تصوّف کے حقائق اور مسائل شاعری سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ صرف عشق اور محبّت کے جذبات تھے لیکن ان کا مخرج چونکہ عشقِ حقیقی تھا اس لئے تصوف کا رنگ

جھلکتا تھا۔ سلطان صاحب کے بعد حکیم سنائیؔ نے اس باغ کی آبیاری کی۔ سنائیؔ پر امام غزالیؔ کا فلسفہ، منطق اور علمِ کلام بھی بہت حد تک اثر انداز ہوا۔

ایرانی تصوف کا تعلق یونانی، ہندوستانی اور عرب فلسفہ واخلاق کے ساتھ ہے۔ تصوف میں جو فلسفہ بتدریج رونما ہوا اس میں جدید افلاطونی فلسفہ کا عنصر غالب ہے۔ وان کریمر کا عقیدہ ہے کہ اصلی تصوف کی بنیاد حقیقتاً ہندوستانی فلسفہ خاص طور پر ویدانت پر ہے۔

فارسی شاعری میں تصوف کی ترقی کا ایک بڑا سبب تاتاریوں کا ہنگامہ تھا۔ اُس نے تمام اسلامی دنیا کو زیروزبر کر دیا۔ مشرق سے مغرب تک سناٹا چھا گیا۔ تصوف کی بنیاد دنیا و مافیہا کی بے قدری اور بے حقیقی پر ہے۔ یہ سب کچھ آنکھوں سے نظر آ گئی۔ اس حالت میں جو دل متاثر اور قابل تھے ان کو خدا سے لو لگی۔ انابت، خضوع، تضرع، رضا بالقضا، توکل جو تصوف کے خاص مقامات ہیں خود بخود دل پر طاری ہوئے۔ بڑے بڑے صوفی شاعر مثلاً سعدیؔ، اوحدیؔ اور عراقیؔ سب انہیں اسباب کے نتائج ہیں۔

ایک اور بڑا سبب صوفیانہ شاعری کی ترقی کا یہ ہوا کہ تصوف میں ابتدا سے ہی اخلاق کے مسائل شامل ہو گئے تھے کیونکہ اخلاق کو تصوف سے ایک خاص تعلق ہے۔ اخلاق کا فن اسی زمانہ میں نہایت وسیع ہو گیا تھا۔ احیاء العلوم (امام غزالی) نے اس فن کے دقیق اسرار عام کر دیئے تھے۔ محقق طوسی نے اخلاق ناصری میں ارسطو کے اخلاق ادا کیے۔ اس کے اثر سے اخلاق کا ایک

سرمایہ مہیا ہو گیا اور یہ سب تصوّف کے حصّے میں آیا۔ چھٹی صدی ہجری میں فلسفہ کو عام رواج ہوُا اور مذہبی گروہ میں بھی فلسفہ کی کتابیں درس میں داخل ہو گئیں۔ چنانچہ اس دور کے جس قدر مذہبی علما ہیں فلسفہ سے بھی آشنا ہیں۔

صوفیا کے گروہ میں مولانا رومؔ اور شیخ محی الدین اکبر فلسفہ کے پورے ماہر تھے۔ اس لئے خود بخود ان کی تصنیفات میں فلسفہ کا امتزاج ہو گیا۔ تصوف کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی سرحد فلسفہ سے ملتی ہے۔ ان اسباب سے صوفیانہ شاعری کی وسعت اور گہرائی بڑھ گئی۔

تصوف نے فارسی ادب کو مداحی سے پاک اور مہذب زبان اور لطیف استعارات سے رنگین کر دیا ہے۔ فلسفہ، اخلاق عشق حقیقی۔ نئے الفاظ، اصطلاحات اور تلمیحات بھی دراصل تصوف ہی کی راہ سے فارسی ادب میں داخل ہوئے ہیں۔ عزتِ نفس اور بلند خیالی تصوف ہی کے نتائج ہیں۔ تصوف نے اخلاق کو گبر و مسلمان کے جھگڑوں بکھیڑوں سے بھی پاک کیا۔

ذیل کے نامی گرامی شعرا و ادبا کی شاعری تصوف اور اخلاق کے مضامین سے لبریز ہے۔

سلطان ابو سعید ابو الخیر، حکیم سنائی، امام غزالی، اوحدالدین کرمانی، اوحدی اصفہانی، خواجہ فرید الدین عطار، عراقی، سعدی، مولانا رومؔ، شیخ محی الدین اکبر، محمود شبستری، امیر خسرو اور حسن دہلوی، مغربی تبریزی، شاہ نعمت اللہ، قاسم الانوار، عبدالرحمن جامی

خواجہ حافظ، عرفی، نظیری، محتشم، شفائی۔

تصوف کی مذکورہ ذیل تصنیفات کو فارسی ادب میں نہایت ممتاز مقام حاصل ہے :-

حدیقتہ الحقیقت اور سیر العباد (حکیم سنائی) مصباح الارواح (اوحد الدین کرمانی) جام جم (اوحدی اصفہانی) منطق الطیر (خواجہ فرید الدین عطار) احیاء العلوم (امام غزالی) اخلاق ناصری (محقق طوسی) مثنوی (مولانا روم) گلشن راز (محمود شبستری) رباعیات ابوسعید ابو الخیر وغیرہ۔

منگول اور تیموری دَور

سوال: منگول حملے اور خلافت بغداد کی تباہی کے ایران کی ادبیات اور تمدن پر اثرات واضح کیجیے۔

جواب: منگول حملے کی وحشت اور بربریت کی مثال تاریخ عالم میں بہت کم ملے گی۔ چنگیز خاں، ہلاکو خاں اور تیمور جب اپنے لشکر کے ساتھ بڑھے اور ایران پر حملہ آور ہوئے تو انھوں نے خوفناک تباہی مچائی۔ ایسی درندگی کا ثبوت دیا کہ اس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے جتنے شہر اور دیہات راستے میں آئے سبھی کو آگ کی نذر کر دیا۔ قتل عام اور غارت گری کا بازار گرم کیا۔ بے دریغ عورتوں اور معصوم بچّوں کو تلوار کی گھاٹ اتار کر کٹے ہوئے سروں سے مینار کھڑے کیے۔ ان ظالموں اور آدم خوروں نے بےگناہوں کے خون سے اپنی پیاس بجھائی۔

باوجود اس ستم گری کے ایران کی روح فنا نہیں ہوئی۔ ان کی تہذیب اور تمدن وحشی اور جاہل حملہ آوروں پر غالب آیا اور وقت گذرنے کے ساتھ ان میں تہذیب و تمدن پیدا کیا۔ جتنے بھی منگول ایران میں آباد ہوئے سبھی نے اسلام قبول کر لیا۔ ایرانی روایات اور تمدن اختیار کیا۔ قومی علوم و فنون نے ترقی کی۔ گو "تشدد" شعار منگول اور تیموری حملہ آوروں کو فنونِ لطیفہ سے رغبت نہ تھی لیکن وہ سائنس اور دوسرے مفید علوم کے دلدادہ تھے۔ ہلاکو تک کو

تاریخ نگاروں کا احترام منظور تھا۔ اس لئے ہلاکو کی اولاد (ایلخانی حکمرانوں) کے عہد میں بہت سی مستند اور معیاری تاریخیں لکھنے میں آئیں۔ تاتار اثرات کا ایک یہ بھی نتیجہ ہوا کہ قصیدہ گوئی کا قریب قریب خاتمہ ہو گیا۔

منگول حملے کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ دور دراز رہنے والی قوموں کا میل جول ہوا جس سے ایشیا کی زندگی میں ایک نئی روح سرایت کر گئی۔ جمود و تعطل کی فضا ختم ہو گئی اور تازگی اور حرکت نے اس کی جگہ لی۔ تمام ایشیا جو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور ان کے بیچ سینکڑوں حدود حائل تھیں منگول حملہ نے ان تمام حدود اور رکاوٹوں کو دور کر دیا۔ اس سے غیر ملکی سیاحوں کے لئے سفر کرنا اور ایشیا کے طول و عرض میں گھوم کر اس کے رازوں سے پردہ اٹھانا آسان ہو گیا۔ یورپ ایشیا کے حالات سے آشنا ہو گیا اور دونوں براعظموں میں راہ و رسم کے راستے کھل گئے۔ صدیوں بعد ایرانیوں اور عربوں کا اہل چین و تبت کے ساتھ براہِ راست میل جول پیدا ہوا۔ علمائے اسلام کے عیسائی مبلغوں، بودھی لاموں اور منگول بخشیوں کے ساتھ مباحث و مناظرے ہوئے۔

جب ہلاکو کے وارث حکمران ایران کی سرزمین پر آباد ہو گئے تو انہوں نے اپنی بربریت اور وحشت ترک کر دی، توہمات اور بے دینی یا کفر چھوڑ کر انہوں نے اسلام قبول کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا اپنے اہل وطن اور خونخوار قبیلوں کے ساتھ رشتہ ٹوٹ گیا۔ اور وہ ایرانیوں کے ساتھ گھل مل گئے اور ان میں تمدنی طور سے

جذب ہو گئے یعنی ایرانی قوم کا جزو بن گئے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہلاکو جس نے خلافتِ بغداد کو تباہ کیا اور اسلام کا جانی دشمن تھا اس نے اس عہد کے دو بلند مرتبہ ایرانی مصنفوں کی خوب دلداری اور قدر کی یہ دو برگزیدہ ہستیاں ہیں۔ منجم نصیر الدین طوسی اور مؤرخ عطا ملک جوینی۔ ان کے علاوہ دو اور مورخ حضرت وصّاف اور رشید الدین فضل اللہ نے غازان خاں کے عہد میں خوب نام اور شہرت پائی۔ درحقیقت منگول حملہ سے ادبیات ایران کو ناقابلِ تلافی نقصان تو ضرور پہنچا لیکن اس کا خاتمہ نہیں ہوا۔ ایران کے تین عظیم اور نامور شاعر یعنی مولانا روم، شیخ سعدی اور خواجہ فرید الدین عطار منگول عہد میں ہی ہوئے ہیں اور متعدد بلند درجہ شعرا و ادباء بھی اس دور کے پیدا ہوئے۔ البتہ سیاسی طور پر اسلامی دنیا کو سخت صدمہ پہنچا۔ جو اتحاد خلافت بغداد کے دم سے قائم تھا وہ مغول حملہ سے پاش پاش ہو گیا اور ساتھ ہی ایران میں عربی زبان کو زوال آیا اور اس کی جگہ فارسی نے لے لی۔ اب عربی صرف دینیات اور فلسفہ کی زبان رہ گئی۔ عربوں کی حکومت ایران میں ختم ہو گئی کیونکہ ہلاکو کے وارث ایلخان صاحبِ اقتدار ہوئے۔ انھوں نے ایران کی چھوٹی چھوٹی منتشر ریاستوں کو اپنی حکومت کی ایک لڑی میں پرو دیا اور ساتھ ہی ایران پر بیرونی حملہ کے خطرہ کا انسداد کر دیا۔ ایرانی قوم اور ملک کے لئے ایلخانی ایک رحمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئے انھوں نے سارے ایران میں امن و امان قائم کیا۔

ایک مرکزی حکومت قائم کر دی۔ اور اس کی یک جہتی اور سلامتی کے ضامن ہوئے۔

اس امن و امان کی فضا میں ایران کی ادبیات کو بھی ترقی نصیب ہوئی۔ خاص طور پر صوفیانہ شاعری نے ادب میں نئی جان ڈال دی۔ چونکہ بے دین منگول حملہ آوروں کا اپنا کوئی مذہب نہیں تھا اس لئے اسلام کو پھلنے پھولنے کا موقع میسر ہوا۔ حملے کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ فارسی زبان میں بے شمار تاتاری اور ترکی زبان کے الفاظ داخل ہو گئے۔

سوال: ایران میں منگول اور تیموری عہد حکومت کے دوران فن تاریخ نگاری کی ترقی پر مفصل نوٹ لکھئے۔ یا ایلخانی (منگول) عہد کے تاریخ نگاروں پر نوٹ لکھئے:

جواب: (الف) عہد ایلخانی کے آغاز میں جو تاریخ نگار عربی زبان میں لکھتے تھے ان میں سے ابن الاثیر صاحب "الکامل" و "اسد الغابہ" اور ابوالفرج صاحب "مختصر التاریخ الاوّل" نمایاں ترین حیثیت رکھتے ہیں۔ فارسی زبان میں لکھنے والوں میں منہاج سراج جوزجانی صاحب "طبقات ناصری" کو نہایت ممتاز مقام حاصل ہے۔ "طبقات ناصری" ۲۳ ابواب پر مشتمل ہے اور شروع سے لے کر منگول کے حملہ کے وقت تک کے واقعات کا جائزہ لیتی ہے۔ یہ تاریخ تاتار حملہ کے متعلق ایسی بہت سی دلچسپ باتیں بیان کرتی ہے جو دوسری کتابوں میں درج نہیں۔ ابوالشرف ناصح نے تاریخ "الیمینی" کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کے بعد تاریخ "جہانگشائے" جوینی پر نظر پڑتی ہے یہ عطاملک

جوینی کی تصنیف ہے۔ النسوی نے عربی زبان میں جلال الدین خوارزم شاہ کی سوانح عمری ۴۲-۱۲۴۱ء میں مکمل کی۔ ابن خلیکان کی مشہور کتاب "وفایات الاعیان" ۱۲۷۴ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ عوفی کی مشہور تصنیف "لباب الالباب" بھی اسی زمانہ میں وجود پذیر ہوئی۔

عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی وصاف کی تصنیف تاریخ وصاف تاریخ جہانگشائے جوینی کے ضمیمہ کے طور پر لکھی گئی اور پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ زبان اس کی نہایت پیچیدہ اور مشکل ہے۔

مشہور تاریخ نویس رشید الدین فضل اللہ غازان کا وزیر تھا اس نے اپنی تصانیف کی کتابت، آرائش اور حفاظت پر وصاف کے قول کے مطابق ساٹھ ہزار دینار کی کثیر رقم صرف کی تھی۔ غازان نے رشید الدین کو بہت امداد دی اور حوصلہ افزائی کی۔ ایلخانی بادشاہ نے قابل مصنف کو فارسی زبان میں ایک جامع، مبسوط اور حقیقت پر مبنی تاریخ لکھنے کی فرمائش کی جس میں دوسرے تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ ہلاکو کی اولاد کے کارناموں اور فتوحات کی ہو بہو تصویر اتاری جائے۔ چنانچہ ۱۳۱۰-۱۱ء میں "جامع التواریخ" مکمل ہوئی۔ اس کی دو جلدیں ہیں۔ جامع التواریخ فارسی زبان میں بہترین تاریخوں میں سے ایک ہے۔ رشید الدین دو سال بعد تک الجائتو کے عہد حکومت کی تاریخ ضمیمہ کے طور پر لکھتا رہا۔ جامع التواریخ میں ہر ممکن ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ دنیا کے وجود میں آنے سے لے کر الجائتو کے عہد تک کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔

جامع التواریخ کے علاوہ رشید الدین نے عربی زبان میں بھی کچھ کتابیں لکھیں۔

رشید الدین کے بعد اس کے قابل ترین شاگرد حمد اللہ مستوفی قزوینی نے فنِ تاریخ کی ایک اہم خدمت انجام دی۔ اس نے ۱۳۳۰ء میں تاریخ گزیدہ مکمل کی جس سے متعلق اس نے کم وبیش چوبیس ماخذ بیان کئے ہیں۔ تاریخ "گزیدہ" ایک فاتحہ، چھ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ یہ کتاب انسائیکلوپیڈیا کے طور پر لکھی گئی ہے۔

حمد اللہ نے ۱۳۳۵ء میں ظفر نامہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ مثنوی ظفر نامہ ایک منظوم تاریخ ہے جو شاہنامہ فردوسی کی تقلید میں اور اس کے ضمیمہ کی صورت میں لکھی گئی۔ اس میں حضرت محمد صلعم کی زندگی سے آغاز کیا گیا ہے اور مصنف کے وقت تک کے یعنی ۳۲-۱۳۳۱ء تک کے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

نصیر الدین البیضوی کی کتاب "نظام التواریخ باوا آدم سے لے کر ۹۵-۱۲۹۴ء تک کے واقعات بیان کرتی ہے۔

۱۳۱۷ء میں ابو سلیمان داؤد نے ایک تاریخ تالیف کی۔ ابو سلیمان ماورالنہر کے ایک قصبہ بناکت کا رہنے والا تھا۔ اس نے کتاب کا نام تاریخ بناکتی رکھا گیا۔ یہ کتاب در اصل جامع التواریخ ہی کا خلاصہ ہے جس میں سلطان ابو سعید کے عہدِ حکومت تک کے حالات مندرج ہیں۔ تاریخ بناکتی کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کئی ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو عام طور پر مسلم مصنفین

کی کتابوں میں نہیں ملتیں۔

محمد ابن علی کی تصنیف مجمع الانساب میں شروع سے لیکر عہدِ مصنف تک کی تاریخ دی گئی ہے۔

احمد تبریزی نے ایک منظوم تاریخ شہنشاہ نامہ یا چنگیز نامہ کے نام سے لکھی۔ اس میں اٹھارہ ہزار شعر ہیں اور ۳۸-۱۳۳۷ء تک کی تاریخ نظم میں مرتب کی گئی ہے۔ شہنشاہ نامہ اپنے پیشرو ظفر نامہ کے معیار کو نہیں پہنچتا۔ شہنشاہ نامہ ابوسعید کے نام پر معنون ہے۔

نور الدین ابن شمس الدین محمد نے ۶۲-۱۳۶۱ء میں شہنشاہ نامہ کی مانند ایک منظوم تاریخ غازان نامہ کے نام سے مکمل کی۔ یہ نظم بحرِ متقارب میں لکھی گئی ہے اور نو دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے فنی اعتبار سے یہ دونوں تاریخی نظمیں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔

(ب) تیموری عہدِ حکومت کو بھی تاریخ نگاری کے لحاظ سے امتیاز حاصل ہے۔ تیمور بھی محمود غزنوی کی طرح اس بات کا خواہشمند تھا کہ مفتوحہ علاقوں سے اہلِ فن کو اکٹھا کرے جائے۔ اور اپنے دربار کی علمی و ادبی زینت میں اضافہ کیا جائے۔ ایسے اہلِ فن میں سعد الدین تفتزانی، السید الشرف جرجانی اور ابن عرب شاہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ابن عرب شاہ کو تیمور ۱۴۰۱ء میں اپنے ساتھ دمشق لے گیا تھا۔ ابن عرب شاہ کی مشہور ترین تصنیف عجائب المقدور فی نوائب تیمور ہے۔ یہ کتاب امیر تیمور کی سوانح عمری ہے مصنف نے

محمود کے خلاف اس میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ابن عرب شاہ کی
تصنیف فقۃ الخلفا بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔

الفیروز آبادی صاحبِ قاموس (وفات ۱۴۱۴ء) بھی سوانح
نگاری کے لئے مشہور ہے۔

تیمور کے وقت کا اولین تاریخ نگار نظامی شامی تھا۔ اس
نے تیمور کی زندگی ہی میں ظفر نامہ لکھا۔ بعد میں شرف الدین علی یزدی
نے بھی نظامی شامی کی پیروی میں ایک ظفر نامہ لکھا اگرچہ شرف الدین
کے ظفر نامہ کو نظامی شامی کے ظفر نامہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ
شہرت حاصل ہے تاہم جس تصنع عبارت کی پیچیدگی۔ تراکیب
کی شان وشوکت اور الفاظ کی مار دھاڑ سے شرف الدین نے
کام لیا اُسے ایک تاریخ نگار کی زبان کے لئے پسند نہیں کیا جا سکتا۔

حافظ آبرو امیر تیمور اور شاہ رُخ (پسر امیر تیمور) کا درباری
مؤرخ تھا۔ اس نے اپنی مفصل اور جامع تاریخ "زبدۃ التواریخ"
کو ۲۷-۱۴۲۶ء میں مکمل کیا۔ یہ تاریخ چار جلدوں پر مشتمل ہے اور
دُنیا بھر کی تاریخ پر حاوی ہے۔ عبدالرزاق سمرقندی (وفات
۱۴۸۲ء) نے زبدۃ التواریخ کو سامنے رکھ کر مطلع السعدین
لکھا۔ اس کی دو جلدیں ہیں جن میں تقریباً ۱۷۰ سال کے واقعات
درج ہیں۔ یعنی خاندان ہلاکو کے آخری تاجدار ابو سعید کی پیدائش
(۶-۱۳۰۵ء) سے لے کر امیر تیمور کے پڑپوتے ابو سعید کی وفات
(۶۹-۱۴۶۸ء) تک بلکہ اس سے بھی دو ایک سال زیادہ عرصے
تک مصنف ان دونوں ہمنام حکمرانوں کو مبارک ستارے

(سعدین) فرض کرتا ہے۔ اس لئے اس نے اپنی کتاب کا نام مطلع السعدین
رکھا۔ جزوی تفصیلات، واقعہ نگاری اور علمی مشاہدات نے اس تاریخ
کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔

معین الدین محمد نے روضۃ الجنات فی مدینۃ الہرات کے نام
سے ہرات کی تاریخ لکھی۔ اس میں ۱۴۷۰ء تک کے واقعات درج
ہیں۔ میر خوند نے روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیا والملوک والخلفا کے
نام سے دنیا بھر کی ایک مفصل اور بسیط تاریخ لکھی۔ اس میں تخلیق
عالم کے وقت سے لے کر ۱۴۹۶ء تک کے واقعات درج ہیں۔ کتاب
کے خاتمے پر آخری تیموری حکمران سلطان حسین کی تاریخ خاص طور پر
لکھی گئی ہے۔ میر علی شیر نوائی اسی سلطان حسین کا وزیر تھا۔ ایران جدید
کے مایۂ ناز ادیب رضا قلی خاں لالہ باشی ہدایت نے روضۃ الصفا
کو اپنے وقت تک مکمل کر دیا ہے۔ خوندمیر کی پہلی تصنیف خلاصۃ
الاخبار روضۃ الصفا ہی کا خلاصہ ہے۔ اسی کی مفصل تر تصنیف
حبیب السیر ۱۵۲۳ء میں لکھی گئی۔

فصیحی کا شاہکار مجمل تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کا ایک
بیش قیمت مرقع ہے۔ اس کی خاص دلچسپی اور فوائد کی وجہ یہ ہے کہ
اس کے لکھنے میں فصیحی نے غیر معمولی ماخذوں سے امداد لی ہے۔

سوال: شیخ سعدی شیرازی کی زندگی کے حالات قلم بند
کیجئے اور اس کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ لکھئے۔ یعنی اس کے
کلام کی خوبیاں بیان کیجئے:-

جواب: شیخ مشرف الدین بن مصلح الدین بن عبداللہ سعدی شیرازی کی تاریخ ولادت کے متعلق محققین میں ابھی تک چند اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ عام خیال کہ آپ ۱۱۸۴ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے قرین صواب نظر آتا ہے مگر سرگوسلی کی رائے کہ آپ کی پیدائش ۵۸۹ھ میں ہوئی سب سے زیادہ قابل اعتنا ہے۔ ایک بات جو ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں یہ ہے کہ شیخ سعدی مظفر الدین تکلا بن زنگی کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اور مدرسہ نظامیہ بغداد میں علامہ ابن جوزی سے تعلیم پائی۔ آپ کی کلی رغبت فقر، درویشی، دینیات، علم، سلوک اور علم و ادب کی طرف مائل تھی۔ شیخ نے اپنا تخلص اپنے سرپرست سعد بن زنگی کے نام کی نسبت سے کیا تھا۔

۱۲۲۶ء تک شیخ تعلیم میں مصروف رہے۔ ۱۲۵۶ء تک سفر میں۔ سرگوسلی لکھتے ہیں کہ مشرقی سیاحوں میں ابن بطوطہ سے قطع نظر سعدی سے بڑھ کر اور کوئی سیاح دیکھنے میں نہیں آیا۔ اسلامی ممالک کی وسیع سیاحت کے علاوہ چار بار ہندوستان میں آنا ہوا۔ دس بارہ دفع پا پیادہ حج کئے۔ شیخ کی زندگی کا تیسرا اور اہم ترین دور جو ۱۲۵۶ء سے شروع ہو کر ۱۲۹۱ء یا بقول دیگراں ۶۹۱ھ میں بہر حال ان کی وفات کے ساتھ ختم ہوا سب سے زیادہ قابل التفات ہے کیونکہ اس دوران میں ہی آپ کے غیر فانی شاہکار معرض وجود میں آئے۔

شہرۂ آفاق مثنوی بوستان ۱۲۵۷ء میں اور ملی جلی نثر و نظم

کا بے مثال مرقع گلستاں ۱۲۵۸ء میں ظہور پذیر ہوا۔
شیخ کی نثر میں مسجع اور مرصع فقرے سادہ فقروں میں ایسی آمیزش رکھتے ہیں جیس طرح کہ پشمینے کی شال میں، ریشم کے تار فطرت کے بیان میں سعدی کا کلام فی الواقع لاثانی ہے۔ وہ کوئی نئی بات نہیں بتاتا بلکہ صرف بھولی بسری واردانیں یاد دلاتا ہے۔ علم و ادب، حال و قال اور رقص و سرود کی محفلوں میں سعدی کے اکثر اشعار دلوں کو گرماتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ سعدی نے پند و موعظت کے جو رقص کرتے ہوئے دریا بہائے ہیں ان میں براہ راست حاصل کئے ہوئے تجربات کی رنگین موجیں کچھ اس انداز سے چھلکتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ اہل نظر کے دل و دماغ مسحور ہو جاتے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ کیفیات عارضی نہیں ہوتیں۔ سعدی کی لطافت، نظافت اور بذلہ سنجی یونان کے مشہور شاعر ہوریس سے ملتی ہے شیکسپیر اور سعدی میں جو مشترکہ چیز پائی جاتی ہے یہ ہے کہ دونوں عقل و عادت کی سرحد سے آگے نہیں بڑھتے۔ بالکل فطری اور حقیقت حال پر مبنی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ بیان سادہ، صاف اور دھلا ہوا ہوتا ہے۔ کلام کی بنیاد بلند نظری اور نصیحت پر رکھتے ہیں۔ مولانا حالی نے گلستاں کی یہ خوبیاں بیان فرمائی ہیں:۔

داستان کی سادگی، الفاظ کی ترقی اور گھلاوٹ، ترکیبوں کا سلجھاؤ، بیان کی صفائی، عبارت کی دلنشینی، خیالات کی ہمواری مبالغہ میں اعتدال، ماخذ کی سہولت، حسن ترتیب، تمثیلات کی لطافت اور برجستگی، استعارات کی نزاکت اور کنایات ۔ ۔

کی شوخی۔

شیخ کی غزلیات کے چار دیوان موجود ہیں:۔

(۱) غزلیاتِ قدیم (۲) خواتیم (۳) بدائع (۴) طیبات۔

چاروں میں صفائی، روانی، بے محابا نگاری اور سلاست کے اعتبار سے بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ فارسی غزل چھٹی صدی ہجری کے دوران وجود میں آچکی تھی۔ اس کی نسبت یہ امر مسلّم ہے کہ سب سے پہلے کمالؔ نے ہی اس کا خاکہ قائم کیا تھا جس کو شیخ سعدیؔ نے اس قدر ترقی دی کہ موجد بن گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سعدی ہی سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی سحر نگاری سے غزل کو مقبول عام بنایا۔ اگرچہ خواجہ شیرازی (حافظ) نے کسی حد تک خواجو کرمانی کی پیروی میں غزلیں لکھیں لیکن آپ نے سعدیؔ کو استاد ماننے سے انکار نہیں کیا ہے سہ

اُستاد غزل سعدیؔ ست پیش ہمہ کس امّا
دارد سخنِ حافظ طرزِ روشِ خواجو

غزل کا جو انداز سعدیؔ نے قایم کیا وہی فارسی اور اردو میں آج تک رائج ہے۔ مسائلِ تصوف، فلسفۂ زندگی، رموزِ عشق اور اخلاق و حکمت کی باریکیاں غزل میں سب سے پہلے سعدیؔ نے ہی بیان کیں۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جو آج بھی غزل کی جان ہیں۔ شیخ کی غزلوں میں کمال درجے کی صفائی اور سادگی کے پہلو بہ پہلو ایک گونہ نزاکت اور چنچل پن بھی ہے سنگریزوں کو ترتیب دے کر موتیوں کی لڑی سے زیادہ خوشنما اور گرانبہا

بتا دینا کچھ آپ ہی کے حصے میں آیا ہے ؎

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست
تا ندانند حریفاں کہ تو منظور منی
گر کنند میل بہ خوباں دلِ من خوردہ مگیر
کایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

شیخ کا کلام دنیا کے ہر مہذب انسان کے لئے ہمیشہ کے واسطے مشعلِ راہ رہے گا ؎

مگوای جوانمرد صاحب خرد	بداندر حق مردم نیک و بد
وگر نیک مرد است بدمی کنی	کہ بد مرد را خصمِ خود مے کنی

یہ تقسیم جس قدر فلسفیانہ ہے اور اس استدلال میں جس قدر فلسفہ ہے اسی قدر واقعی اور عملی ہے۔ علامہ شبلی نے شیخ کی اس تلخ پردہ دری کو بہت سراہا ہے جو آپ نے نام نہاد صوفیوں کو سامنے رکھ کر کی ہے۔ ایک جگہ نظر بازوں کے متعلق کس جوش کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

کہ ما پاکبازیم و اہلِ نظر	گروہے نشینند با خوش پسر
کہ بر سفرہ حسرت خورد روزہ دار	زمن پرس فرسودۂ روزگار
کہ در صبح دیدن چہ بالغ چہ خورد	چرا طفل یک روزہ ہوشش نبرد

ایک قطعے میں شیخ نے چغل خوری کی کیا خوب مذمت کی ہے ؎

یدو گفت دانندۂ سرفراز	زباں کرد شخصے بہ غیبت دراز
مرا بد گماں در حقِ خود مکن	کہ یادِ کساں پیشِ من بد مکن

سعدی کے جوشِ عشق کا اندازہ اس کے ایک ہی شعر سے لگایا جا سکتا ہے۔

من آں نیم کہ حلال از حرام نشناسم — شراب با تو حلال است و آب بے تو حرام

گلستاں، بوستاں اور غزلیات کے علاوہ شیخ کی کلیات میں قصائدِ عربی، قصائدِ فارسی، مراثی، قطعات، ترجیع بند، رباعیات، ہزلیات، خبثیات، مضحکات اور پند نامہ کے سے عناصر بھی ملتے ہیں۔ قصیدے میں شیخ کو دیگر تمام شعرا پر اس بات میں فوقیت حاصل ہے کہ آپ نے بھول کر بھی کبھی چاپلوسی اور خوشامد کی طرف دھیان نہیں دیا بلکہ دلیرانہ نصیحتیں کی ہیں اور ظلم و بدی کے برے نتائج کے خلاف بادشاہوں اور امیروں کو متنبہ کیا ہے اور انہیں نیکی پر مائل ہونے کی تلقین فرمائی ہے۔

مندرجہ ذیل چار خوبیاں شاعری کی روح ہوا کرتی ہیں۔ اور چاروں ہی شیخ کے ہر شعر سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

۱۔ خیالات حقیقت اور واقعہ پر مبنی ہوں۔

۲۔ خیالات ایسے ہوں کہ ان میں ایک قسم کا نرالا پن اور اچھوتا انداز پایا جائے۔

۳۔ خیالات کو عمدہ بیان کا جامہ پہنایا جائے۔

۴۔ شاعر کے دل میں جبکہ وہ کوئی مضمون ادا کر رہا ہو کم و بیش اس مضمون کا جوش اور ولولہ موجود ہونا چاہیے۔

ڈی ٹیسی کا عقیدہ ہے کہ سعدی پہلا شخص ہے جس نے ہندوستانی زبان میں شعر کہا لیکن ہندی شعرا کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے

سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ وہ سعدی دراصل دکن کی سرزمین سے اٹھا تھا۔

شیخ سعدی کی ہمہ گیر شہرت اور مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس کے یہاں ہر ذوق کے موافق اور ہر مزاج کے مطابق کافی مسالہ موجود ہے۔

سوال: محمود شبستری کی زندگی اور اس کے فلسفہ یا تصوف پر نوٹ لکھئے یعنی اس کے صوفیانہ عقائد کی وضاحت کیجئے۔

جواب: شیخ سعد الدین محمود بن عبد الکریم شبستری تبریز کے نزدیک قصبہ شبستر میں پیدا ہوئے۔ اسی جگہ پرورش اور ابتدائی تعلیم پائی ان کی زندگی سے متعلق زیادہ واقفیت دستیاب نہیں ہے۔ البتہ انہیں الجائتو اور ابوسعید کے عہد میں کافی شہرت نصیب ہوئی اور آپ کا شمار تبریز کے نامور صوفیا اور علما میں ہونے لگا۔ دین وحکمت کے مسائل میں آپ کو گہری دلچسپی اور دسترس تھی۔ اس لئے ایسے معاملات میں آپ سے اکثر رجوع کیا جاتا تھا۔ ان مسائل کے حل کے لئے لوگ آپ سے سوال کرتے اور آپ ان کا جواب دیتے۔ آخر انہوں نے صوفیانہ مسائل پر سوال اور جواب کی صورت میں ایک کتاب لکھی جس کا نام گلشن راز رکھا۔

اس کتاب میں دینی معاملات اور تصوف کے عقاید و مسائل پر بحث کی گئی ہے گو وہ باقاعدہ شعر و شاعری نہیں کرتے تھے۔ اور عام طور پر صوفیانہ موضوعوں پر نثر میں ہی رسالے اور کتب تالیف

کرتے تھے۔ لیکن گلشن راز انھوں نے مثنوی کی صورت میں لکھی۔ اور آپ کی شہرت کا مدار اسی منظوم تصنیف پر ہے۔ اس میں تصوف کے دقیق اور مشکل مسائل کو دلکش اور صاف اشعار میں سلجھایا گیا ہے۔ فنِ شعر پر البتہ مطالب و معانی کو ترجیح دی گئی ہے گو بعض مقامات پر حسنِ بیان اور شعریت کی داد دی گئی ہے۔ آپ نے ۷۲۰ھ میں وفات پائی اور شبستر میں مدفون ہوئے۔

نثر فارسی میں آپ کی تصنیف "حق الیقین" قابلِ قدر ہے۔ اس کے علاوہ "شواہد نامہ" بھی آپ کی منثور تالیف ہے۔ دین کے مسائل پر یہ قابلِ اعتنا تصانیف ہیں۔

گلشن راز میں ذیل کی قسم کے مضامین ہیں:۔

وحدت: انسان کا اصلی کام یہ ہے کہ حق و باطل میں تمیز کرے وہ دنیا کی ہر شے میں نورِ ذات دیکھے۔ عارف جزئیات عالم میں کل (ذاتِ حق) کو پاتا ہے۔ اُسے سوائے ذاتِ خدا کے کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ وحدت کا جلوہ کثرت میں دیکھتا ہے۔ دنیا کی گونا گونی اور رنگا رنگی وہ خدا کی ذات کے مختلف مظاہر سمجھتا ہے۔ حقیقت ایک اور واحد ہے البتہ اس کی صفات یا جلوے بے شمار ہیں ؎

محقق را کہ وحدت در شہود است — نخستیں نظر بر نورِ وجود است

دلے کز معرفت نور و صفا دید — ز ہر چیزے کہ دید اوّل خدا دید

ایمان بالغیب: انسان ضعیف العقل ہے۔ ذاتِ حق کا دیدار حواس کی حدود سے بالاتر ہے۔ عقل کو درکِ ذات حاصل نہیں ہو سکتا۔ عاقل جتنا عقل و دانش سے کام لیتا ہے۔

اور صناعِ عالم کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی وہ اس سے دُور ہوتا جاتا ہے۔ عقل انسان کو راہِ راست سے بھٹکاتی ہے اور اُسے گمراہ کر دیتی ہے۔ خدا کی ذات دلیل و بُرہان اور عقل وفہم کی دسترس سے باہر ہے۔ تزکیہ نفس سے عالمِ غیب اور ذاتِ حق تک رسائی ہو سکتی ہے۔ جس طرح چمگادڑ نورِ آفتاب سے چندھیا جاتی ہے اور اس کا دیدار نہیں کر سکتی اسی طرح انسان کی عقل نورِ ذات سے متحیّر و پریشان ہو جاتی ہے ؎

رہا کن عقل را باحق ہمے باش | کہ تابِ خور ندارد چشمِ خفاش
ہمہ عالم ز نورِ اوست پیدا | کجا او گردد از عالم ہویدا

منازلِ معرفت: عارف یا سالک کو راہِ حقیقت پر چند خاص منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں:۔

۱- پہلی منزل وہ ہے جب وہ اپنی خامیوں اور بُرائیوں کو دُور کرتا ہے۔ اپنی ہستی کو ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک کرتا ہے، دل کو آلائشِ گناہ سے صاف کرتا ہے۔ اس منزل یا عمل کو تخلیہ کہتے ہیں۔

۲- دوسری منزل یا مرحلہ یہ ہے جب وہ اچھی عادات و فضائل کا اکتساب کرتا ہے۔ نیکی کی طرف راغب ہوتا ہے اپنے نفس کو اخلاقِ حسنہ سے آراستہ کرتا ہے۔ زہد و تقویٰ کی مشق کرتا ہے۔ یہ تحلیہ کا درجہ ہے۔

۳- ان دو منزلوں کو عبور کرنے کے بعد وہ شریعت کے احکام و اصول کی پیروی کرتا ہے۔ عبادت و ریاضت میں مصروف رہتا

ہے۔ خدمتِ خلق کو اپنا شعار بناتا ہے۔ ایثارِ نفس سے کام لیتا ہے حرص و آز کے پنجے سے رہائی پا لیتا ہے۔ خودی یا "میں" کی قید سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ اس کا نفس روشن ہونے لگتا ہے۔ مقامِ علم سے گذر کر وہ عرفان یا کشف و شہود میں قدم رکھتا ہے، یہاں تک کہ شریعت سے طریقت میں پہنچ جاتا ہے اور قربِ ذات حاصل کرتا ہے۔ اب وہ جلوۂ کثرت میں وحدت کو دیکھنے لگتا ہے۔ یہ تجلیہ کا مقام ہے۔

۴۔ اس چوتھی منزل میں وہ علم و دانش کی حد سے گذر کر حقیقت شناسی کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب وہ عارف کا درجہ پا لیتا ہے۔ اس کی نظر میں عالم و معلوم، من و تو، عارف و معروف کا فرق مٹ جاتا ہے۔ وہ خودی یا ہستی کے احساس سے بالاتر ہو جاتا ہے اور ذاتِ حق اور اپنی ہستی کو ایک ہی سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انا الحق کا نعرہ لگانے لگتا ہے کیونکہ اب اُسے اپنے وجود میں سوائے حق کے کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے ؎

ہر آنکس را کہ اندر دل شکے نیست | یقیں داند کہ ہستی جز یکے نیست
جنابِ حضرتِ حق را دوئی نیست | در آں حضرت من و ما و توئی نیست

"گلشن راز" میں ایک ہزار شعر ہیں جن میں صوفیانہ مطالب و معانی کو تفصیل اور توضیح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جیسے انسانی نطق اور اس کے حدود، جزو کل، حادث و قدیم، حق سے عارف کا وصال اور تصوف کی اصطلاحات اور کنایات کی وضاحت وغیرہ وغیرہ

سوال: مولانا جلال الدین رومی کی زندگی اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ سپرد قلم کیجئے۔

جواب: مولانا روم جس زمانے میں ہوئے ہیں (۱۲۰۷ء تا ۱۲۷۳ء) دین شاہ جے ایرانی اُسے "عصر عرفان و اخلاق" کا نام دیتا ہے۔ تصوف اور فلسفہ کے دقیق مسائل کے اظہار اور روحانی جذبات کی ترجمانی کے لحاظ سے مولانا روم کی مثنوی کا آج تک جواب نہیں ہو سکا ہے۔

مثنوئ مولوئ معنوی ہست قرآں در زبان پہلوی

مولانا کی غزلیں بھی ایک گونہ سرور اور نشے سے معمور ہیں۔ لیکن انہیں مثنوی کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اوحدی کے بعد خواجہ فریدالدین عطار، مولانا روم، عراقی وغیرہ نے غزل کو نہایت ترقی دی۔ لیکن یہ لوگ چونکہ عشقِ حقیقی کے جاندادہ تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں حقیقت کا پہلو غالب رہتا تھا۔ اس بنا پر ان کی غزلیں عام نہ ہوئیں۔

مولانا روم کو زمرۂ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے کیونکہ مثنوی میں دینی مسائل کو خوبی اور وضاحت کے ساتھ سلجھایا ہے۔ علمِ کلام کا مطلب ہے فلسفۂ قرآن یا شریعت جس کی توضیح مثنوی میں قابلِ داد ہے آیاتِ قرآنی کی تشریح سادگی، سلاست، تمثیل اور وضاحت کے ساتھ کی گئی ہے۔

مولانا روم کا نام محمد اور لقب جلال الدین ہے اور عرف مولانائے روم۔ حضرت ابوبکر صدیق کی اولاد سے تھے۔ آپ کے والد بہاؤالدین

سنہ ۶۱۰ھ میں نیشاپور پہنچے۔ خواجہ فریدالدین عطار ان کو ملنے آئے مولانا روم کی عمر اس وقت چھ برس کی تھی۔ عطار نے اپنی مثنوی "اسرارنامہ" مولانا کو پیش کی۔ اس زمانہ میں جو لوگ سلاطین روم کہلاتے تھے وہ سلجوقیہ کی تیسری شاخ تھی جو ایشیائے کوچک پر قابض ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں ایشیائے کوچک کو روم کہتے تھے یہاں قیام پذیر ہونے کے باعث مولانا کا تخلص روم ہوا۔

مولانا روم سنہ ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ شیخ بہاء الدین کے مریدوں میں سید برہان الدین محقق بلند پایہ فاضل تھے۔ مولانا کے والد نے مولانا کو ان کی آغوشِ تربیت میں دے دیا۔ مولانا نے اکثر علوم و فنون انہی سے حاصل کئے ۱۸ یا ۱۹ برس کی عمر میں قونیہ میں آئے۔ جب ان کے والد نے انتقال کیا تو اس کے دوسرے سال یعنی سنہ ۶۲۹ھ میں تکمیل فن کے لئے شام کا قصد کیا۔ اس زمانے میں دمشق اور حلب علوم و فنون کے مرکز تھے۔ مولانا کی زندگی کا دوسرا دور درحقیقت شمس تبریز کی ملاقات سے شروع ہوتا ہے۔ مختلف تذکروں اور تاریخوں میں یہ واقعہ مختلف اور متناقص طریقوں سے منقول ہے۔

حسام الدین چلپی مولانا کے معتقدانِ خصوصی میں تھے۔ آپ ہی کی استدعا پر مولانا نے مثنوی لکھنی شروع کی۔ مولانا نے سنہ ۶۷۲ھ میں وفات پائی۔

جن دنوں مولانا کی عمر چالیس برس کی تھی اور آپ تحصیلِ علوم

میں مصروف تھے دمشق میں شیخ محی الدین اکبر سے آپ کی ملاقات ہوئی۔

شیخ سعدی لکھتے ہیں "بلاد روم میں ایک صاحب جلال پیدا ہوا ہے یہ غزل اسی کے ترانۂ حقیقت کا ایک نغمہ ہے۔"

کیسی لطف کی بات ہے کہ شیخ سعدی اور مولانا روم دونوں ہی تاتاری سیلاب کے تھپیڑوں سے متاثر نہ ہوئے۔

مولانا کی تصنیفات :- ۱۔ فیہ ما فیہ۔ یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے وقتاً فوقتاً معین الدین پروانہ کے نام لکھے۔ یہ کتاب بالکل نایاب ہے۔

۲۔ دیوان۔ اس میں تقریباً پچاس ہزار شعر ہیں۔ بعض تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ درحقیقت مولانا روم کے اصلی دیوان میں تیس ہزار شعر تھے۔ باقی اشعار بعد میں ان کے نام سے منسوب کر دیے گئے۔

۳۔ مثنوی۔ یہی کتاب ہے جس نے مولانا روم کے نام کو زندۂ جاوید کر دیا ہے اور جس کی شہرت اور مقبولیت نے ایران کی تمام تصنیفات کو مات کر دیا۔ اس کے اشعار کی مجموعی تعداد ۲۶۶۶۰ چھبیس ہزار چھ سو ساٹھ ہے جیسا کہ کشف الظنون میں مذکور ہے۔

دیوان صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔ قصیدہ یا قطعہ وغیرہ مطلق نہیں ہے۔ مولانا کی شاعری کا دامن مدح کے داغ سے پاک ہے حالانکہ ان کے معاصرین میں سے عراقی اور سعدی تک جو ارباب حال میں نامور ہیں اس عیب سے نہ بچ سکے۔

تمام اہلِ تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ شیخ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں۔ مولانا کے کلام میں جو وجد، جوش اور بے خودی پائی جاتی ہے اوروں کے کلام میں نہیں۔ وہ خطرتاً پرجوش طبیعت رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں جو جلال، ادّعا، بے باکی اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے صوفیہ میں سے کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ مرزا غالب مولانا کے ایک شعر پر جو بقا کی حالت کا ہے سر دھنا کرتے تھے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند ۔۔۔ فرشتہ صید و پیغمبر شکار و یزداں گیر

خیام نے اکثر رباعیوں میں وجودِ روح، معاد اور جزا و سزا سے انکار کیا ہے۔ اور اس پر خطابی یعنی شاعرانہ دلائل قائم کئے ہیں مولانا نے اکثر اشعار میں اس قسم کے خیالات کو اسی شاعرانہ پیرایہ میں ردّ کیا ہے۔

صاحبِ "مجمع الفصحا" نے لکھا ہے کہ ایران میں شاہنامہ، گلستان، مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ کے برابر کسی کتاب کو مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ یہ امر یقینی ہے کہ مولانا نے حدیقہ سنائی اور "منطق الطیر" کو سامنے رکھ کر مثنوی لکھی۔ مولانا زیادہ تر قیاس شمولی سے نہیں بلکہ قیاس تمثیلی سے استدلال کرتے ہیں ؎

اے کہ با ہر دل ترا رازے دگر ۔۔۔ ہر گدا را بردرت نازے دگر

مثنوی صرف تصوف ہی نہیں بلکہ عقائد و مسائل دینی اور علمِ کلام کی بھی عمدہ ترین کتاب ہے ؎

گفت پیغمبر اگر کوبی درے ۔۔۔ لاجرم از وے بروں آید سرے

موجودہ علمِ کلام کی بنیاد امام غزالی نے قایم کی اور رازی نے اس عمارت کو عرش کمال تک پہنچایا۔ اس وقت سے آج تک سینکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں ۔ یہ سارا دفتر ہمارے سامنے ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ مسائل و عقائد جس خوبی سے مثنوی میں ثابت کیے گئے ہیں یہ تمام دفتر اس کے آگے ہیچ ہیں۔

شمس تبریز سے مولانا کو ایسی عقیدت تھی کہ کئی صدیوں سے آپ کا دیوان "دیوانِ تبریز" کے نام سے مشہور ہے۔ شمس تبریز کی موت نے مولانا کے دل پر اس قدر یاس و الم طاری کر دیا تھا کہ آپ ایک عرصہ تک غم میں مخمور رہے ۔ سماع کرنے والے درویشوں کا طبقہ (مولوی) اُسی وقت سے چلا آرہا ہے۔

"مولانا کے کلام میں حافظ کے کلام کا سا حُسن رنگ و بو نہیں اگرچہ شعر کو تصوف کی لطیف چاشنی دینے میں مولانا نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی" (نکلسن)

اگر بعض مغربی نقاد مولانا کی غزلوں کے اشعار کو مثنوی پر ترجیح دیتے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ آخر ان کی غزلوں میں ایسے ایسے جواہر پارے بھی تو موجود ہیں ؎

بخدا خبر ندارم چو نماز مے گذارم　　　که تمام شد رکوعے که امام شد فلانے

سوال: کمال الدین اسماعیل کی زندگی کے حالات پر نوٹ لکھیئے اور اس کے کلام کی خوبیوں کا جائزہ پیش کیجیئے :۔

جواب: آپ کا نام اسماعیل اور کمال تخلص تھا۔ آپ کے

والد جمال الدین عبد الرزاق ایک بلند پایہ اور نامور شاعر تھے۔ اور صاحب دیوان بھی۔ اسماعیل نے مذہبی علوم حاصل کئے شاعری کا ملکہ فطری اور موروثی تھا۔ شاعری میں آپ نے واقعی کمال پیدا کیا۔ خاندان صاعدیہ سے تعلق رکھتے تھے اور خوارزم شاہ کی مدح میں بھی قصیدہ کہا۔ اہل صاعدیہ سخن فہم تھے اس لیئے شعرا کی قدر کرتے تھے چنانچہ وہ کمال کو بھی دادِ سخن دیتے تھے۔ ایک تذکرہ میں مذکور ہے کہ کمال نے ایک قصیدہ سلطان سنجر سلجوقی کی مدح میں بھی لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

حجابِ ظلم تو برداشتی ز چہرۂ عدل
نقابِ کفر بکشتادی از رخِ ایمان

حضرت شہاب الدین سہروردی کی مدح میں بھی ایک قصیدہ کہا جو اس کے دیوان میں موجود ہے۔

شاعر کی وفات نہایت دردناک حالات میں ہوئی۔ ۶۳۵ھ میں جب اوکتائی قاآن نے اصفہان میں قتلِ عام کا حکم دیا اس وقت آپ گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ اور کوئی ان کے ساتھ مداخلت نہ کرتا تھا۔ اکثر لوگ نقدی وغیرہ ان کے گھر میں لاکر امانت کے طور پر رکھ دیتے تھے۔ گھر میں ایک کنواں تھا وہ ان امانتوں کا مخزن تھا۔ جب شہر میں قتل وغارت کا بازار گرم ہوا تو ایک ترک کمال کے گھر کی طرف آ پہنچا۔ اس نے ایک پرندے کو غلیل سے مارنا چاہا اتفاق سے زہ گیر اڑ کر کنوئیں میں جا گری۔ ترک کنوئیں میں اترا۔ زر و جواہر کا انبار دیکھا۔ اس کی آتشِ حرص بھڑک اٹھی۔ سمجھا کہ اور بھی خزانے ہوں گے۔ کمال اسماعیل کو دھمکایا کہ بتاؤ باقی مخزن کہاں ہیں۔

شاعر نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ترک نے غصے میں آکر آپ کو ہلاک کر دیا مرتے وقت ذیل کی رباعی اپنے خون سے دیوار پر لکھی ؎

دل خون شد و شرطِ جانگدازی این است | در حضرتِ تو کمینہ بازی این است
با این ہمہ ہیچ دم نمی باید زد | شاید کہ ترا بندہ نوازی این است

بہارِ عجم میں لکھا ہے کہ ترک کی انگوٹھی کنوئیں میں گر گئی تھی اس لئے وہ انگوٹھی کو نکالنے کے لئے کنوئیں میں اترا۔ اس کے مطابق یہ واقعہ ۶۳۶ھ کا ہے۔

تبصرہ: کمال کی شاعری متقدمین اور متاخرین کے درمیان کے سلسلہ کی بیچ کی کڑی ہے یعنی قدیم اور جدید کے مابین حدِ فاصل کا کام کرتی ہے۔ اس کا ایک سرا قدما اور دوسرا متاخرین سے ملا ہوا ہے۔ قدیم شعرا کی متانت، پختگی، استواری اور متاخرین کی مضمون بندی، خیال آفرینی، نزاکتِ مضمون، دونوں یکجا جمع ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین دونوں آپ کے معترف ہیں۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں :- ؎

گر باورت نمی شود از بندہ این حدیث | از گفتۂ کمال دلیلے بیاورم
گر برکنم دل از تو و بردارم از تو مہر | آں مہر بر کہ افگنم و دل کجا برم

عرفی خراج تحسین ادا کرتے ہوئے فرماتا ہے ؎

مرا ز نسبتِ ہمدردیِ کمال غم است | دگرنہ شعر چہ غم دار دار غلط خوانی

آپ کے ہمعصر محقق طوسی نے بھی آپ کی بلند پائیگی کو تسلیم کیا ہے اور اپنی کتاب معیار الاشعار میں آپ کا ذکر انتہائی تعظیم اور قدر کے لہجے میں کیا ہے۔

کمال کی شاعری کی خصوصیات: ۱- جدتِ خیال و مضمون آفرینی - اپنے کلام میں کمال نے نئے نئے مضامین باندھے ہیں۔ ان نادر اور اچھوتے خیالات پر ہی متاخرین کی مضمون آفرینیوں کی بنیاد ہے ؎

چوں صبح باز کرد دہن را بوصفِ او | چرخش درست اشرفی اندر دہاں نہاد
افگند چار نعل ہلال آسماں دو بار | تا بار کابِ خواجہ عناں بر عناں نہاد

۲- مشکل طرحیں: آپ بعض اوقات مشکل اور ادق طرحوں میں شعر کہتے ہیں۔ اور ان میں نئے نئے مضامین پیدا کرتے ہیں ؎

در گردِ عزم او نرسد برق گرم رو | ور آتشش بود بہ مثل چوں شرار پائے
از ہیبتِ تو بر آرم چوں مور پر | از فرطِ عجز اگرچہ ندارم چوں مار پائے

۳- سلاستِ زبان: کمال کی شاعری کی خاص خصوصیت زبان کی صفائی اور روانی اور الفاظ کی سادگی ہے۔ اس لحاظ سے فارسی کے مشہور شاعر ظہیر فاریابی پر سبقت لے گئے ؎

سپیدہ دم کہ نسیم بہار مے آید | نگاہ کردم و دیدم کہ یار مے آید
شراب در سر و چہرہ ز شرم رنگ آمیز | چنیں میانہ شرم و خمار مے آید
ز بسکہ داشت دل خستہ بستہ در فتراک | چناں نمود مرا کز شکار مے آید

۴- ہجو گوئی میں لطافت پیدا کی۔ ہجو گوئی کا معیار سوزنی اور انوری نے گرا دیا تھا۔ یہ ہجوؤں کی زبان بن گئی تھی۔ کمال نے اس میں نفاست و لطافت پیدا کی جس سے ہجو کا نشانہ (امیر یا حاکم) خود مزہ لیتا تھا۔ کمال نے ہجو میں ظرافت کا رنگ پیدا کر کے اسے خوشگوار صورت دی۔ ایک بخیل کی ہجو میں فرماتے ہیں ؎

بدہن نانِ خواجہ چوں بُردم | خواجہ گفتا کہ آہ من مُردم

گفتمش خواہ مہر و خواہ ستیز — کہ من این لقمہ را فرو بُبردم

۵۔ غزل کی نسبت یہ امر مسلّم ہے کہ سب سے پہلے غزل کا خاکہ کمال نے ہی قائم کیا جس کو شیخ سعدی نے اس قدر ترقی دی کہ وہ جہاں تک گئے۔ کمال نے غزل میں سادگی، صفائی، رنگینی اور جدّتِ مضمون پیدا کیا۔

دوشش بگذشتم و دشنام ہمی داد مرا — خدمتش کردم و پنداشت کہ من نشنیدم
چون انداز دمن تیرے کشتم در سینۂ پنہانش — باران تا از پے تیر تیرے دیگر اندازد
بود ہمیشہ جانِ من رسم تو بے گنہ کشتی — ہیچ نہ کشتی مرا من چہ گناہ کردہ ام

۶۔ رباعی کو جس قدر کمال نے ترقی دی اس کی نظیر قدما اور متوسطین میں نہیں ملتی ؎

در دادۂ روزگار کم باشتے — یا با غم او صبر بہم باشتے
یا مایۂ غم چون عمر کم باشتے — یا عمر بہ اندازۂ غم باشتے

سوال: اوحدی مراغہ ای پر مختصر نوٹ سپردِ قلم کیجئے۔

جواب: رکن الدین اوحدی مراغہ کا رہنے والا تھا اور ۶۷۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوا۔ اس کی ولادت مراغہ میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم و تربیت بھی وہیں ہوئی لیکن زندگی کا بیشتر حصہ اصفہان میں بسر کیا۔ شاعر کو مشہور صوفی و عارف ابو حامد اوحد الدین کرمانی سے بیعت تھی۔ اس نسبت سے ہی اوحدی تخلص کیا۔

اوحدی آذربائجان کے مشہور صوفی شعرا میں سے تھا اور دینیات، تصوّف، عرفان اور اخلاق کے مسائل میں کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ اسے آخری مغل ایل خان ابو سعید کے عہد میں خاصی شہرت

وعزت حاصل ہوئی۔

اوحدی نے اپنے قصائد میں سلطان ابوسعید ایل خانی اور اس کے وزیر غیاث الدین محمد بن خواجہ رشید الدین فضل اللہ کی مدح سرائی کی ہے۔ اوحدی کے دیوان میں قصاید کے علاوہ غزلیات میں عرفان وتصوف کے مضامین خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کئے ہیں۔ قصاید میں مدح گوئی کے ساتھ ساتھ معرفت کے نکتے بھی بیان کئے ہیں۔ عزلیوں میں زور اور لطافت ہے۔ اس کے علاوہ ایک مثنوی "منطق العشاق" بھی ہے جو وجیہہ الدین شاہ یوسف (نبیرہ خواجہ نصیر الدین طوسی) کے نام پر معنون ہے۔ اس مثنوی کا دوسرا نام "دہ نامہ" ہے۔

اوحدی کی ایک اور بلند پایہ اور مشہور مثنوی "جام جم" ہے۔ یہ سلطان ابوسعید ایل خانی کی مدح میں ہے۔ اور اس کے وزیر غیاث الدین محمد کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔ یہ مثنوی پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ۷۳۳ھ میں لکھی گئی۔ پہلی مثنوی "دہ نامہ" ۷۰۶ھ میں نظم ہوئی۔ اوحدی نے ۷۳۸ھ میں انتقال کیا اور مراغہ میں مدفون ہوا۔

اوحدی کی شہرت کا مدار زیادہ تر اس کی مثنوی "جام جم" پر ہے۔ اس میں تصوف اور معرفت کے دقیق مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اخلاق اور پند وموعظت کا رنگ بھی خوب ہے۔ اس مثنوی کو فارسی ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

نمونہ کلام :-

عادل بے علم ہیچ و ہم نکند | حکم بے عادل و علم اثر نکند
بر قوی پنجہ دست کیں مکشا | بر حقیقت و زبوں کمیں مکشا

شرم دارا ے پدر ز فرزنداں | ناپسند یدہ ہیچ مپسنداں
با پسر قول زشت و فحش مگو | تا نگیرد نہ بیم و قاعدہ گو
بچۂ خویش را بناز مدار | نظرش ہم ز کار باز مدار
چوں بخواری بر آید و سختی | نکشد محنت او ز بد بختی

سوال: امیر خسروؔ کی زندگی کے حالات لکھئے اور اس کی شاعری کا تنقیدی جائزہ پیش کیجئے۔

جواب: ایران میں عہد ایلخانی فارسی شاعری کے لئے کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ لیکن ہندوستان میں نظامی گنجوی کی روح کام کر رہی تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں ایک بہت بڑا شاعر وجود میں آیا جس کا فارسی کلام اہل زبان (ایرانیوں) تک کے لئے قابل رشک ہے۔ وہ امیر خسروؔ تھا۔ نام اس بادشاہ سخن کا یمین الدولہ ہے۔ امیر تیمور کا ہم وطن تھا۔ سیف الدین محمود باپ اس کا چنگیز خاں کے زمانے میں شہر کش سے بھاگ کر ہند میں آیا۔ ناصر الدین محمود ابن شمس الدین التمش بادشاہ دہلی نے ارکان دربار میں داخل کر لیا۔ غیاث الدین بلبن کی طرف سے چند روز سند صوبہ پنجاب کی پائی۔ وہ قضائے الٰہی سے ایک لڑائی میں مارا گیا۔ خسرو اس

وقت سات یا نو برس کا تھا۔ خسرو کا بڑا بھائی یا نانا اس کا بجائے اس کے نوکری پادشاہی بجالاتا تھا اور اس کی پرورش کرتا تھا۔

امیر خسرو ۱۲۵۳ء میں بمقام پٹیالی پیدا ہوا۔ اس زمانہ کے ایک ولی مشہور تھے۔ باپ اُسے ان کے پاس لے گیا۔ انہوں نے دور سے دیکھتے ہی کہا۔ تو صاحب کمال کو لئے آتا ہے کہ جو خاقانی سے کئی قدم آگے بڑھ کر قدم مارے گا۔ سلطان نظام الدین اولیاء کے دل میں ان کی گرمیٔ کلام کا ایسا اثر ہوتا تھا کہ اشعار سن کر مزے لیتے تھے اور کہتے تھے۔ الٰہی ترک بچے کے سوز دل کا واسطہ میرے گناہ بخش دے"

اسپرنگر صاحب کہتے ہیں کہ خسرو شہزادہ محمد سلطان ابن غیاث الدین بلبن کے دربار میں ملازم ہوا۔ خسرو کو قرآن داری کی خدمت تھی۔ اگرچہ خسرو علم فاضلانہ اور طبع حکیمانہ رکھتا تھا لیکن نیکوکاری اور بے آزاری کو اپنا دستور العمل کیا تھا۔ عبادت اور ریاضت کے ساتھ مذہب صوفیانہ اور بے تعصب رکھتا تھا شاعری میں ایسا نازک خیال اور صاحب اختراع کم پیدا ہوا ہے۔ بہت سے صنائع و بدائع میں خود صاحب ایجاد ہے۔ قصاید اس کے خاقانی اور انوری سے مرتبہ میں کم نہیں۔ بلکہ صنائع و بدائع تجنیس، ایہام وغیرہ میں متقدمین پر فائق ہے۔

امیر خسرو کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی تحصیل تمام تھی لیکن تذکرہ نویسوں نے اس کے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی تاہم یہ قطعی ہے کہ پندرہ بیس برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم و

فنون سے فارغ ہو چکے تھے۔

امیر خسرو کی شاعری کا شہرہ ہو چکا تھا جب سلطان محمد نے ان کو بلا کر شعرائے خاص میں داخل کیا۔ جب وہ ملتان کا حاکم مقرر ہو کر گیا تو ان کو دوران کے ساتھ حسن دہلوی کو بھی ساتھ لے گیا۔ پانچ برس تک یہ اس کے دربار میں رہے۔

ارغوخاں ہلاکو خاں کا پوتا تھا۔ اس کے امرا میں سے تیمور خاں نے جن دنوں ہندوستان پر حملہ کیا وہ امیر خسرو اور حسن کو گرفتار کر کے بلخ لے گیا۔ امیر خسرو نے نہایت پُر اثر مرثیے لکھے اور دلی بھیجے دو سال گذرنے پر امیر کو تاتاریوں کی قید سے کسی طرح رہائی نصیب ہوئی اور وہ دہلی میں واپس آ گئے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کی موت کے بعد سلطان جلال الدین خلجی نے اپنی تخت نشینی کے بعد خسرو کو اپنا ندیم خاص بنایا۔ جلال الدین خلجی کے بعد علاؤالدین خلجی اور اس کے بعد قطب الدین مبارک تخت نشین ہوا۔ قطب الدین امیر خسرو کو نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے مثنوی "نہ سپہر" کے معاوضہ میں امیر کو ہاتھی کے برابر روپے تول کر دیئے۔

خلجی خاندان کے خاتمہ کے بعد سلطان غیاث الدین نے خسرو کی خوب قدردانی کی۔ امیر نے اس کے نام پر "تغلق نامہ" لکھا جس میں تغلق کے عہد حکومت کی تاریخ مفصل درج ہے۔ خسرو نے ۱۳۲۵ء میں انتقال کیا۔

امیر خسرو علم موسیقی میں مہارت کلی رکھتے تھے۔ کئی رسالے

اس فن میں ان کی تصنیف سے ہیں "ترانہ" انہیں کی ایجاد ہے۔
ریاضی کے فن پر بھی آپ کی تصنیفات موجود ہیں۔

پنج گنج نظامی کے مقابلے میں امیر خسرو نے خمسہ لکھا ہے۔
بعض اہل تنقید خمسہ خسروی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ اس ترجیح
میں قدرے مبالغہ نظر آتا ہے۔

خمسہ خسروی میں ذیل کی مثنویاں شامل ہیں:۔

۱۔ مطلع الانوار: یہ مثنوی نظامی کی مثنوی مخزن الاسرار کے
جواب میں لکھی گئی۔ اس میں دینی اور اخلاقی مضامین اور مسائل ہیں۔
یہ ۶۹۸ھ میں تصنیف ہوئی اور علاء الدین محمد شاہ کے نام سے
منسوب کی گئی۔

۲۔ شیریں و خسرو: یہ مثنوی نظامی کی اسی نام کی مثنوی کے
جواب میں سنہ ۶۹۸ھ میں منظوم ہوئی۔ یہ مثنوی بھی علاؤالدین محمدؒ
کے نام پر معنون کی گئی۔

۳۔ مجنوں و لیلیٰ: یہ مثنوی نظامی کی مثنوی لیلیٰ و مجنوں کے
مقابلے پر لکھی گئی۔ یہ مثنوی بھی مذکورہ بالا سال یعنی سنہ ۶۹۸ھ میں
پایۂ اختتام کو پہنچی۔

۴۔ آئینہ سکندری۔ یہ مثنوی نظامی کی مثنوی "سکندر نامہ"
کا جواب ہے۔ اور سنہ ۶۹۹ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ بھی اسی سلطان یعنی
علاؤالدین کے نام سے منسوب کی گئی۔

۵۔ ہشت بہشت: یہ مثنوی سنہ ۷۰۱ھ میں لکھی گئی اور نظامی
کی تصنیف "ہفت پیکر" کے جواب میں ہے۔

یہ پانچ مثنویاں تین سال کی مدت میں مکمل ہوئیں۔
ایک روایت کے مطابق امیر نے گلستانِ سعدی کی پیروی میں ایک کتاب "شکرستان" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ امیر خسرو کا دیوان ہے جس میں بیشتر قصاید ہیں جو دہلی کے سلاطین کی مدح میں ہیں۔ اس دیوان کے پانچ حصے ہیں:۔

۱۔ تحفۃ الصغر: یہ امیر خسرو کی جوانی کا کلام ہے جو قصائد، غزلیات اور ترجیع بند پر مشتمل ہے۔ ممدوحین میں سلطان غیاث الدین بلبن، اس کا بیٹا اور حضرت نظام الدین اولیاء شامل ہیں۔

۲۔ وسط الحیوۃ: یہ شاعر کے کلام کا وہ حصہ ہے جو بیس اور تیس سال کی عمر کے درمیان کہا گیا۔ اس میں وہ قصائد شامل ہیں جن میں سلطان بلبن، اس کے بیٹے اور شاعر کے مربی نصرت الدین سلطان محمد اور سلطان معز الدین کیقباد کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیا کی مدح کی ہے۔

۳۔ غرۃ الکمال: یہ اگلے دس سال کا کلام ہے۔ اس میں قصائد کے علاوہ فارسی شاعری کی خوبیوں اور عربی شاعری پر اس کی برتری کا بیان ہے۔ اور بلند پایہ شعرا مثلاً سنائی، خاقانی، سعدی اور نظامی کے ذکر سے استناد کیا ہے۔ قصائد میں سلطان کیقباد جلال الدین فیروز شاہ، رکن الدین اور علاء الدین وغیرہ کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیا کی مدح ہے۔ اس میں ترجیع بند اور قطعات بھی ہیں۔

۴۔ بقیہ نقیہ: یہ امیر کی پچاس سال کی عمر کے بعد کا کلام ہے۔

اس میں قصائد ہیں جن میں علاؤ الدین محمد شاہ اور اس کے بیٹے اور دیگر امراء کی مدح سرائی ہے۔

۵۔ نہایتہ الکمال۔ یہ کلام امیر کے بڑھاپے کے آخری ایام کا ہے۔ اس میں جتنے قصائد شامل ہیں وہ سلطان غیاث الدین تغلق کی مدح میں ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مرثیہ سلطان قطب الدین مبارک شاہ کا بھی ہے۔

مذکورہ بالا کلام کے علاوہ امیر خسرو کی اور تصنیفات منظوم و منثور یہ ہیں۔

قران السعدین، نہ سپہر، مفتاح الفتوح۔ آپ نے ہر قسم کے صنفِ نظم پر طبع آزمائی کی۔ مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مستزاد تضمین، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ۔ اشعار کی مجموعی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ برج بھاشا میں بھی آپ نے بہت کچھ کہا۔ انمل، پہیلیاں وغیرہ آپ کے نام سے مشہور ہیں۔ ترکی اور فارسی کے علاوہ عربی اور سنسکرت میں بھی کامل مہارت حاصل تھی۔

نثر میں آپ کی تصنیف اعجاز خسروی بھی ہے۔ یہ انشاپردازی کا قابل قدر نمونہ ہے۔ مناقب ہند، تاریخ دہلی بھی آپ کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

دول رانی اور خضر خاں میں آپ نے تاریخی واقعات کو نظم کیا ہے۔

سوال: عبید زاکانی کی زندگی اور شاعری پر نوٹ لکھئے:

جواب: عبید زاکانی ہجو اور ہزل میں نہایت مشہور شاعر ہے۔

ایسا فحش واہیات کہتا ہے کہ جیسے کوئی اشراف لکھ سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے۔ مگر باوجود اس کے جو کلام کہ اس روسیاہی سے پاک ہے وہ ایسا صاف اور نمکین ہے کہ شربتِ خضر کی لذت رکھتا ہے۔ زاکان ایک قصبہ کا نام ہے جو قزوین کے علاقے میں ہے۔ یہ اصل میں وہیں کا رہنے والا تھا۔ ابتدائے حال میں علوم درسیہ کو بڑے شوق سے حاصل کیا۔ علم معانی و بیان میں کتاب تصنیف کی قدردانی اور صلہ کی امید پر خوشی خوشی بادشاہ کے پاس لے چلا۔ جب دروازہ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس وقت بادشاہ کے پاس کوئی مسخرہ ہے کسی کو بار نہیں۔ عبید کو بُرا معلوم ہوا اور خیال کیا کہ جب جاہ و دولت اور بادشاہوں کی قربت میں کمال کا کوئی کام نہیں تو پھر راتوں کو جاگنا اور خونِ جگر کھا کر عیش و آرام کو اپنی جان پر حرام کرنے سے کیا حاصل؟ وہیں سے اُلٹا پھرا اور یہ رُباعی کہی سہ

در علم و ہنر مشو چو من صاحب فن	تا نزدِ عزیزاں نہ شوی خوار چو من
خواہی کہ شوی قبولِ اربابِ زمن	کنگ آور و کنگری کن و کنگرہ زن

اور اسی وقت سے ہزل اور ہجو میں پڑ کر ایسا واہیات بکنا شروع کیا کہ جس کی کچھ حد نہ رہی۔ باوجود اس کے فصاحتِ لفظی، الفاظ کی خوبی، صفائی نظم کی اور چستی بندش کی اور ترکیب کی ایسی ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی سنجیدہ نظموں میں شیراز کی تعریف نمایاں ہے۔ وہ سُنّی المذہب تھا جیسا کہ نبی کریم صلعم اور چاروں خلفا کی تعریف سے پتہ چلتا ہے۔ لیکن ہزلیات کے علاوہ کبھی اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب کی اتنی خواہش یا حمیت

اس کے دل میں موجود نہیں تھی۔ قرض اور مفلسی عبید کی قسمت میں ہمیشہ موجود رہتی تھی۔

شیخ ابو اسحاق انجو کے عہد میں عبید شیراز میں رہا۔ عبید کی موت ۱۳۷۱ء میں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بغداد یا تبریز یا ان دونوں مقامات پر اسے سلطان اویس کی سرپرستی حاصل تھی (شیخ اویس جلائری خاندان کے بانی شیخ بزرگ کا بیٹا اور جانشین تھا۔ خاندان جلائری ایلخانی طاقت کے زوال پر وجود میں آیا تھا) ہجو و ہزل گوئی میں عبید زاکانی سلطان سنجر کے درباری شاعر سوزنی کا پیرو کار تھا۔ نثر میں اخلاق الاشراف عبید زاکانی کی مشہور تصنیف ہے جس میں اس نے اخلاق کی رواجی کتابوں کا مذاق اڑایا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۴۰ء میں لکھی گئی۔ اس میں یاوہ سرائی سے قطع نظر بہترین طنز کا خوب حق ادا کیا گیا ہے۔ عبید کا مذاق سلیم مسلمہ ہے۔ اس کی شوخی اور جرأت سے کسی کو انکار نہیں۔ اس کے انداز بیان کی تقلید ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ دوسرے شاعروں کے سنجیدہ اشعار کی مضحکہ خیز تفسیر اس کا خاص فن ہے۔

اس کی تصنیف تعریفات اس وقت کے مذاہب اور رسم و رواج کی خوب خاک اڑاتی ہے۔ مثال کے طور پر چند تعریفیں ملاحظہ ہوں:۔

غور و فکر: وہ جو انسان کو بے فائدہ لے ڈوبتا ہے۔

عالم: وہ جسے اپنی روزی کمانے کی عقل نہ ہو۔

جاہل: خوش بختی کا لاڈلا۔

دلال : بازار کا رجسٹر شدہ چور۔
غم کے بعد خوشی، آخری طلاق وغیرہ وغیرہ۔
رسالہ چہار تشا کے سبق آمیز لطیفے اور رسالہ صد پند کے دل افروز چٹکلے عبید زاکانی کے کمال تجربات، واقفیت عامہ، دنیاداری اور اس کے علم و فن پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کی تصنیفات میں ارلیش نامہ، عشاق نامہ اور فالنامہ بھی شامل ہیں۔
عبید نے فارسی اور عربی نظم و نثر میں تقریباً ایک سی دسترس دکھائی ہے۔ انیسویں صدی کے مشہور ادیب مرزا حبیب اصفہانی نے ہزلیات میں عبید کی پیروی کی ہے اور بعض اوقات اس سے سبقت بھی لے گیا ہے۔
سوال: خواجو کرمانی کی زندگی کے حالات بیان کیجئے اور اس کی شاعری پر تنقید و تبصرہ لکھئے۔
جواب: کمال الدین ابو العطا محمود بن علی بن محمود خواجو کرمانی کی تاریخ ولادت کے متعلق محققین میں ابھی تک پورا اتفاق نہیں۔ براؤن تاریخ ادبیات ایران میں خواجو کی پیدائش کا سال ۶۷۹ھ مطابق ۱۲۸۱ء بتایا ہے لیکن خواجو کے کچھ اپنے اشعار سے جو کہ اس کی مثنوی "گل و نوروز" میں ملتے ہیں ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۶۸۹ھ مطابق ۱۲۹۰ء پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن مالوف یعنی کرمان میں ہی پائی۔
اس نے بچپن ہی میں ایک بار آنے والی شہرت اور مقبولیت کا خواب دیکھا تھا۔ اور یہ رفتار زمانہ کے ساتھ درست ثابت ہوتا گیا۔

خواجو کو کسی خاص دربار کا شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ سب سے پہلے اس نے مظفری خاندان کے بانی مبارز الدین محمد کے دربار میں شعر و شاعری کے گل کھلائے۔ اور بعد ازاں شیخ ابو اسحاق فرمانروائے شیراز کے دربار میں ممتاز ترین شاعر خیال کیا جانے لگا۔ یہاں سے وہ شیروان شاہ اور پھر قزل ارسلان شہزادہ عراق کے حضور میں جا پہنچا۔ تاہم اس کی زندگی کا بیشتر حصہ بغداد اور شیراز میں ہی بسر ہوا اگرچہ تمام عمر کرمان کی یاد ستاتی رہی۔

خواجو نے مشہور مرد کامل علاء الدولہ سمنانی سے تصوف کی تعلیم پائی۔

غزل کی بنیاد سعدی نے ڈالی اور امیر خسرو اور حسن نے اس کو ترقی دی۔ اگرچہ ان شیریں نواؤں کے سامنے خواجو کی غزل گوئی کو فروغ نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم وہ قصیدہ اور مثنوی میں اس قدر ممتاز اور نامور تھا کہ اس کے اثر نے غزل میں بھی کام دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ خواجو نے غزل میں کچھ جدتیں بھی پیدا کیں جو زمانہ کے مذاق و طبع کے موافق تھیں۔ اس طرح سے خواجو کی غزلوں میں شیخ سعدی کی سادگی و ادا اور شگفتگی بیان کے پہلو بہ پہلو ایک امتیازی رنگینی بھی آگئی حتیٰ کہ جب غزل کے بادشاہ خواجہ حافظ شیرازی نے آنکھیں کھولیں تو تمام ملک پر خواجو ہی کا رنگ چھا رہا تھا۔ جس طرح سے خواجو نے غزل نگاری میں سعدی کی پیروی کی تھی ویسے ہی خواجہ حافظ نے خواجو کی تقلید کی۔ حافظ نے خود فرمایا ہے ؎

اُستادِ غزل سعدی است پیشِ ہمہ کس امّا

دارد سخنِ حافظ طرزِ روشِ خواجو

خواجہ حافظ اور خواجو کی ہم طرح غزلوں میں جا بجا مصرعے تک لڑ گئے ہیں۔ اور مضامین اور ترکیبوں میں تو کثرت کے ساتھ توارد پایا جاتا ہے۔

سعدی، خسرو اور حسن تک غزل میں زیادہ تر عشق و عاشقی کے جذبات اور معاملات بیان کئے جاتے تھے۔ خواجو نے دنیا کی بے ثباتی، وسعتِ مشرب اور رندی و مستی پر زیادہ زور دیا۔ اکثر مسلسل غزلوں کو انہیں خیالات کے لئے وقف کر دیا۔ حافظ نے بھی اپنے کلام کے ایک معتد بہ حصے کی بنیاد انہیں خاکوں کو سامنے رکھ کر ڈالی۔

علامہ شبلی نعمانی نے خواجو اور حافظ کے کچھ اشعار کا موازنہ کیا ہے گرچہ حافظ کی ترجیح میں کسی کو کلام نہیں تاہم کچھ اشعار میں خواجو کے یہاں زیادہ بے تکلفی، رنگینی، معاملہ بندی، برجستگی، صفائی، لطافت، وسعت اور خوش بیانی پائی جاتی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں ؎

خواجو کرمانی	خواجہ حافظ
(۱)	(۱)
گر شدیم از بادہ بدنامِ جہاں تدبیر چیست ہمچنیں رفت است از روزِ ازل تقدیرِ ما	در خراباتِ مغاں ما نیز ہمدستاں شدیم کایں چنیں رفت است از روزِ ازل تقدیرِ ما
(۲)	(۲)
ما دلِ دیوانہ در زنجیرِ زلفت بستہ ایم اے بسا عاقل کہ شد دیوانۂ زنجیرِ ما	عقل اگر داند کہ دل در بندِ زلفش چوں خوش است عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیرِ ما

(۳)

از خدنگ آہِ عالم سوزِ ما غافل مشو — تیرِ آہِ ما ز گردوں بگذرد جاناں خموش
کز کمانِ نرمِ رحمش سخت باشد تیرِ ما — رحم کن بر جانِ خود پرہیز کن از تیرِ ما

(۴)

منزلِ یار قریب است چہ دوزخ چہ بہشت — ہمہ کس طالبِ یارند چہ ہشیار چہ مست
سجدہ گر بہ نیاز است چہ مسجد چہ کنشت — ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

خواجو کے رنگ تغزل کا ایک ہی شعر سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ؎

آزاد گشت از ہمہ آن کو غلامِ تست — بیگانہ شد ز خویش کسے کآشنائے تست

دنیا کی ناپائیداری کا بیان کس جوش اور عبرت آموز اشعار کے ساتھ کیا ہے ؎

مشو بہ ملکِ سلیمان و مالِ قارون شاد — کہ مال و ملک بود در رہِ حقیقت باد

براؤن کا خیال ہے کہ خواجو کے کلام میں اچھوتی یا امتیازی خوبیاں بہت کم ہیں۔ البتہ طرزِ ادا میں روانی اور رنگینی ہے۔ اکثر مشرقی نقادوں کو اس رائے سے اتفاق ہے کیونکہ غزل، قصیدہ اور مثنوی میں خواجو کو کئی اور شعرا نے مات کر دیا ہے۔

خواجو کے دیوان میں غزلیات اور قصائد کے علاوہ مقطعات اور رباعیات وغیرہ بھی ہیں۔ اس نے اپنے مشہور پیشرو نظامی گنجوی کی پیروی میں ایک خمسہ بھی لکھا ہے جس کو اس نے ۱۳۴۳ء میں مکمل کیا۔ اور جس میں ذیل کی مثنویاں شامل ہیں:۔

۱۔ ہمائے ہمایوں: تاریخی رنگ میں لکھی ہوئی عشقیہ داستان ہے۔ اس میں تین ہزار دو سو تین اشعار ہیں۔ ۷۳۲ھ میں پایۂ اختتام کو پہنچی۔

۲- گل و نوروز: یہ مثنوی نظامی کی مثنوی "خسرو شیریں" کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ اس میں دو ہزار چھ سو پندرہ اشعار ہیں۔ تاج الدین عراقی کے نام پر معنون ہے۔ خواجو کی بہترین مثنوی ہے۔

۳- روضۃ الانوار: یہ مثنوی نظامی کی مثنوی "مخزن الاسرار" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس کا موضوع عرفان و تصوف ہے۔ ۷۴۳ھ میں نظم ہوئی اور شیخ ابو اسحاق کے وزیر شمس الدین محمود صاین کے نام پر معنون ہے۔

۴- کمال نامہ: یہ مثنوی نظامی کے "ہفت پیکر" کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اور شیخ ابو اسحاق اینجو کے نام پر معنون کی گئی ہے۔ اس میں عرفان و تصوف کے مسائل پر بحث ہے۔

۵- گوہر نامہ: یہ مثنوی خسرو شیریں کے وزن پر لکھی گئی ہے۔ اور اس میں تصوف کے مضامین ہیں۔

اس کے علاوہ خواجو نے شاہنامہ فردوسی کے پیش نظر ایک تاریخی نظم بعنوان سامنامہ بھی لکھی۔

خواجو نے ۷۵۰ھ اور ۷۶۳ھ کے درمیان غالباً ۷۵۳ھ میں وفات پائی اور خواجہ حافظ کی مرغوب سیرگاہ "تنگ اللہ اکبر" میں مدفون ہوا۔

سوال: عراقی ہمدانی پر نوٹ لکھیے۔

جواب: عراقی نے ۶۸۹ھ میں وفات پائی۔ آپ کے کلام میں جا بجا پر جوش صوفیانہ خیالات، جدت ادا اور بلند بانگ جذبات کی لطیف چاشنی پائی جاتی ہے۔ عراقی ایک حد تک آزاد مشرب

قلندر تھے۔ جن کا مذہب محبت تھا۔ اور جنہیں کائنات کے ذرّے ذرّے میں محبت ہی کا نور موجزن نظر آتا تھا۔ حسنِ ازلی و ابدی کی جھلک آپ حُسن انسانی کے ہر آئینے میں دیکھتے تھے۔ سترّ برس کی عمر میں عراقی کو قلندروں کے ایک مجمع کے ساتھ ہندوستان میں آنا ہوا۔ جہاں آکر وہ ملتان میں شیخ بہاء الدین ذکریا کے مرید خاص ہو گئے۔ یہیں انہوں نے معرکہ خیز غزل کہی جس کا مشہور شعر یہ ہے ؎

بہ عالم ہر کجا درد و غمے بود　　بہم کردند و عشقش نام کردند

عراقی کے اشعار میں شاعر اعظم ابن العربی کا فلسفہ جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ عراقی عشقِ حقیقی کا جانا دادہ تھا۔ اس لئے اس کے کلام میں حقیقت کا پہلو غالب رہتا ہے۔ عراقی کی غزلوں میں زور ہے، گداز اور روانی۔ اس کے تخئیل میں ندرت ہے اور بیان میں جوش۔ اس کے وجد اور تغزل کا نمونہ حاضر ہے ؎

برلبِ خود بوسہ دہ و آنگہ ببیں　　ذوقِ آبِ زندگانی اے پسر

از روے لطف: و دلداری بیا سامانِ کارم کن
کہ خود را بے تو سامانے نمے بینم نمے بینم

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد　　کہ مرا خراب کردی بہ سجدۂ ریائی
چوں براہِ کعبہ رفتم بہ حرم رہم ندادند　　کہ بروںِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

غزلیات کے علاوہ نثر میں لمعات آپ کی مشہور ترین تصنیف ہے

جس کی تفسیر مولانا جامی نے لکھی ہے۔ دیوان کے علاوہ عراقی نے دو نظمیں بھی مثنوی کی صورت میں لکھیں۔ جن میں سے ایک کا نام عشاق نامہ ہے۔

سوال: ابنِ یمین کی زندگی کے حالات مختصر طور پر لکھیے اور اس کی شاعری پر تبصرہ کیجیے۔

جواب: ابنِ یمین کے والد کا نام محمود تھا۔ قوم کے ترک اور ترکستان وطن تھا۔ سلطان محمد خدا بندہ کے زمانے میں خراسان میں آئے۔ اور قصبہ فریومد میں قیام پذیر ہوئے۔ یہیں جائداد اور زمین خریدی۔ یہ زمانہ سلطان الجائتو کی حکومت کا تھا۔ اور علاء الدین محمد وزیر تھا۔ علاء الدین ان کا بڑا قدر دان تھا۔

ابنِ یمین فریومد میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری کا فن اپنے باپ سے سیکھا۔ اور ابتدا میں انہی طرحوں میں شعر کہے جن میں باپ کہتا تھا۔ شروع شروع میں سربداروں کی مداحی کی۔ آخر کار فقر و قناعت اختیار کی اور دربارداری سے کنارہ کش ہو گئے۔ تھوڑی سی زمین قبضہ میں تھی۔ اس پر کاشتکاری سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ۷۶۹ھ میں وفات پائی اور مرتے وقت یہ رباعی کہی ؎

منگر کہ دلِ ابنِ یمین پُر خوں شد | بنگر کہ ازیں سرائے فانی چوں شد
مصحف بکف و چشم بہ رہ روی بہ دوست | با پیک اجل خندہ زناں بیروں شد

ایرانی شعرا میں ایسے شاعر کم ہوئے ہیں جنہیں ابنِ یمین کی طرح زمانے کے مصائب و آلام سے اکثر سامنا کرنا پڑا۔ ابنِ یمین نے جگہ

جگہ کی خاک چھانی اور در در کی ٹھوکر کھائی۔ امیروں، سرداروں اور
سربداروں و تیموریوں کی باہمی لڑائیوں اور فتنہ و فساد کے سبب
ایران کے بہت سے حصوں خاص طور پر خراسان میں قتل و غارت
کا بازار گرم رہا شاعر کو جان بچانے کے لئے جا بجا گھومنا پڑا اور
ایک دربار سے دوسرے دربار میں پناہ لینی پڑی۔

شروع میں ابن یمین نے خواجہ علاء الدین محمد اور پھر اس کے
بھائی خواجہ غیاث الدین ہندو کی مدح سرائی کی جب سربداروں
نے اقتدار حاصل کیا تو وہ علاء الدین کے ساتھ گرگان چلے گئے۔ اور
وہاں طغا تیمور کی مدح کی۔ اس کے بعد خراسان کا رخ کیا۔ اور سربداروں
بالخصوص وجیہ الدین مسعود کی مدح میں قصیدے لکھے۔ اس کے
بعد ہرات چلے گئے اور امرائے آل کرت کے مداح ہوئے۔ ان میں
معز الدین سے خاص طور پر انعام و اکرام پایا۔

ابن یمین کی زندگی کا نہایت دردناک واقعہ اس کے کلام کا
تلف ہو جانا ہے۔ ۷۴۳ھ میں جب سربداروں اور آل کرت کے مابین
جنگ ہوئی تو شاعر کا دیوان گم ہو گیا۔ غالباً ضائع ہو گیا۔ شاعر کو بھی
گرفتار کر کے ہرات لایا گیا جہاں امیر حسین کے رحم و کرم سے رہائی
پائی۔ غلام علی آزاد ید بیضا میں لکھتے ہیں کہ میں نے ان کا دیوان دال
کی ردیف تک دیکھا ہے۔ لیکن یہ غالباً قطعات کا دیوان ہوگا۔ تذکروں
سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں وہ غزل اور قصائد سب کچھ لکھتے تھے
ید بیضا میں ان کی غزل کے بعض اشعار نقل کئے گئے ہیں ؎

سر فدائے دیدہ ہر دم اشک غمازرا   تا نسازد فاش پیش مردمان راز مرا

ز خود بیگانہ بودن در رہِ عشق بہ آں معشوق طرحِ آشنائی است

ان اشعار سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ غزل میں کم مایہ نہیں لیکن ان کا خاص رنگ اخلاقی شاعری اور اس میں بھی قناعت اور خود داری ان کا خاص حصّہ ہے۔ ان مضامین کو ان سے بہتر آج تک کوئی ادا نہ کرسکا اور چونکہ ان کا قال حال کی تصویر ہے اس لئے خاص اثر رکھتا ہے جو ہر شخص کے کلام میں پیدا نہیں ہوسکتا ؎

دو قرصِ نان اگر از گندم است یا از جو | دو جامہ اگر کہنہ ہست یا خود نو
بہ چار گوشۂ دیوار خود بخاطر جمع | کہ کس نگوید ازیں جا بخیز و آنجا رو
ہزار بار فزوں تر بہ نزدِ ابنِ یمین | ز فرِّ مملکتِ کیقباد و کیخسرو

اگر دو گاؤ بدست آری و مزرعۂ | یکے امیر و یکے را وزیر نام کنی
بداں قدر چو کفافِ معاشِ تو نہ شود | روی و نانِ جوے از یہود وام کنی
ہزار بار ازاں بہ کہ از پئے خدمت | کمر بندی و بر مرد کے سلام کنی

ابن یمین عالم و فاضل ہونے کے علاوہ بڑا پرہیزگار اور نیک دل تھا۔ خوش خلقی اور انکساری ان کی خاص خوبیاں تھیں۔ اوصافِ حمیدہ کے اکتساب کے بارے میں شاعر خود کہتا ہے ؎

من اندر کسبِ اسبابِ فضائل | نکردم ہیچ تقصیر و توانی
ہنر پروردہ ام زنیساں کہ بینی | بیا انکار کن گر می توانی

ابن یمین کے قطعات پند و موعظت کے مرقعے ہیں۔ ان میں شاعر نے سعی و کوشش اور جد و جہد کی تلقین کی ہے۔ زور بازو

اور عرق جبیں سے روزی کمانے کی ترغیب دی ہے۔ حرام کی کمائی سے اجتناب کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ شاعر نے نہ صرف ایسی تعلیم پیش کی ہے بلکہ اس پر خود عمل بھی کیا اور صبر و قناعت کی بے نظیر مثال سامنے رکھی۔ اور کامل طور پر گوشہ گیر ہو گئے۔ یہاں تک کہ دوستوں سے بھی ملنا ترک کر دیا ؎

گوشہ اے گیر و کناری ز ہمہ خلقِ جہاں ۔۔۔ تا میانِ تو و غیر ے نبود داد و ستد
بگذر از صحبتِ ہمدم کہ ترا ہست دلی ۔۔۔ ہیچو آئینہ و آئینہ ز دم تیرہ شود

ابن یمین مذہب کا شیعہ تھا اور صوفی طبع بھی۔ اس طبیعت کے تقاضے پر اس نے اشعار بھی کہے ہیں۔ وہ ان قدیم شعرا کے زمرے میں شامل ہے جنہوں نے ائمہ اور شہیدانِ کربلا کا ذکرِ خیر کیا ہے۔

ابن یمین نے قطعہ گوئی کے فن کو خاص صورت اور ترقی دی۔ اس سے پہلے قطعہ پر شعرا نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ قطعات میں ابن یمین نے ہر قسم کے اخلاقی نکتے بیان کئے ہیں۔ مثلاً حرص و آز اور دنیا پرستی کی مذمت کی ہے۔ خوشامد کو خاص طور پر ایک بری عادت قرار دیا ہے۔ شرافت اور راستبازی کی تعریف کی ہے۔ کم ہمتی اور کمینگی پر لعنت بھیجی ہے۔ ابن یمین کو تقدیر پر اعتماد تھا۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان کی روزی مقسوم و مقدر کر دی گئی ہے۔ اس لئے حرص و آز فضول ہے۔ اور ناکسوں کے آگے ہاتھ پھیلانا بے غیرتی اور جہالت ہے۔ کسی کی چاپلوسی کرنا حقارت آمیز فعل ہے۔ البتہ کوشش اور عمل زندگی کی شرط ہے۔ جد و جہد انسان کا فرضِ اولین ہے۔ انسان کو ہر حال میں راضی رہنا چاہیئے۔ قناعت اور صبر راحت و سرور کی

گئی ہے۔ افلاس میں بھی ظاہرداری اور ہمت کے اظہار کی یوں تلقین کی ہے ؎

بگاہ فقر توانگر نمائی ہمت باش — کہ گرچہ ہیچ نداری بہ رنگ دارندت
نہ آنکہ باہمہ ہستی شوی خسیس مزاج — شوی اگرچہ توقارون گدا شمارندت

مطلب یہ کہ مال سے کمال بہتر اور فزوں تر ہے۔ جیسا کہ سعدی نے فرمایا ہے ؎

توانگری بدل است نہ بمال
بزرگی بہ عقل است نہ بسال

الغرض ابن یمین ایک بے مثال اخلاقی شاعر ہے۔ جس نے دین و ایمان اور اخلاق و عرفان کے نکتے سادہ زبان اور پُرتاثیر ادا میں بیان کئے ہیں اس کے قصائد اور غزلیات میں بھی یہی رنگ غالب ہے۔

سوال: سلمان ساوجی کی زندگی کے واقعات مختصراً بیان کیجئے اور اس کی شاعری پر مفصل تبصرہ قلم بند کیجئے۔

جواب: صاحب آتش کدہ کے مطابق خواجہ جمال الدین سلمان ابن خواجہ علاء الدین محمد بمقام ساوہ پیدا ہوئے۔ سلمان جلائر خاندان کے بانی شیخ حسن بزرگ اور اس کے بیٹے شیخ اویس کا درباری شاعر تھا۔

خواجہ سلمان کی ابتدائی تقریب کا یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے حسن ایلخانی کی فیاضیوں کا شہرہ سن کر بغداد کا قصد کیا اور دربار میں پہنچے۔ ایک دن حسن تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا سلمان بھی اس

موقع پر موجود تھے۔ برجستہ یہ اشعار لکھکر پیش کئے ؎

چو در بازِ چاچی کمان رفت شاہ — تو گفتی کہ در برجِ قوس است ماہ
دوتا شد کماں با تقاضای پیر — بلرزید ہم یک گوشہ آوردہ سر
نہادند سر بر سرِ گوش شاہ — ندانم چہ گفتند در ہوش شاہ
چو از شست بکشاد خسرو گرہ — بر آمد ز ہر گوشہ آوازہ
شہا! تیر در بندِ تدبیر تست — سعادت دواں در پے تیر تست

یہ شعر سُن کر حسن نے سلمان کو اس کی غیر معمولی قادر الکلامی کی بدولت اپنے مقربین خاص میں داخل کیا۔

سلطان حسن کی حرم دلشاد خاتون نہایت قابل اور لائق عورت تھی۔ سلطان برائے نام بادشاہ تھا۔ سلطنت کا نظم و نسق دلشاد خاتون کے ہاتھ میں تھا۔ وہ شعرا اور علما کی قدردانی کرتی تھی۔ سلمان نے بھی اس کی مدح میں جی کھول کر زورِ طبع دکھایا۔

سلطان اویس کو شاعری کے ساتھ خاص لگاؤ تھا۔ خود شعر کہتا تھا اور سلمان سے اصلاح لیتا تھا۔ اس بنا پر سلمان نے اس کے دربار میں نہایت تقرب حاصل کیا۔

ایک دفعہ سلمان رات کے وقت سلطان اویس کی مجلسِ عیش میں شریک تھے جلسہ ختم ہو چکا تو سلمان اُٹھے۔ سلطان نے ملازم ساتھ کر دیا کہ روشنی دکھانے کے لئے شمع ساتھ لے جائے۔ گھر پہنچے تو ملازم شمع وہیں چھوڑ آیا۔ صبح کو شمع لینے گیا تو خواجہ صاحب اس بنا پر گھبرائے کہ شمع کے ساتھ طلائی شمعدانی بھی تھی۔ وہ بھی ہاتھ سے جاتی ہے۔ اسی وقت یہ شعر لکھ کر ملازم کو دیا کہ سلطان کی خدمت

میں پیش کرتا ہے

شمع خود سوخت بہ زاری شبِ دوش و امروز
گر لگن مے طلبد شاہ زمن مے سوزم

سلطان نے ہنس کر کہا کہ شاعر سے کوئی چیز کون واپس لے سکتا ہے۔
سلمان جب بہت ضعیف ہو گئے تو ملازمت سے استعفا دینا چاہا اور مسلسل چار قطعے لکھ کر پیش کئے لیکن سلطان نے مزید انعام و اکرام کا لالچ دے کر مستعفی ہونے سے روکا۔

آخر سلمان نے گوشہ نشینی اختیار کی اور جب تک زندہ رہے ہر قسم کے تعلقات سے آزاد رہے۔ حسب روایت دولت شاہ ۷۶۹ھ میں وفات پائی لیکن مولوی غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ میں نے سلمان کا ایک نسخہ ۷۹۱ھ کا لکھا ہوا دیکھا۔

تبصرہ: سلمان کی شاعری کے کمال کا تمام اساتذہ نے اعتراف کیا ہے۔ خواجہ حافظ جو اس کے معاصر تھے فرماتے ہیں ۔

سر آمد فضلائے زمانہ دانی کیست — زراہ صدق و یقین نے زراہِ کذب و گماں
شہنشہ فضلا بادشاہِ ملکِ سخن — جمالِ ملت و دیں خواجۂ جہاں سلماں

سلمان نے شاعری کی عمارت کمال اسماعیل اور ظہیر فاریابی کی داغ بیل پر قائم کی۔ اکثر قصائد انہی دونوں کے جواب میں اور اسی طرز میں لکھے ہیں۔ مولانا جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ سلمان کے اکثر مضامین اساتذۂ قدیم خصوصاً کمال اسماعیل سے ماخوذ ہیں۔ لیکن سلمان نے ان کو اس قدر ترقی دی کہ جائے اعتراض نہیں۔

شاعری میں سلمان کا ایک خاص درجہ ہے۔ یعنی وہ قدما اور

متوسطین میں برزخ ہیں۔ ان کا کلام قدما کے دور کا خاتمہ اور متوسطین کا آغاز ہے۔ انہوں نے کمال اسماعیل اور ظہیر سے زبان کی صفائی اور شستگی لی ہے اور اس میں ایجاد مضامین کی رنگ آمیزی کی ہے۔ مضمون بندی جو متوسطین اور متاخرین کا مابہ امتیاز ہے گو کمال نے شروع کی لیکن سلمان نے اسے حدِ کمال تک پہنچا دیا۔

سلمان نے قصیدہ، مثنوی، غزل سب کچھ کہا ہے۔ مثنوی "جمشید و خورشید" ان کی مشہور مثنوی ہے۔ البتہ سلمان کی شاعری کا اصلی میدان قصیدہ گوئی ہے۔

قصائد سلمان کی خصوصیات

۱۔ زبان کی صفائی اور روانی۔ ۲۔ تراکیب میں چستی۔ ۳۔ مضمون آفرینی (۴) نازک خیالی۔ ۵۔ تخلص یعنی گریز میں جدّت پیرایہ۔ ۶۔ مشکل ردیفیں روانی اور صفائی کے ساتھ۔

سلمان نے نہایت کثرت کے ساتھ قطعات لکھے ہیں اور ان میں ہر قسم کے عجیب و غریب مضامین ادا کئے ہیں۔ مثلاً گھوڑے کی ہجو و تعریف، دربار میں جانے سے معذرت کا اظہار، بارش، پیر کپڑے نہ رہنے کا گلہ وغیرہ وغیرہ۔

سلمان سب سے پہلے شخص ہیں جس نے صنعتِ ایہام کو نہایت کثرت سے برتا ہے۔ اور اس میں اکثر لطیف اور نئے نئے پیرائے پیدا کئے ہیں۔ لیکن اکثر اس قدر بے اعتدالی برتی کہ ضلع و جگت کی حد تک نوبت پہنچ گئی۔

سلمان کی غزلیں چنداں مقبول نہیں ہوئیں۔ ان سے پہلے سعدی کا رنگ عالم کو مسخر کر چکا تھا۔ اس رنگ میں وہ کچھ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے مضمون آفرینی شروع کی۔ لیکن لوگوں نے توجہ نہ دی کیونکہ ان کے کانوں میں سعدی کی لے گونج رہی تھی۔ سعدی ہی کا رنگ جب خواجہ حافظ نے اختیار کیا اور اس شراب کو اور تیز کر دیا تو بقول

"حریفان را نہ سر ماند و نہ دستار"

اہلِ ذوق کی ضیافت طبع کے لیے سلمان کا ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔

یکشب خیالِ چشم تو دیدیم با بخواب　　زاں شب دگر بچشم ندیدیم خواب را

سوال: خواجہ حافظ کی زندگی اور اس کے کلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالیے۔

جواب: ترجمان البلاغت لسان الغیب خواجہ شمس الدین محمد حافظ ۷۲۰ھ مطابق ۱۳۲۰ء میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا اصفہان کے مضافات کے رہنے والے تھے۔ اتابکانِ فارس کے وقتوں میں شیراز میں آئے۔ اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ خواجہ صاحب کے والد بہاء الدین نے تجارت سے بہت فائدہ اٹھایا۔ خواجہ صاحب کے بچپن ہی میں خواجہ بہاء الدین انتقال کر گئے۔ خواجہ صاحب کے

بچپن ہی میں خواجہ بہاء الدین انتقال کر گئے۔ خواجہ صاحب کے

دوسرے بھائیوں کو انتظام کا کوئی سلیقہ نہ تھا۔ اس لئے تھوڑے عرصے میں ہی باپ کی کمائی اڑ گئی۔ گھر میں فاقے ہونے لگے۔ خواجہ صاحب سنِ شعور کو پہنچے تو خمیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا۔ آدھی رات

سے اٹھ کر صبح تک خمیر گوندھتے۔ گھر کے پاس ہی ایک مکتب تھا۔ محلے کے سب لڑکے اسی میں پڑھتے تھے۔ خواجہ صاحب اکثر ادھر سے نکلتے تو دل میں تعلیم کا شوق پیدا ہوتا۔ رفتہ رفتہ یہ شوق اس قدر بڑھا کہ مکتب میں داخل ہو گئے۔ خمیر سے جو کچھ حاصل ہوتا اس میں سے ایک تہائی ماں کو اور ایک تہائی معلم کو دے دیتے۔ بقیہ خیرات کرتے مکتب میں قرآن مجید حفظ کیا۔ یہی مناسبت آپ کے تخلص کا موجب ہوئی۔

اس زمانہ میں شعر و شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ خواجہ صاحب نے بھی طبع آزمائی کی۔ شروع میں چونکہ طبیعت موزوں نہ تھی آپ کے بے تکے اشعار اور لغو گوئی کا جگہ جگہ مذاق اڑایا جاتا۔ دو سال تک یہی حالت رہی۔ ایک دن حد سے زیادہ رنجیدہ ہوئے اور باباکوہی کے مزار پر جا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو لقمہ کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جا اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے۔ نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جناب خضر علیہ السلام ہیں۔ صبح کو اٹھے تو اپنی وہ شہرۂ آفاق غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند   واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

پھر کیا تھا آپ کی موزونیٔ طبع اور لطافتِ سخن کے چرچے پھیل گئے مولانا شبلی کا خیال ہے کہ خوش اعتقادی اور وہم پرستی ان واقعات کے دو بڑے ستون ہیں۔

خواجہ صاحب کی رنگ و بوسے معمور زندگی کے بیشتر ایام مظفری

شہزادوں کے زیر سایہ بسر ہوئے۔ آپ نے اپنی زندگی میں بہت سے سیاسی انقلابات دیکھے ۷۵۳ھ/۱۳۵۳ء میں شاہ ابو اسحاق انجو کا عہد سلطنت ختم ہو کر مظفری خاندان کا دور دورہ شروع ہوا۔ محمد بن مظفر مبارز الدین شیراز اور فارس کا حکمران بنا۔ اس نے تمام میخانے بند کرا دیے۔ خواجہ حافظ نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی تھی ؎

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلریز است   بہ بانگِ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است

امیر مبارز الدین کے بعد اس کا بیٹا شاہ شجاع فرمانروا ہوا۔ اس نے میخانوں کو روک ٹوک سے آزاد کر دیا۔ اور آزادیٔ تجارت کی اجازت دے دی۔ اس سلسلے میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں ؎

سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش   کہ دورِ شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

شاہ شجاع نے ۷۸۶ھ میں انتقال کیا۔ اس کے بعد شاہ منصور بن محمد مظفر بادشاہ بنا۔ منصور کے عین عروج اقبال کا زمانہ تھا کہ تیمور نے شیراز پر حملہ کیا۔ چنانچہ ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء میں خاندان مظفری کا بھی صفایا ہو گیا تیمور نے خواجہ حافظ کو طلب کیا اور کہا "میں نے تمام عالم کو اس لئے ویران کیا کہ سمرقند اور بخارا کو آباد کروں۔ تم ان کو ایک تل کے عوض میں دیئے ڈالتے ہو۔ تیمور کے پیشِ نظر خواجہ صاحب کا یہ شعر تھا ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را   بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ صاحب نے تیمور کو جواب دیا کہ "انہی فضول خرچیوں کی بدولت تو اس فقر و فاقہ تک نوبت پہنچی۔

یہ وہ سیاسی انقلابات تھے جن سے حافظؔ کے دل پر دنیا کی بے ثباتی کا گہرا اثر ہوا ؎

مجو درستیٔ عہد از جہانِ سست نہاد　　که این عجوز عروسِ ہزار داماد است

اس وقت تک خواجہ صاحب کی غزلیں چار دانگ عالم میں پھیل چکی تھیں خود فرماتے ہیں ؎

بشعرِ حافظِ شیراز مے گویند و مے رقصند　　سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

طے مکان ببین و زمان در سلوکِ شعر　　کاین طفلِ یک شبہ رہِ یک سالہ می رود

اس زمانہ میں جس قدر سلاطین تھے سب آرزو رکھتے تھے کہ خواجہ صاحب کے کلام سے لطف اٹھائیں۔ چنانچہ عراق، عرب، دکن اور بنگال وغیرہ ہر جگہ سے شوقیہ خطوط آئے۔ لیکن وطن کی محبت تھی کہ آپ کا دامن چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتی تھی ؎

نمے دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر　　نسیمِ خاکِ مصلےٰ و آبِ رکنا باد

اس کے علاوہ آپ مال و دولت کی ہوس میں جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے ؎

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد　　بمے بفروش دلقِ ما کزیں بہتر نمے ارزد

حافظ کے مزاج میں خودداری، بے نیازی اور آزاد مشربی تھی۔ تاہم ضرورت کے لحاظ سے آپ کو کئی مدحیہ اشعار بھی لکھنے پڑے۔ گو یہ طرح خوشامد کی حد تک نہیں پہنچتی تھی۔ آپ کے ممدوحین میں شاہ ابواسحاق انجو، امیر مبارز الدین، شاہ شجاع مظفری، شاہ منصور اور سلطان احمد بن اویس جلائری فرمانروائے بغداد اور حاجی قوام الدین حسن وغیرہ شامل ہیں اگر صلہ نہیں ملتا تھا تو ہجو شروع نہیں کر دیتے تھے۔

شہزادوں کے زیر سایہ بسر ہوئے۔ آپ نے اپنی زندگی میں بہت سے
سیاسی انقلابات دیکھے سنہ ۱۳۵۳ء میں شاہ ابو اسحاق انجو کا عہد سلطنت
ختم ہو کر مظفری خاندان کا دور دورہ شروع ہوا۔ محمد بن مظفر مبارز الدین
شیراز اور فارس کا حکمران بنا۔ اس نے تمام میخانے بند کرا دیئے۔ خواجہ
حافظ نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی تھی ؎

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است ‌‌ بہ بانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است

امیر مبارز الدین کے بعد اس کا بیٹا شاہ شجاع فرمانروا ہوا۔ اس
نے میخانوں کو روک ٹوک سے آزاد کر دیا۔ اور آزادی تجارت کی اجازت
دے دی۔ اس سلسلے میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں ؎

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش ‌‌ کہ دور شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

شاہ شجاع نے سنہ ۷۸۶ھ میں انتقال کیا۔ اس کے بعد شاہ منصور
بن محمد مظفر بادشاہ بنا۔ منصور کے عین عروج اقبال کا زمانہ تھا کہ تیمور
نے شیراز پر حملہ کیا۔ چنانچہ سنہ ۱۳۸۷ء میں خاندان مظفری کا بھی صفایا ہو گیا
تیمور نے خواجہ حافظ کو طلب کیا اور کہا "میں نے تمام عالم کو اس
لیئے ویران کیا کہ سمرقند اور بخارا کو آباد کروں۔ تم ان کو ایک تل کے عوض
میں دیئے ڈالتے ہو۔ تیمور کے پیش نظر خواجہ صاحب کا یہ شعر تھا ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را ‌‌ بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ صاحب نے تیمور کو جواب دیا کہ "انہی فضول خرچیوں کی بدولت
تو اس فقر و فاقہ تک نوبت پہنچی۔"

یہ وہ سیاسی انقلابات تھے جن سے حافظ کے دل پر دنیا کی
بے ثباتی کا گہرا اثر ہوا ؎

مجو درستیٔ عہد از جہانِ سست نہاد — کہ ایں عجوز عروسِ ہزار داماداست

اس وقت تک خواجہ صاحب کی غزلیں چار دانگ عالم میں پھیل چکی تھیں خود فرماتے ہیں ؎

بہ شعرِ حافظِ شیراز مے گویند و مے رقصند — سیہ چشمانِ کشمیری و ترکان سمرقندی

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

مکاں سبیں رماں در سلوکِ شعر — کایں طفلِ یک شبہ رہِ یک سالہ میرود

اس زمانہ میں جس قدر سلاطین تھے سب آرزو رکھتے تھے کہ خواجہ صاحب کے کلام سے لطف اٹھائیں۔ چنانچہ عراق، عرب، دکن اور بنگال وغیرہ ہر جگہ سے شوقیہ خطوط آئے۔ لیکن وطن کی محبت تھی کہ آپ کا دامن چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتی تھی ؎

نمے دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر — نسیم خاک مصلّے و آب رکنا باد

اس کے علاوہ آپ مال و دولت کی ہوس میں جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے ؎

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد — بمے بفروش دلقِ خود کزیں بہتر نمے ارزد

حافظ کے مزاج میں خودداری، بے نیازی اور آزاد شربی تھی۔ تاہم ضرورت کے لحاظ سے آپ کو کئی مدحیہ اشعار بھی لکھنے پڑے۔ گو یہ مدح خوشامد کی حد تک نہیں پہنچتی تھی۔ آپ کے ممدوحین میں شاہ ابو اسحاق انجو، امیر مبارز الدین، شاہ شجاع مظفری، شاہ منصور اور سلطان احمد بن اویس جلائری فرمانروائے بغداد اور حاجی قوام الدین حسن وغیرہ شامل ہیں اگر صلہ نہیں ملتا تھا تو ہجو شروع نہیں کر دیتے تھے۔

خواجہ صاحب نے ۷۹۳ھ (۱۳۸۹ء) میں وفات پائی اور اپنے محبوب مقام مصلّے میں مدفون ہوئے۔ تاریخ وفات "خاکِ مصلّی" ہے۔ خواجہ صاحب کے مقبرے کا نام حافظیہ ہے۔ ہفتہ میں ایک خاص دن لوگ زیارت کے لئے آتے ہیں۔ کہیں کہیں شراب کا دور بھی چلتا ہے۔ کوئی رنگین مزاج خواجہ کے نام کا حصّہ خاک پر گرا دیتا ہے۔ خواجہ صاحب نے موت سے کئی سال پہلے ہی فرما دیا تھا ؎

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ — کہ گرچہ غرقِ گناہ است می رود بہ بہشت

اور ؎

بر سرِ تربتِ ما چوں گذری ہمت خواہ — کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود

خواجہ صاحب کی آوارہ مزاجی اور رندی سے قیاس ہوتا ہے کہ بیوی بچّوں کے بکھیڑوں سے آزاد ہوں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ شادی بھی کی تھی اور اولاد بھی تھی۔ صاحبزادے کا نام شاہ مغاں تھا۔ وہ ہندوستان میں آئے اور یہیں برہان پور کے مقام پر وفات پائی۔

خواجہ صاحب کے کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے علوم درسیہ کی تحصیل مستعدانہ کی تھی۔ اکثر غزلوں میں عربی کے مصرعے جس برجستگی سے آئے ہیں اس سے آپ کی عربی دانی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ خود کہتے ہیں ؎

اگرچہ عرض ہنر پیش یار بے ادبی است — زبان خموش ولیکن دہان پُر از عربی است

قرآن کریم اور تفسیر کے ساتھ آپ کو خاص لگاؤ تھا۔ خوش آوازی سے آیاتِ سبحانی پڑھنے میں آپ کو کمال حاصل تھا۔

خواجہ صاحب کی انصاف پسندی کا یہ عالم تھا کہ غزل کے

لازوال اور مسلّم تاجدار ہونے کے باوجود دوسرے شعرا کو نہایت ادب سے یاد کرتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو ان کا پیرو کہتے ہیں ؎

استادِ غزل سعدی ست پیش ہمہ کس امّا دارد غزلِ حافظ طرزِ روشِ خواجو

اور یہ بات ہے بھی سچ۔ جب خواجہ حافظ نے آنکھیں کھولیں تو سلمان اور خواجو کا رنگ ملک پر چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ آپ نے غزل کہنا شروع کیا تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھا کئی غزلیں ہم طرح ہیں۔ اور ان میں بھی اس قدر جا بجا توارد ہے کہ دونوں کے کلام میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حافظ، خواجو اور سلمان کی کئی غزلوں کو آپس میں خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ سعدی، خواجو اور سلمان ہی کے خاکے ہیں جن میں حافظ نے نقش آرائیاں کی ہیں۔ سعدی، خسرو، اور حسن تک غزل میں زیادہ عشق و عاشقی کے جذبات اور معاملات بیان کرتے تھے۔ خواجہ صاحب نے بھی انہی مضامین پر شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔

سلمان کا خاص مذاق مضمون آفرینی، جدّت تشبیہ اور صنائع لفظی ہے۔ خواجہ حافظ بھی ان باتوں کو لیتے ہیں لیکن یہ ان کا خاص انداز نہیں۔ خواجہ صاحب سعدی کی بھی تقلید کرتے ہیں۔ لیکن آپ فطرتاً شگفتہ مزاج اور ولولہ خیز طبیعت رکھتے تھے۔ اس لئے دردِ عشق، سوز و گداز، بیانِ غم و شوق اور تصویرِ یاس و حسرت کے نوحے آپ سے اچھی طرح ادا نہیں ہوتے تھے۔

خواجہ صاحب نے کچھ مثنویاں اور قصائد بھی لکھے ہیں ان میں بھی آپ نے اچھی خاصی دسترس دکھائی ہے بلکہ مثنوی میں تو

وہ صفائی، لطافت اور زور ہے کہ نظامی گنجوی اور سعدی شیرازی کا دھوکا ہوتا ہے۔ لیکن آپ کا اصلی اعجاز غزل گوئی ہے یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ عالمِ وجود میں آج تک کوئی شخص غزل میں خواجہ حافظ کا ہمسر نہیں ہو سکا۔ متوسطین اور متاخرین غزل کے بزم آرا ہیں لیکن ان کو تسلیم ہے کہ خواجہ صاحب کا انداز کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

خواجہ صاحب کے کلام میں بہت سی امتیازی خوبیاں ہیں جن کا مجموعہ اعجاز بن گیا ہے۔ ع

"آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری"

خواجہ صاحب کے کلام کے عام اوصاف اختصار کے ساتھ سپرد قلم ہیں:۔

۱۔ جوشِ بیان: خواجہ صاحب کے کلام میں جو جذبات ہیں۔ وہ خود ان کے واردات اور حالات ہیں۔ اس لئے ان کو وہ اس جوش بیان اور زور کلام کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا ہے اور سننے والے پر وہی رقّت طاری ہو جاتی ہے جو خود خواجہ صاحب کے دل میں ہوتی ہے۔

۲۔ بدیع الاسلوبی یعنی جدّت و خوبیٔ ادا: سب سے بڑی چیز جو حافظ کے کلام میں ہے حُسن بیان، خوبی ادا، لطافت اور دلآویزی ہے۔ لیکن یہ ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ جو کسی قاعدہ اور قانون کی پابند نہیں۔ فصاحت و بلاغت کے تمام اصول اس کے احاطہ سے عاجز ہیں۔ ایک ہی مضمون ہے۔ لوگ سو سو طرح سے کہتے ہیں لیکن وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ ایک شخص اسی خیال کو نا معلوم کن لفظوں میں اور کس ادا سے

بیان کرتا ہے کہ جادو بن جاتا ہے۔ یہ خوبی فارسی زبان میں حافظ کے برابر کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

۳۔ فلسفۂ محبت اور بیخودی: خواجہ صاحب کے نزدیک وصالِ الٰہی کے لئے وصالِ دوست سب سے بڑا لازمہ ہے۔ پاک محبت سے جو بیخودی پیدا ہوتی ہے اس کا کام ہے عاشق کی رضا کو رضائے محبوب میں محو کر دینا۔ خواجہ صاحب محبت کو بے عیب جانتے ہیں ؎

مہر رخت سرشتِ من خاکِ درت بہشتِ من
عشقِ تو سرنوشتِ من راحتِ من رضائے تو

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

خلل پذیر بود ہر بنا کہ مے بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

۴۔ وارداتِ عشق: خواجہ صاحب نے شاعری کی مختلف انواع کو لیا ہے اور ہر نوع کو اعلیٰ رتبہ پر پہنچایا ہے۔ لیکن ان کی اصلی شاعری عشق و عاشقی اور رندی و سرمستی ہے۔ رندانہ مضامین وہ جس آزادی، رنگینی، برجستگی، بلند آہنگی، لطف طبع، خوش ظرفی اور جوش انداز کے ساتھ ادا کرتے ہیں وہ محتاج تعریف نہیں۔ خواجہ صاحب کے عشقیہ جذبات درد و غم سے کم تعلق رکھتے ہیں۔ غمگین چہرہ بھی بنانا چاہتے ہیں تو چہرے سے شگفتگی نہیں جاتی ؎

شنیے مجنوں بہ لیلیٰ گفت کاے معشوقِ بے ہمتا
ترا عاشق شود پیدا ولے مجنوں نخواہد شد

می ترسم از خرابیٔ ایماں کہ می برد
محرابِ ابروے تو حضورِ نمازِ من

۵۔ فلسفہ۔ خواجہ صاحب کا فلسفہ تقریباً وہی ہے جو حکیم عمر خیام کا ہے۔ آپ نے انہی مسائل کو زیادہ تفصیل، توضیح اور جوش کے ساتھ ادا کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس میدان کے شہسوار شمار ہوتے ہیں، مہماتِ مضامین یہ ہیں۔

تعیش، رندی و مستی، قناعت، گوشہ نشینی، واعظوں کی پردہ دری وغیرہ وغیرہ۔

یہ مضامین کوئی پانچ سو برس سے پامال ہو رہے ہیں۔ لیکن آج تک حافظ کے عبورِ زبان، نزاکت تخئیل، لطافت، لوچ، شیرینی اور سلاست کا جواب نہیں ہو سکا۔ حضرات صوفیہ کے نزدیک ادراک کا اصل ذریعہ حواسِ خمسہ اور اشیائے خارجی نہیں بلکہ خود دل میں ایسی استعداد اور قابلیت ہے کہ اگر اس کا تزکیہ کیا جائے تو تمام اشیا اس میں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔ اس علم کو علمِ باطن کہتے ہیں اور یہ کتابوں کے مطالعہ سے نہیں بلکہ تزکیۂ قلب یعنی دل کی صفائی سے حاصل ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس مسئلہ کو متعدد اشعار میں بیان کیا ہے۔ آپ نے اربابِ ذوق و مشاہدہ کا نام ساقی، بادہ فروش رکھا ہے اور اسی بنا پر ہر جگہ پیر مغاں اور بادہ فروش کے حضور میں حلقہ بگوشی کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں علمائے ظاہری کو بے حقیقت سمجھتے ہیں ؎

سالہا دل طلبِ جامِ جم از ما مے کرد
آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا مے کرد

شرح مجموعۂ گل مرغِ سحر داند و بس | کہ نہ ہر کو ورقے خواند معانی دانست
سرِّ خدا کہ عارف و سالک بکس نگفت | در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

۶۔ فلسفۂ اخلاق: خواجہ صاحب کی اخلاقی تعلیم اعلیٰ درجہ کے فلسفۂ انسانیت کی تصویر ہے۔ ان کا طرزِ عمل خود ان کی زبان سے ظاہر ہے ۔

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن | کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

۷۔ ظاہردار عالموں، نام نہاد صوفیوں اور وضعدار واعظوں کی پردہ دری:

سب سے پہلے یہ فرض ادا کرنے کی عمر خیام نے جرأت کی۔ اس کے بعد شیخ سعدی نے دبی زبان میں کچھ کچھ کہا۔ لیکن جس دلیری آزادی اور بے باکی سے خواجہ صاحب نے یہ حق سرانجام دیا وہ کچھ انہی کا حصہ ہے ۔

بیا بہ میکدہ و چہرہ ارغوانی کن | مرو بہ صومعہ کہ آنجا سیاہ کارانند
بادہ با محتسبِ شہر نہ نوشی زنہار | کہ خورد بادۂ تو و سنگ بجام اندازد

۸۔ روزمرہ و محاورہ۔ خواجہ صاحب کے یہاں کلام میں روزمرہ اور محاورے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ آپ کی قادر الکلامی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ نے نہایت فصیح سلیس اور رواں محاورات اور مصطلحات اچھی خاصی مقدار میں استعمال کیے ہیں ۔

صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا | ببیں تفاوتِ رہ از کجا است تا بکجا
حاشا کہ من بموسمِ گل ترکِ مے کنم | من لافِ عقل مے زنم ایں کار کے کنم

۹۔ خوش نوائی۔ حافظ کے کلام میں ایک خوشگواری خاص پائی

جاتی ہے۔ اکثر وہ غزلوں کی بحریں ایسی رکھتے ہیں جو موسیقی سے مناسبت رکھتی ہیں شعروں کے ارکان اور ان کے اصول ایسے لاتے ہیں جو تال اور سم کا کام دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ خواجہ بعض اوقات عام روش میں بہہ گئے ہیں اور مراعاۃ النظیر ایہام اور تضاد ایسی صنائع لفظی کو شوق سے اپناتے ہیں۔

۱۰۔ بندش کی چستی: اس چیز کی تعریف و تحدید نہیں ہو سکتی لیکن ذوق سلیم کے لیئے اس کا محسوس کرنا بالکل آسان ہے ؎

صوفیان جملہ حریف اند و نظر باز ولے	زان میان حافظ سودا زدہ بدنام افتاد

۱۱۔ شوخی و ظرافت: خواجہ کی شاعری میں جا بجا شوخی بھی ہے اور ظرافت بھی۔ لیکن لطیف اور نازک۔ آپ سعدی اور خیام کی طرح زیادہ کھل نہیں جاتے ؎

واعظ شہر کہ مردم ملکش مے خوانند	قول ما نیز ہمین است کہ او آدم نیست
پدرم روضۂ رضوان بدو گندم بفروخت	ناخلفم باشم اگر من بجوے نفروشم

۱۲۔ تسلسل مضامین: ایشیائی غزل گوئی کا ایک بڑا عیب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی خیال کو مسلسل ظاہر نہیں کر سکتے۔ ہر غزل متعدد اور مختلف بلکہ متناقض مضامین کا مجموعہ ہوتی ہے۔ سب سے پہلے خواجہ نے ہی مسلسل غزلوں کو ترقی دی جن میں کوئی خاص واقعہ یا خیال یا سماں دکھایا گیا ہے۔

مغربی نقاد بھی اس حقیقت پر متفق ہیں کہ حافظ کا کلام دنیا کے اکثر بڑے شعرا کی شاعری پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ غرضیکہ ہر مذاق اور ہر طبقے کو

یکساں طور پر محفوظ کرنے کے لئے اس میں کافی سرمایہ موجود ہے۔ شتربان اور دہقان کے پہلو بہ پہلو ایک شہزادہ کبھی حافظ کے مطالعہ سے تسکینِ قلب حاصل کرتا ہے۔

میرزا قزوینی کا عقیدہ ہے کہ اگر سعدی کے کلام کو شاعری کا جسم تصور کیا جائے تو اس جسم کا دل حافظ کا کلام ہوگا۔

جامی۔ ملا نورالدین عبدالرحمان جامی ۱۴۱۴ء میں جام میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۴۹۲ء میں ہرات کے مقام پر انتقال فرمایا۔ فارسی زبان کے شعرا میں کوئی ایسا نام نہیں لیا جا سکتا جس نے جامی کے برابر قریب قریب ہر فن، ہر علم اور ہر صنعت سخن میں اس درجہ دسترس حاصل کی ہو۔ بہت تھوڑے اہل قلم ایسے ہیں جنہیں ان کی زندگی کے دوران ہی اس قدر عزت نصیب ہوئی ہے۔ اپنے مستقل جلوہ زارِ شاعری کے علاوہ جامی نے قرآن کریم، احادیث، اولیا، تصوف، صرف و نحو عربی، قافیہ، عروض اور موسیقی سے متعلق بھی کئی ایک تصانیف پیدا کیں۔ جامی کا اخلاق بھی اتنا ہی بلند تھا جتنا کہ اس کا تخیل، پرلے درجے کی سادگی بر طرہ یہ کہ خوشامد کے پاس سے بھی ہو کر نہ گذرتے۔ طبیعت میں خلوص، متانت اور عجز تھا گو کبھی کبھی ترش بھی ہو جاتے۔

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی ۔۔۔ کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

جامی کی نثریں بہارستان، لوائح، شواہد النبوت، شرح لمعات عراقی، نفحات الانس، مناسکِ حج اور طریقِ صوفیاں خاص طور پر

قابلِ ذکر ہیں۔ نظم میں تین دیوان اور سات مثنویاں (ہفت اورنگ یا سبحہ) شامل ہیں دیوان اکثر حسن و عشق کے گیتوں سے لبریز ہے۔ دیوان یہ ہیں: فاتحۃ الشباب، واسطۃ العقد، خاتمۃ الحیات۔
مثنویاں یہ ہیں: سلسلۃ الذہب، سلامان و ابسال، تحفۃ الاحرار، سبحۃ الابرار، یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنون، خرد نامہ سکندری۔ آخر کی پانچ مثنویاں خمسہ نظامی کے جواب میں ہیں۔ سلسلۃ الذہب حدیقہ سنائی کے جواب میں ہے۔

سلسلۃ الذہب: اس مثنوی میں فلسفیانہ، مذہبی اور اخلاقی مضامین و مسائل پر بحث ہے۔ اسلامی عقائد کی وضاحت، قرآن شریف کی بعض آیات کی تفسیر، چند فلسفیانہ موضوعات مثلاً جبر و قدر، عرفان، حقیقتِ ذات وغیرہ کی تصریح کی گئی ہے۔ جابجا حکایات اور امثلہ سے حسنِ بیان میں دلچسپی پیدا کی ہے۔ یہ مثنوی سلطان حسین کے نام پر معنون ہے۔

سلامان و ابسال: یہ مثنوی اوزون حسن آق قوینلو کے بیٹے یعقوب بیگ کے نام سے منسوب کی گئی تھی۔ اس مثنوی کا قصہ ایک قدیم داستان سے لیا گیا ہے۔ شیخ ابو علی سینا نے بھی اسے تصنیف کیا تھا۔

تحفۃ الاحرار: اس مثنوی میں معرفت اور دین کے مسائل مذکور ہیں اور نظامی کی مثنوی مخزن الاسرار کی تقلید میں لکھی گئی۔ سنِ تالیف ۸۸۶ھ ہے۔ یہ مثنوی خواجہ ناصر الدین عبید اللہ (ہادیٔ طریقۂ نقشبندی) کی مدح میں لکھی گئی۔ اس میں بارہ ابواب ہیں۔

سبحۃ الابرار: یہ مثنوی سلطان حسین کے نام پر معنون کی گئی ہے۔ یہ دینی اور عرفانی مسائل پر مشتمل ہے۔ طرزِ بیان میں مشہور صوفی شعراء شیخ فریدالدین عطّار اور مولانا روم کی پیروی کی گئی ہے۔ ہر عرفانی موضوع کی وضاحت کے بعد ایک دو حکایات حسبِ حال بطور تمثیل بیان کی ہیں تاکہ تاثیر اور دلچسپی میں اضافہ ہو۔

یوسف زلیخا۔ یہ مثنوی نظامی کی مثنوی خسرو شیریں کے جواب میں لکھی گئی۔ اور سلطان حسین کے نام سے اس کا انتساب کیا گیا۔ یہ مثنوی ۸۸۸ھ میں نظم ہوئی۔ جامی کی تمام مثنویوں میں اس کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اس مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے ؎

الٰہی غنچۂ امید بکشائی　　گلے از روضۂ جاوید بنمائے

لیلیٰ و مجنوں۔ یہ مثنوی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے نظامی کی مثنوی لیلیٰ مجنوں کی تقلید میں نظم کی گئی۔ اس کا سنِ تالیف ۸۸۹ھ ہے۔ اس مثنوی میں قریباً پونے چار ہزار شعر ہیں۔

خرد نامہ سکندری۔ یہ مثنوی نظامی کی مثنوی سکندر نامہ کی پیروی میں ہے۔ اور اسے بھی سلطان حسین کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اس میں شاعر نے جا بجا اپنے فرزند کو نصیحت کی ہے۔

جامی نہ تو یہ چاہتے تھے کہ عوام ان کے اشعار کو ضرور پسند کریں اور نہ ہی ان سے کسی تعریف کے خواہش مند تھے ؎

شعر کہ افتد قبولِ خاطرِ عام　　خاص داند کہ سست باشد و خام

جامی نے صحیح عشق کے فلسفے کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے ؎

بے عشق نشان ز نیک و بد نیست | چیزے کہ ز عشق نیست خود نیست
ہر چند کہ عشق دردناک است | آسائش سینہ ہائے پاک است

جامی کے بیانِ تصوف نے اس کی روح آویز طرز ادا، وجد آور خیالات اور نغمہ پاش زبان کو ایک خاص رنگینی اور خوش آہنگی دے رکھی ہے ؎

خوش مجمعیست انجمن نیکواں ولے | ما ہے کزوست رونق ایں انجمن یکیست
خواہیم بہر ہر قدمش تحفۂ دگر | لیکن مقصریم کہ جاں در بدن یکیست
گفتم چناں ضعیف کہ بے نالہ و فغاں | ظاہر نمی شود کہ دریں پیرہن یکیست
آنجا کہ لعلِ دلکش شیریں دہد فروغ | یاقوت و سنگ در نظر کوہکن یکیست

مغربی نقادوں کی رائے ہے کہ گو شعر کی ہر صنف میں کوئی نہ کوئی دوسرا شاعر جامی پر سبقت لے جائے لیکن تمام اصنافِ سخن کے پیشِ نظر اور ہمہ صفت موصوفی کو سامنے رکھ کر بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ جامی فارسی علم و ادب کے آسمان کا ایک درخشندہ ستارہ ہے۔ بہت سے شعرا نے آج تک جامی کی شاعری کو اپنی کلام آفرینی کا واحد نمونہ بنا رکھا ہے۔ لیکن کوئی بھی اس کو نہیں پہنچ سکا۔ زندگی کی تلخ حقیقتیں جس قدر جامی پر آشکار تھیں اور جس قدر دقتِ نظری اسے انسانی ذہنیات میں نصیب تھی شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو حاصل ہوئی ہو۔ جامی کے اشعار میں درد ہے، سوز و گداز ہے۔ وہ درد کو دیکھتا ہے، اسے خود درد محسوس ہونے لگتا ہے اور اسی درد کی چٹکیاں اس کے بہت سے اشعار میں ؎

من نالم از جدائی تو دم بدم چو نے | ویں طرفہ تر کہ از تو نیم یک نفس جدا

جامی کی تصنیفات میں ۹۹ کتابیں شامل ہیں۔ یورپ والوں نے ان میں سے بعضوں کے ترجمے شائع کئے ہیں۔

بہارستان: بہارستان مولانا جامی کی مشہور تصنیف ہے۔ جامی نے اس میں ملی جلی نظم و نثر کے گل کھلائے ہیں۔ نثر کے مقابلے میں نظم کی مقدار زیادہ ہے یہاں تک کہ بادی النظر میں بہارستان اشعار کا ایک دلاویز انتخاب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اسے جامی کی نثر میں شمار کیا جاتا ہے۔ نثر میں جامی کی اور بھی کئی تصنیفات ہیں مگر بہارستان کے برابر کسی کو شہرت، عزت اور مقبولیت شاید ہی حاصل ہوئی ہو۔

درحقیقت جامی کا مقصد تو یہ تھا کہ شیخ سعدی کی گلستان کے جواب میں یا اس کی پیروی میں قارئین کے لئے دلچسپ مواد بہم پہنچایا جائے۔ مگر جامی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ شعرا کے کلام کا جو سنہری انتخاب ادھر اُدھر درج کیا ہے اس کے ساتھ ہی کی سوانحہ یاں سنجیدہ اور بے رنگ ہو کر رہ گئی ہیں۔ صاحب آتش کدہ لکھتا ہے "گلستان پر بہارستان" لکھی۔ عبارت فصیح اور مضامین خالی ہیں۔ لیکن اس عالم متبحر کی نظم سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زور علم اور چیز ہے اور طبیعت خداداد اور چیز" جامی کی وسیع علمیت شیخ کی خداداد استعداد کو نہیں پہنچ سکی۔ بہارستان میں گلستان کی سی گھلاوٹ، سلاست، روانی، شستگی اور بے محابا نگاری مفقود ہے۔ نثر میں مختلف ابواب کی جو تمہیدیں اٹھائی گئی ہیں ان کو صنائع بدائع کی بھرمار اور تصنع آرائی کی بوچھاڑ نے نفاست اور

صفائی کے نظر نواز زیور سے محروم کر کے رکھ دیا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ متاخرین کو غیر ملکی اثرات نے متقدمین کی سادگی سے دُور پھینک دیا ہے۔ تیمور کے وقت سے پہلے ایران میں نہایت لطیف، صاف اور سادہ نثر لکھی جاتی تھی۔ چہار مقالہ، قابوس نامہ، سیاست نامہ، سفر نامہ خسرو، اپنی تمام تر سلاست اور سادگی کے باوجود شوکت اور رنگینی سے معمور رہیں۔ آہستہ آہستہ اہل ادب کی زبان میں تصنع کی آمیزش اور غیر ملکی اثرات کی جھلک نظر آنے لگی، ترک اور ہندوستانی ادیبوں نے تو فارسی زبان کی سادگی اور سلاست کو سرے سے ہی مٹا دیا۔ اس لئے کہ ایسے لوگ فارسی زبان کو اپنی مادری یا روزمرّہ کی زبان کے طور پر نہیں اپناتے تھے بلکہ اسے ایک ادبی زبان کی حیثیت سے لے کر خوب پیچھے دار تحریریں پیدا کرتے تھے اور کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے تھے موضوع کی جگہ اظہار موضوع کے طریقے پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ ان دریں حالات صرف جامی ہی کو اس چیز کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا

کام شاستر سوسائٹی بنارس نے بہارستان کا لفظی ترجمہ ۱۸۸۷ء میں چھاپا۔

سوال: مغلیہ اور تیموری دَور کے فارسی نثری ادب پر مفصل نوٹ لکھئے۔

جواب: اس میں کوئی کلام نہیں کہ مغلوں اور تیموریوں کے عہد حکومت میں اکثر فتنہ و فساد اور بدامنی کا بازار گرم رہا جس

سے علم وادب کو بڑا دھکا لگا۔ باوجود اس کے علم وادب کے آثار کچھ حد تک محفوظ رہے اور کچھ نئی تصنیفات بھی معرض وجود میں آئیں۔

ذیل میں فارسی نثری ادب کے قابل قدر نمونے مذکور ہیں:۔
مغل اور تیموری دور میں فنِ تاریخ پر متعدد کتب لکھی گئیں۔ اور انھیں مغل اور تیموری حکمرانوں کے نام پر معنون کیا گیا۔

تاریخ جہانگشا: یہ اس عہد کی نہایت اہم تاریخ ہے۔ اس کا لکھنے والا علاء الدین عطا ملک جوینی ہے۔ یہ شخص مغل اُمرا اور خاص طور پر ہلاکو خاں اور اباقا خاں کا درباری ملازم تھا۔ یہ کتاب تین جلدوں میں منقسم ہے۔ اس میں مغلوں کے خصائل عادات، ان کی فتوحات اور حالات مذکور ہیں۔ بالخصوص چنگیز خاں کے حالات ۶۵۵ھ تک تفصیلاً بیان کئے گئے ہیں۔ ضمنی طور پر خوارزم شاہیوں اور اسماعیلیوں کی تاریخ بھی مندرج ہے۔ اس کتاب کو ایک مستند تاریخ کا درجہ حاصل ہے۔ اور بعد میں آنے والے مورخین نے اس سے خوب استفادہ کیا ہے۔

طبقات ناصری: اس کتاب میں ابتدا سے ۶۵۸ھ تک کے حالات مذکور ہیں۔ ہندوستان کے حکمران خاندانوں کے حالات خاص طور پر قابل داد ہیں۔ غزنوی دور کے حادثات، مغلیہ سلطنت کی ابتدا اور اسماعیلیوں کے قلع قمع کے واقعات خود مصنّف نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اس لئے ان کی تاریخی اہمیت میں کوئی شک نہیں۔ اس کتاب کا لکھنے والا ابو عمر عثمان منہاج الدین

ہے جو جوزجان کا باشندہ تھا۔ اس نے کافی مدت ہندوستان میں گزاری اور تین بار ہندوستان کے بادشاہوں کے سفیر کی حیثیت سے متعین ہو کر ایران کا سفر کیا۔

تاریخ یمینی: اس کتاب کی اصل ابونصر عتبی کی عربی زبان میں لکھی ہوئی تاریخ ہے جس میں سلطان محمود غزنوی کی فتوحات مذکور ہیں۔ یوں تو العتبی نے ۴۲۷ھ/۱۰۳۶ء میں وفات پائی لیکن تاریخ یمینی میں صرف ۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء تک کے واقعات درج ہیں۔ اس کتاب میں عہد محمود کے نمایاں واقعات اور اس کے دربار کی شاہانہ خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے حالات جاننے کے لئے تاریخ یمینی ایک مستند اور مفید کتاب ہے۔ اس کتاب کا نام اس لئے تاریخ یمینی رکھا گیا کہ محمود غزنوی کے القاب میں ایک لقب یمین الدولہ تھا۔ العتبی سلطان محمود کے دربار کا ملازم تھا۔ ابوشرف ناصح گلپایگانی نے ساتویں صدی ہجری کے آخر میں تاریخ یمینی کا ترجمہ سادہ اور رواں فارسی میں کیا۔

جامع التواریخ: جامع التواریخ فارسی زبان میں بہترین تاریخوں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء میں مکمل ہوئی۔ اس کی دو جلدیں ہیں۔ اس کا مصنف رشید الدین فضل اللہ اباقا غازان کا وزیر تھا۔ اس ایلخانی بادشاہ نے رشید الدین کی بڑی مدد کی۔ اور اُسے حکم دیا کہ ہلاکو خاں کی اولاد کے کارناموں اور فتوحات کے بارے میں ایک مبسوط تاریخ لکھی جائے۔ اس کتاب میں آغاز آفرینش سے لے کر ایلخانی حکمران الجایتو کے عہد تک کے

واقعات مندرج ہیں ۷۱۸ھ میں حاسدوں اور دشمنوں کی سازش کا شکار ہو کر سلطان ابوسعید کے حکم پر تبریز میں قتل ہو گیا۔

تاریخ وصاف: یہ تاریخ رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ کا ضمیمہ ہے۔ اس کا مصنف شہاب الدین عبداللہ شیرازی ملقب "وصاف" ہے۔ اور اس میں ہلاکو خاں کی فتح بغداد سے لے کر ۷۲۸ھ تک کے حالات مذکور ہیں۔ اس تصنیف کا بڑا نقص یہ ہے کہ اس کی زبان بڑی مشکل اور پیچیدہ ہے۔ یہ ثقیل زبان اور دقیق طرز کا نمونہ ہے۔ لیکن اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔

تاریخ گزیدہ: اس کتاب کا مصنف رشید الدین فضل اللہ کا قابل ترین شاگرد حمد اللہ مستوفی قزوینی ہے۔ یہ تاریخ ۱۳۳۰ء میں مکمل ہوئی۔ تاریخ گزیدہ ایک فاتحہ، چھ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ یہ کتاب ایک انسائیکلوپیڈیا کے طور پر لکھی گئی ہے۔ اس لئے تفاصیل سے عاری ہے۔

حمد اللہ نے ۱۳۳۵ء میں ظفر نامہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ مثنوی ظفر نامہ ایک منظوم تاریخ ہے جو شاہنامہ فردوسی کی تقلید اور اس کے ضمیمہ کی صورت میں لکھی گئی ہے اس میں حضرت محمد صلعم کی زندگی سے شروع کیا گیا ہے اور مصنف کے وقت تک یعنی ۱۳۳۱ء تک کے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

زبدۃ التواریخ: اس تاریخ کا مصنف حافظ ابرو ہے۔ جو امیر تیمور اور شاہرخ (پسر تیمور) کا درباری مورخ تھا۔ اس نے اس

مفصل اور جامع تاریخ کو ۱۴۲۶-۲۷ء میں مکمل کیا۔ یہ تاریخ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور دنیا بھر کی تاریخ پر حاوی ہے۔ عبد الرزاق سمرقندی نے زبدۃ التواریخ کو سامنے رکھ کر مطلع السعدین لکھا۔ اس کی چودہ جلدیں ہیں جن میں تقریباً ۱۷۰ سال کے واقعات درج ہیں۔ یعنی خاندان ہلاکو کے آخری تاجدار ابو سعید کی پیدائش ۱۳۰۴ء سے لے کر امیر تیمور کے پرپوتے ابو سعید کی وفات (۱۴۶۸ء) تک بلکہ اس سے بھی دو ایک سال زیادہ عرصہ تک۔ مصنف ان دونوں حکمرانوں کو دو مبارک ستارے (سعدین) فرض کرتا ہے۔ اس لئے کتاب کا نام مطلع السعدین رکھا۔

مجمل فصیحی۔ یہ کتاب تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کا ایک بیش قیمت مرقع ہے۔ اس میں ابتدائے دنیا سے نویں صدی ہجری کے وسط تک کے حالات و واقعات اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس کی خاص دلچسپی اور فوائد کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لکھنے میں فصیحی نے غیر معمولی ماخذوں سے امداد لی ہے۔

ظفر نامہ: اس کتاب میں تیمور کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے اس کی دو جلدیں ہیں۔ تیمور کی ولادت سے تیمور کی وفات تک کے حالات اس میں مذکور ہیں اس کتاب کا مصنف شرف الدین علی یزدی ہے۔ اسی نام کی ایک اور تاریخ نظامی شامی نے لکھی تھی۔ نظامی کا ظفر نامہ بھی تیمور کی زندگی کی تاریخ ہے۔ لیکن شرف الدین کے ظفر نامہ کے مقابلے میں اسے بہت کم شہرت حاصل ہوئی۔

شرف الدین کے ظفر نامہ کی عبارت پر تصنع اور پیچیدہ ہے

اور تراکیب پُر شوکت ہیں۔ لفاظی بھی پائی جاتی ہے۔ ایک تاریخ نگار کے لئے ایسی طرزِ ادا پسندیدہ نہیں ہوتی۔

روضتہ الصفا: اس کتاب کا مصنف محمد بن خوندشاہ المعروف میر خوند ہے۔ اس نے روضتہ الصفا فی سیرۃ الانبیا والملوک والخلفا کے نام سے دنیا بھر کی ایک مفصل اور بسیط تاریخ لکھی۔ اس میں تخلیق عالم سے لے کر ۱۴۶۰ء تک کے واقعات بیان کئے گئے ہیں کتاب کے خاتمے پر آخری تیموری حکمران سلطان حسین کی تاریخ خاص طور پر لکھی گئی ہے۔ میر علی شیر نوائی اسی سلطان کا مشہور وزیر تھا۔ ایران جدید کے مایۂ ناز ادیب رضا قلی خاں لالہ باشی ہدایت نے روضتہ الصفا کو اپنے وقت تک مکمل کر دیا ہے۔ میر خوند کے پوتے خوند میر نے روضتہ الصفا کا خلاصہ لکھا جس کا نام خلاصتہ الاخبار رکھا۔

لباب الالباب: اس کتاب کا مصنف محمد عوفی ہے اور ۶۱۸ھ کے لگ بھگ تالیف کی گئی۔ اس کتاب میں ایرانی شعرا اور ادبا کے حالات مذکور ہیں۔ اور فارسی شاعری کی ابتدا سے مصنف کے زمانے تک شاعروں اور نثر نگاروں کا حال درج ہے۔ اس کی دو جلدیں ہیں پہلی جلد میں شعر کہنے والے سلاطین اور امرا و وزرا کے علاوہ حکما اور علما کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ دوسری جلد عام شاعروں اور ادیبوں کے لئے مخصوص ہے۔ محمد عوفی نے ایک اور کتاب "جوامع الحکایات" بھی لکھی۔ اس میں ادبی حکایات، اشعار اور امثال مذکور ہیں عوفی ہندوستان میں بھی آیا اور دہلی کے سلطان ناصر الدین قباچہ کے وزیر

حسین بن شرف الملک کے نام پر اپنی کتاب لباب الالباب کو معنون کیا۔

تذکرۂ دولت شاہ: دولت شاہ سمرقندی کا "تذکرۃ الشعرا" فارسی میں لباب الالباب کے بعد دوسرا اہم تذکرہ ہے۔ یہ تیموری عہد کے آخر میں ۸۹۲ھ میں لکھا گیا۔ اس میں ابتدائے شعر سے نویں صدی ہجری کے آخر تک کے شعرا کے حالات مذکور ہیں۔ کل ایک سو پانچ شاعروں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مصنف کا باپ مرزا شاہ رخ کے ندیموں اور مقربوں میں شامل تھا۔ دولت شاہ خود بھی سلطان حسین اور اس کے وزیر امیر علی شیر نوائی کا مقرب تھا۔ دولت شاہ نے اپنے ہمعصر شاعر عبدالرحمان جامی کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ تذکرہ امیر علی شیر نوائی کے نام پر معنون کیا گیا۔ امیر علی شیر نوائی شعرا، ادبا اور علماء کا بڑا قدر دان تھا۔

المعجم: یہ کتاب شاعری، عروض، قوافی اور تنقید و تبصرہ پر ایک بہت اہم تصنیف ہے۔ اس میں مذکور مضامین کی وضاحت مثالوں اور شعروں سے کی گئی ہے۔ ضمنی طور پر ہمعصر شعرا کے حالات بھی بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مصنف محمد بن قیس رازی ہے۔ وہ رے کا رہنے والا تھا۔ یہ کتاب پہلے عربی زبان میں لکھی گئی تھی مصنف نے اس کا فارسی ترجمہ ۶۳۰ھ میں کیا۔

روضۃ الشہدا: یہ کتاب حسین واعظ کی تصنیف ہے۔ اس میں حضرت امام حسین اور آپ کے ساتھیوں کے مصائب اور ان کی شہادت کا بیان ہے۔ یہ ائمہ کے مفصل اور رقت انگیز حالات پر سب سے پرانی کتاب ہے اور مدتوں عزا کی مجلسوں میں پڑھی جاتی رہی۔

"روضہ خوانی" کی اصطلاح اسی کتاب کی نسبت سے وجود میں آئی۔

اخلاق ناصری۔ یہ کتاب نصیر الدین طوسی کی یادگار ہے۔ دراصل یہ کتاب کہستان کے اسماعیلی گورنر ناصر الدین محتشم کے لئے لکھی گئی تھی۔ اور اس کے نام پر معنون کی گئی تھی۔ اور دیباچے میں اسماعیلیوں کے گن گائے گئے۔ لیکن جب ہلاکو خاں نے سلطنتِ اسماعیلیہ کے دار الخلافہ الموت کو تباہ کر دیا اور ناصر الدین طوسی کو اپنی خدمت میں لے لیا تو اس محقق (طوسی) نے اخلاقِ ناصری کے دوسرے دیباچے میں ہلاکو خاں کی تعریف کے پل باندھے۔

اگرچہ اخلاق ناصری کا انداز تحریر مشکل اور صنائع بدائع سے معمور ہے پھر بھی کتاب کی مفید مطالب بحثوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب میں اصولِ اخلاق اور حکمتِ عملی پر بحث کی گئی ہے۔ عمدہ اوضاع و اطوار کے علاوہ نظامِ حکومت، نظام شخصی اور نظام اجتماعی کے اصولوں کی صراحت کی گئی ہے۔ اخلاق و حکمت پر یہ سب سے پہلی مستند کتاب ہے۔

اخلاقِ جلالی۔ اس کتاب کا مصنف جلال الدین دوّانی ہے۔ یہ کتاب آق قونیلو سلطان بن حسن کی فرمائش پر نویں صدی ہجری کے آخری نصف میں لکھی۔ اس کتاب میں اخلاق تدبیر منزل اور سیاستِ مدن پر بحث کی گئی ہے اور اخلاق ناصری سے نقل و اقتباس کیا گیا ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ اصلی کتاب "اخلاق ناصری" کو اتنی شہرت اور مقبولیت نصیب نہیں ہوئی جتنی اخلاق جلالی کے غیر ملکی زبانوں میں ترجمے ہوئے اور یورپ میں اس کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔

اخلاقِ محسنی - یہ کتاب بھی اپنی پیشرو تصانیف "اخلاق ناصری" اور "اخلاق جلالی" کی تقلید میں لکھی گئی۔ اس میں بھی اخلاق اور اوصاف پر بحث کی گئی ہے۔ چالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے مصنف کا نام حسین واعظ کاشفی ہے۔ اس کتاب کو سلطان حسین کے نام پر معنون کیا گیا۔

انوارِ سہیلی: یہ کتاب "کلیلہ و دمنہ" کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس میں اخلاق اور حکمت عملی کے اصولوں کی وضاحت پرندوں اور جانوروں کی حکایات کے ذریعہ کی گئی ہے۔ اس کا مصنف بھی ملا حسین واعظ کاشفی ہے۔ اس کتاب کو بھی یورپ اور ہندوستان میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

صفوی اور قاچاری دَور

سوال: صفوی دَور میں فارسی علم و ادب کی حالت اور ترقی پر بحث کیجئے۔

جواب: امیر تیمور کی موت کے بعد تقریباً ایک سو سال تک ایران میں طوائف الملوکی کا عالم رہا۔ آخر شاہ اسماعیل نے ایک عظیم خاندان کی بنیاد رکھی جس کا نام صفوی خاندان ہے۔ شاہ اسمٰعیل ایک مشہور ولی شیخ صفی الدین کی اولاد سے تھے۔ شیخ صفی الدین ساتویں امام موسیٰ کاظم کی نسل سے تھے۔ صفوی خاندان کا سب

سے بڑا بادشاہ شاہ عباس اعظم تھا جو ۱۵۸۷ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۶۲۹ء میں وفات پائی۔

صفویہ مذہب کے شیعہ تھے۔ اس لئے دفعتہً صوفیانہ شاعری کو زوال آگیا۔ بعض لوگ تقلیداً اس رنگ میں کہتے تھے۔ وہ صوفی نہ تھے۔ لیکن صوفی بننے میں مزا آتا تھا۔ حکیم شفائی نے ایک مثنوی تصوف میں بڑے زور شور سے لکھی۔ تصوف کے معرکتہ الآرا مسائل خوبی سے بیان کئے۔ لیکن جب یہ خیال آتا ہے کہ یہ وہی شفائی ہیں جو ذوقی کے مقابلے میں بھانڈ بن جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک نقالی ہے۔ صوفیانہ شاعری میں صرف تخئیل اور فلسفہ درکار نہیں بلکہ اس کی اصلی روح جذبات ہیں۔ وہ ان لوگوں میں کہاں؟ لیکن اس سے یہ مطلب اخذ نہیں کر لینا چاہئے کہ جامی کی موت کے بعد فارسی شاعری کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ ہاتفی، آصفی، اہلی اور ہلالی وغیرہ اہلِ قلم جامی کے بعد چالیس سال تک زندہ تھے۔ یہ ضرور ہے کہ شاہ اسمٰعیل صفوی کی موت اور شاہ عباس اعظم کی تخت نشینی کے درمیان ایران میں کوئی نمایاں اور بلند مرتبہ صاحبِ فن پیدا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صفوی بادشاہ قصیدہ گو شعرا یا معمولی قسم کے اہلِ قلم کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے۔ مرزا محمد خاں کی بھی یہی رائے ہے کہ صفوی بادشاہ ہر ممکن طریقے سے شیعہ مذہب کے اصول و عقائد کی ترویج میں کوشاں رہتے تھے کمالیات سے انہیں ایک گونہ چڑ تھی ان کی توجہ تو ہر وقت شرعیات کی طرف مبذول رہتی تھی۔ صوفیوں کو آزار پہنچانے میں انہوں نے

کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہی وجہ تھی کہ صفویہ عہدِ حکومت میں تصوف، شاعری، علم و ادب اور فنون کا فاتحہ پڑھ دیا گیا۔ درویشوں اور اہلِ حال بزرگوں کی پناہ گاہوں اور خانقاہوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ اس کے مقابلہ میں ملا محمد تقی مجلسی، ملا محمد باقر مجلسی، محقق ثانی، شیخ حُر آملی اور شیخ بہائی کے سے خشک، تنگ نظر اور متعصب اہلِ شرعیات و دینیات نے کافی عروج پایا۔ رضا قلی خاں لکھتا ہے کہ صفوی بادشاہ قصیدوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ تو مذہبی شاعروں کے متوالے تھے۔ چنانچہ شاہ طہماسپ (۱۵۲۴ء تا ۱۵۷۶ء) نے محتشم کاشی (وفات ۱۵۸۸ء) کو حضرت امام حسین علیہ السلام کا مرثیہ ہفت بند لکھنے کے عوض میں ایک ایسا معقول معاوضہ دیا تھا کہ فارسی شاعری میں ایک انقلاب نمودار ہو گیا۔ اکثر شعرا نے محتشم کاشی کی پیروی میں مرثیہ گوئی کو ایک عام مقبول اور مستقل صنفِ شاعری بنانے کے لئے کوشش شروع کر دی۔ اکثر تغزل نواز شعرا کو مغل بادشاہوں کی ادب پروری ہندوستان میں کھینچ لائی۔

صفوی بادشاہوں کے زیرِ سایہ جو مشہور ترین اہلِ قلم ایران کی سرزمین پر نشوونما پاتے رہے یہ ہیں:

قاسمی۔ آپ نے شاہ اسمٰعیل صفوی کی موت کے دس سال بعد ایک شاہنامہ مکمل کیا جس میں شاہ مذکور کی زندگی کے واقعات اور فتوحات کو نظم کیا۔ قاسمی کے اشعار میں قصیدہ خوانوں کی سی خوشامد کی بو نہیں۔ شاہنامہ میں شاہ اسماعیل کے جانشین کے حالات بھی منظوم ہیں۔

وحشی یزدی۔ آپ نے ۱۵۸۳ء میں وفات پائی۔ تاریخ عالم آرا عباسی میں آپ کی تصنیف فرہاد و شیریں اور غزلیات کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ آپ کے کلام میں معاملہ بندی اعلیٰ درجہ کی پائی جاتی ہے واسوخت بھی انہیں کی ایجاد ہے۔ اور انہیں پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ وحشی نے شاہ طہماسپ اور اس کے کئی ایک امرا کی مدح میں قصیدے بھی لکھے۔ ان کے علاوہ دو مثنویاں اس کی یادگار ہیں۔ خلدِ بریں اور ناظر و منظور۔

محتشم کاشی: مفصل بیان آگے ہے۔

محمود قادری یزدی: وفات ۱۵۸۵ء آپ نے ابو اسحاق صاحب کنز الاشتہا کے انداز میں دیوان البسہ لکھا ہے۔ اس میں سلجھے ہوئے مذاق، مزاح اور طنز کی افراط ہے۔

شانی طہرانی: آپ نے ۱۶۱۴ء میں وفات پائی۔ طبیعت میں جدّت اور انداز بیان میں جوش ہے۔

بہاء الدین آملی: مفصل ذکر آگے ملاحظہ ہو۔

حکیم شفائی۔ وفات ۱۶۲۷ء۔ شاہ عباس اعظم کے شاہی طبیب اور خاص ندیم تھے۔ رضا قلی خاں لکھتا ہے کہ آپ کی طبابت نے آپ کی شاعری کو اور آپ کی شاعری نے آپ کی طبابت کو مات کر رکھا تھا۔ ہجوؤں اور غزلیات کے علاوہ آپ نے چار مثنویاں بھی لکھیں:۔

(۱) مہر و محبت (۲) نمکدان حقیقت۔ حدیقۂ سنائی کی پیروی میں (۳) قصۂ عراقین۔ تحفۃ العراقین کی تقلید میں (۴) دیدۂ بیدار شفائی اکثر بابا فغانی کی طرحوں میں غزل کہتے تھے۔ لیکن فغانی

کی سی بات نہیں۔ آپ کے اچھے اچھے اشعار نظیری نیشاپوری کے کلام کی سی چاشنی رکھتے ہیں۔

فصیحی ہروی۔ وفات ۱۰۴۹ھ ۱۶۳۹ء آپ اور مرزا جلال الدین اسیر شاہ عباس اعظم کے درباری شاعروں میں سے تھے۔ جلال اسیر نے بابا فغانی کی سی خیال بندی، مضمون آفرینی اور دقت پسندی کو ترقی دی۔

محمد طاہر وحید قزوینی۔ وفات ۱۱۲۰ھ ۱۷۰۸ء آپ کو ۱۰۵۵ھ ۱۶۴۵ء میں شاہ عباس دوم نے درباری تاریخ نگار اور ۱۱۰۱ھ ۱۶۸۹ء میں وزیر مقرر کیا۔ ڈاکٹر ایتھے کا کہنا ہے کہ طاہر وحید مشہور شاعر صائب اصفہانی کا دوست تھا۔

صائب اصفہانی۔ بالتفصیل تذکرہ آگے ملاحظہ کیجیے۔

فیاض۔ آپ صائب کے ہمعصر تھے۔ آپ نے اماموں کی مدح میں قصیدے اور حضرت امام حسین ؑ اور حضرت امام حسن ؑ کے ماتم میں مرثیے لکھے ہیں۔ آپ نے شیعہ مذہب کے متعلق عربی زبان میں ایک کتاب لکھی۔ فارسی زبان میں آپ نے ابن العربی کی شہرۂ آفاق تصنیف فصوص الحکم کی تفسیر لکھی۔

مذکورۃ الصدر شاعروں اور شیعہ مذہب کے اصول و عقائد کو ترتیب دینے والے اہل قلم سے قطع نظر روضہ خوانی کی داغ بیل بھی صفوی دقتوں ہی میں پڑ چکی تھی۔

صفوی دور کے مشہور اور عظیم المرتبہ شعرا

محتشم کاشانی: محتشم کاشانی صفویہ دور کا مشہور ترین شاعر ہے وہ شاہ طہماسپ کا درباری شاعر تھا۔ آپ نے شروع شروع میں بہت سی عشقیہ غزلیں لکھیں۔ اور شاہ کی شان میں قصیدے لکھے۔ آتش کدہ میں ان غزلوں اور قصیدوں کا ذکر آیا ہے۔ لیکن صفوی بادشاہ قصیدہ گوئی کو پسند نہ کرتے تھے۔ وہ کٹر شیعہ تھے۔ اور دینی مسائل کی طرف زیادہ توجہ دیتے تھے۔ غزلیں بھی ان کی طبیعت کو راس نہ آتی تھیں، اس لئے محتشم کاشانی نے بھی ہوا کا رخ دیکھ کر نئی راہ اختیار کی اور اہل بیت کی مصیبتوں اور امام حسینؑ کی شہادت اور دلیری وغیرہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ آپ نے مرثیہ گوئی کو ایک مستقل فن کی صورت دی۔ آپ کے مرثیہ میں بے حد درد اور سوز ہے۔ بیان میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ جذبات میں حقیقی جوش اور خاص ولولہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو مرثیہ گوئی کی حیثیت سے بڑی شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی۔

فارسی ادب میں محتشم کاشانی کو مرثیہ گوئی کا موجد کہا جاتا ہے۔ اس نے اس صنفِ شعر کو کمال عروج تک پہنچایا۔ جو بات محتشم کے مرثیوں میں ہے وہ اس سے پہلے یا بعد میں آنے والے مرثیہ گو شعرا میں ناپید ہے۔ آپ نے ۱۵۸۷ء میں وفات پائی۔ نمونہ کلام از

دلے دارم کہ در تنگی درو جز غم نمی گنجد ۔ غمے دارم ز دل تنگی کہ در عالم نمی گنجد

یا زایں چہ شورش است کہ در خلقِ عالم است
باز ایں چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتم است

باز ایں چہ رستخیز عظیم است کز زمیں
بے نفخ صور خاستہ در عرشِ اعظم است

گویا طلوع می کند از مغرب آفتاب
کاشوب در تمامی ذراتِ عالم است

گر خوانمش قیامتِ دنیا بعید نیست
ایں رستخیز عام کہ نامش محرم است

شیخ یعقوب صرفی

شیخ یعقوب صرفی کشمیر کے ایک بلند پایہ عالم اور شاعر ہوئے ہیں۔ آپ ۱۵۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ اس قدر ذہین تھے کہ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم ملّا عینی سے پائی۔ آپ نے علم و ادب کے لئے دوسرے ملکوں کا سفر کیا اور اس زمانے کے بڑے بڑے عالموں اور شاعروں سے ملاقات کی۔ مختلف مراکزِ علوم کا دورہ کیا اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ حصولِ علم کی خاطر وہ سیالکوٹ، لاہور، کابل، مشہد، سمرقند وغیرہ بھی تشریف لے گئے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی قیام کیا۔ مذہبی علوم پر کامل عبور کے علاوہ آپ نے منطق اور فلسفہ میں بھی کافی دسترس حاصل کی۔ دینی معاملات مثلاً قرآن شریف کی تفسیر، حدیث اور تصوف وغیرہ پر آپ کی رائے کو سند مانا جاتا تھا۔

صرفی رح شعر و شاعری کا صحیح اور اعلیٰ مذاق رکھتے تھے اور بلند درجہ شاعر تھے۔ آپ نے غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ مثنویاں بھی کہی ہیں۔ آپ کی شاعری پر مذہب اور تصوف کا رنگ نمایاں

ہے۔ آپ کی پانچ مثنویاں خمسہ کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نے بہتر سال کی عمر پائی۔ آپ کا مزار سرینگر کے محلہ زینہ کدل میں ہے۔

شیخ یعقوب صرفی رح کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

گیتی نمائے آئینۂ صاف جامِ ما
دورِ جم است و عہدِ سکندر بکامِ ما

آئینۂ خدائے نما جامِ بادہ است
اے غافل از خدا چہ کنی عیب جامِ ما

مارا چہ عیب میکنی اے شیخ صبح خیز
روشن تر آمد ست ز صبح تو شامِ ما

نہ میلِ دنیا و نہ تمنائے آخرت
یعنی بیروں بود ز دو عالم مقامِ ما

تا گشتہ ایم ساقیٔ میخانۂ شہود
محروم ہیچ کس نشد از فیض عامِ ما

انصاف دہ برائے خدا صرفیا ملاف
چوں خود نشو پختہ نہ شد کار خامِ ما

عرفی شیرازی۔ سید محمد جلال الدین عرفی ۱۵۵۵ء (۹۶۳ھ) میں بمقام شیراز پیدا ہوئے۔ ایران میں ان محکموں اور عہدوں کو جو عامی پیشے سے تعلق نہیں رکھتے ہیں عرف کہتے ہیں۔ عرفی کا باپ زین العابدین بادی شیراز کے دارالحکومت میں شاہی دربار کا ایک منصب تھا۔ یہی بات عرفی کے اس تخلص کا موجب ہوئی۔ عرفی کے باپ نے اس کے لئے علوم متداولہ کے علاوہ مصوری اور نقاشی کی تعلیم کا بھی خاطر خواہ انتظام کردیا۔ جوانی میں چیچک نکل آنے سے عرفی کی صورت بگڑ گئی تھی قدرت نے اُسے بددماغی اور نازک مزاجی سے بہرہ وافر عطا کیا تھا۔ اس لئے جب اس نے شعر کہنا شروع کیا تو غیرتی شیرازی، وحشی یزدی، محتشم کاشانی اور بابا فغانی ایسے کہنہ مشق استادوں سے فخریہ چشمکیں ہونے لگیں۔ بابا فغانی کا انداز غزل گوئی ملک پر چھایا ہوا تھا۔ عرفی نے بھی فغانی کی غزلیات کو سامنے رکھ کر غزل گوئی

شروع کی۔ اگرچہ اس کے ہمجنس اس ذخیرہ کو خاطر میں نہیں لاتے تھے تاہم عرفی کا یہ کلام یہ ظاہر کرتا تھا کہ اُسے فارسی ادبیات میں ایک ممتاز رتبہ حاصل ہو گا۔

اس زمانے میں ایران میں شعر و شاعری کا بازار ویسے بھی سرد ہو چکا تھا صفویوں کا دور دورہ تھا۔ شاہ طہماسپ اور عباس کے دربار میں اگرچہ علم و ہنر رکھنے والوں کو کافی صلے ملتے تھے تاہم زیادہ چرچے مذہب کے تھے۔ محتشم کاشانی کے مرثیوں نے ایک نئی روش ڈال دی تھی جس سے عشقیہ شاعروں کو زوال آ رہا تھا۔ ادھر اکبر کی قدر شناسی اور دریا دلی نے شاعروں کے لئے کشش کا سامان کر رکھا تھا۔ غرض عرفی کا دل شیراز سے اچاٹ ہوا تو اس نے ہندوستان میں آنے کو ترجیح دی۔ وہ غالباً سنہ ۱۵۸۰ء میں سمندر کے راستہ احمد نگر آیا۔ اور وہاں سے فتح پور سیکری پہنچا۔ یہاں فیضی نے اس کی دستگیری کی اور اسی کے وسیلے سے وہ اکبر بادشاہ کے حضور میں پہنچا۔ لیکن اُسے شعرائے دربار کے زمرے میں داخل ہونے کا موقع نہ ملا۔ حکیم ابوالفتح گیلانی کی ملاقات نے عرفی کے شاعرانہ جوہر کو بہت زیادہ چمکایا اس کی وفات کے بعد عرفی عبدالرحیم خانخاناں کے دربار میں ملازموں میں شامل ہو گیا۔ سنہ ۱۵۸۹ء میں عرفی اکبر کے ساتھ کشمیر گیا۔ اسی زمانے میں لکھے گئے مشہور قصیدے کا یہ مطلع ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید   گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

سنہ ۱۵۹۱ء میں عرفی نے لاہور کے مقام پر وفات پائی۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ مرنے سے پہلے اس نے یہ رباعی لکھی ؎

عرفی دمِ نزع است و ہمان مستیٔ تو
آیا بچہ مایہ رخت بر بستی تو

فردا ست کہ دوست نقد فردوس بکف
جویائے متاع است و تہیدستی تو

عرفی کو لاہور میں ہی دفنا دیا گیا۔ چند سال بعد اس کی لاش کو یہاں سے نجف بھیج دیا گیا اور وہاں دوبارہ دفن کیا گیا۔ چنانچہ عرفی کی اپنی پیشین گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔

بہ کاوش مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہ ہند ہلاکم کنند ور بہ تتار

عرفی نے صرف ۳۵ یا ۳۶ برس کی عمر پائی۔ اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ اگر وہ زیادہ دیر زندہ رہتا تو یکتائے روزگار بنتا۔ لیکن اس تھوڑی سی عمر میں بھی اس نے شاعری میں جو کمال حاصل کیا اس کا اعتراف بڑے بڑے اساتذہ نے کیا ہے۔ ملا عبدالغنی صاحب میخانہ لکھتے ہیں کہ عرفی اپنے وقت میں تازہ گوئی، طرفہ ادائی اور شیریں بیانی کے اعتبار سے بے مثل تھا۔ عبدالقادر بدایونی لکھتا ہے کہ اس کے وقت میں ہندوستان کے فارسی شعراء میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت عرفی اور ثنائی کی تھی۔ گب نے لکھا ہے کہ جامی کے بعد ترکی شاعری پر سب سے زیادہ اثر عرفی اور فیضی نے ڈالا ہے۔ عرفی کی موت سے فارسی ادبیات کو وہی صدمہ پہنچا جو کہ انگریزی ادبیات کو بائرن کی موت سے پہنچا۔

مولانا شبلی نے عرفی کی شاعری پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ ہدیہ قارئین ہے:۔

زورِ کلام جس کی ابتدا نظامی نے کی تھی عرفی نے اس کو کمال کے درجے تک پہنچایا۔ عرفی نے سینکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور

استعارے پیدا کئے۔ جن سے جدتِ ادا اور طرفگی کے علاوہ نفس مضمون پر خاص اثر پڑتا ہے۔ اس کی پیدا کی ہوئی ترکیبوں سے مضمون میں جو زور، وسعت اور رنگینی آگئی محتاج بیان نہیں۔ ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں ؎

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی

اسی قسم کی ترکیبیں متوسطین اور متاخرین کی خاص ایجاد ہیں۔ عرفی اگر ان کی ایجاد کا یکتا نہیں ہے تاہم خدا ضرور ہے۔ عرفی کے کلام کی خصوصیات میں سے ایک بڑی خصوصیت استعارات و تشبیہات کی جدت، طرفگی اور تنوع ہے۔

عرفی کا زور طبع اور فصاحت و بلاغت کا زور شور وہاں نظر آتا ہے جہاں وہ قصائد میں مسلسل مضامین ادا کرتا ہے اور یہ اس کا خاص انداز ہے۔

عرفی چونکہ بالطبع نہایت غیور اور خود دار تھا اس لئے مجبوری اور ضرورت کی وجہ سے اکبر، شہزادہ سلیم، حکیم ابو الفتح گیلانی اور خانخاناں ایسے سلاطین و امرا کی مدح کرتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے فضائل اور اوصاف بھی جی کھول کر بیان کرتا تھا اور مزے لے کر کہتا تھا۔

اہل ادب نے فخریہ کو انواع شاعری میں ایک خاص صنف قرار دیا ہے۔ فارسی میں اس خاص صنف میں عرفی کا کوئی ہمسر نہیں۔ اس کے اچھے اچھے دوست بھی اس کے غرور کو ناپسند کرتے تھے۔ حاضر جوابی اور ظرافت میں بھی وہ بے مثل تھا۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ اس نے کبھی کسی کی ہجو نہیں لکھی۔

رضا قلی خاں نے عرفی کے اسلوب بیان کو پسند نہیں کیا لیکن

اس کے باوجود دوست اور دشمن دونوں نے اس کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کا اعتراف کیا ہے۔ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اس کی قوتِ تخئیل نہایت زبردست تھی۔ لیکن بدقسمتی سے اس زمانہ کا مذاق ہی یہی تھا کہ یہ قوت صرف مبالغہ، جدت تشبیہہ اور حسن التعلیل پر صرف کی جاتی۔ عرفی کو اگر اس سے بجا طور پر کام لینے کا موقع مل جاتا تو شاعری کی سرحد کہیں کی کہیں پہنچ گئی ہوتی ؂

فارغ ز رخ چہ نگرد در روے آفتاب — ایں دیدۂ آزمودۂ نظارہ کسے است
ایما و اشارات نہ باندازۂ راز است — ایں رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ دراز است
بہ طور عانہ گنجد متعِ دیدار — وے ایں راز با موسیٰؑ بگوئید

مجازی عشق میں جو معاملات اور واردات پیش آتے ہیں، ان کے بیان کرنے میں بھی عرفی اپنے تمام ہمعصروں سے ممتاز ہے کیونکہ وہ صرف سطحی اور سرسری وارداتیں ادا نہیں کرتا بلکہ اس کی نظر دقیق اور عمیق معاملات پر پڑتی ہے۔ اور انہیں کو وہ شاعرانہ انداز میں پیش کرتا ہے ؂

حسن را از شیوہ ہا گاہے بود میلے بناز — ورنہ موسیٰ بے طلب صد رہ تماشا کردہ بود
عرفی بحال نزع رسیدی و یہ شدی — شرمت نیامد از دل امیدوار دوست
رفت آں آفتِ جاں از بزم اے ہوش بیا — تا بہ بینم کہ چہا بر سر ایماں رفت است
ہر متاعے کز نگاہش می خرم در روزِ وصل — مے نشینم گوشۂ وز خود مکرر مے خرم

عرفی نے جس قدر غزل میں فلسفیانہ خیالات ادا کئے ہیں شاید ہی کسی شاعر نے ادا کئے ہوں گے ؂

ساکنِ کعبہ کجا؟ دولتِ دیدار کجا؟ — ایں قدر ہست کہ در سایۂ دیوارے ہست

عرفی نے اخلاق کے اکثر مسائل بیان کئے ہیں لیکن وہ صرف ان اخلاقی مسائل کو لیتا ہے جو عزتِ نفس اور علو حوصلہ سے علاقہ رکھتے ہیں، حتیٰ کہ اگر یہ اوصاف غرور و نخوت کی حد تک بھی پہنچ جائیں تو اس کے نزدیک ان اوصاف سے بہتر ہیں جن کی سرحد پست ہمتی سے مل جاتی ہے۔ مثلاً تواضع، عجز، توکل اور قناعت وغیرہ ؂

کفرانِ نعمت گلہ مندان بے ادب ۔۔۔ در کیشِ من ز شکر گدایانہ بہتر است
گر قسم آنکہ دہندم بہشت بے طاعت ۔۔۔ قبول کردن و رفتن بشرطِ انصاف است
خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا ۔۔۔ یک دم منافقانہ نشیں در کمینِ خویش
مدہ عنانِ تعلق بجسن ہر ذرّہ! ۔۔۔ بر آر دیدۂ و بر دوشِ آفتاب انداز

عرفی کی تصنیفات یہ ہیں :—

(۱) نفسیہ (رسالہ نثر در تصوف) (۲) مثنوی بجواب مخزن الاسرار نظامی (۳) مثنوی بجواب خسرو شیریں نظامی (۴) کلیات و قصائد و غزلیات جو ۹۸۸ھ میں جمع کی گئیں۔ عرفی کو مثنوی میں وہ رتبہ حاصل نہیں جو اس نے قصیدہ اور غزل میں پایا ؂

مثنویش رنگِ فصاحت نداشت ۔۔۔ کانِ نمک بود و ملاحت نداشت

ملا طاہر غنی کاشمیری

غنی کشمیری فارسی کے بہت بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ آپ کی زندگی کے بارے میں تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ کے آباو اجداد بخارا سے خراسان کے راستے سے کشمیر میں وارد ہوئے تھے جب

شاہ ہمدان کشمیر تشریف لائے تھے۔ آپ سنہ ۱۰۴۰ھ میں سری نگر میں پیدا ہوئے۔ غنی کو بچپن سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا۔ آپ نے ملا محسن فانی کی شاگردی اختیار کی۔ آپ کی طبیعت میں فطری روانی اور لطیف مذاق پائی جاتی تھی۔ آپ نے جوانی کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے طاہر تخلص اختیار کیا۔ بعد میں غنی تخلص اپنا لیا۔

آپ کی طبیعت درویشی اور قناعت پسندی پر مائل تھی۔ دنیا کے دھندوں اور جھمیلوں سے نفرت تھی۔ شہرت اور خود نمائی بالکل نہیں چاہتے تھے۔ عام لوگوں سے الگ تھلگ رہتے۔ اس کے باوجود ان کی بڑی قدر و منزلت تھی اور جب اورنگ زیب شہنشاہ ہندوستان نے انہیں دربار شاہی میں آنے کی دعوت دی تو انہوں نے دیوانگی کا بہانہ پیش کیا اور دربار میں حاضر ہونے سے معذرت ظاہر کی۔

کہتے ہیں کہ غنی نے لگ بھگ ایک لاکھ شعر کہے۔ آپ کا کلام خوشامد اور مدح گوئی سے سراسر پاک ہے۔ آپ اپنی جھونپڑی ہی کے اندر بیٹھے رہتے اور دروازہ ہر وقت کھلا رہتا۔ آپ کی وفات سنہ ۱۰۷۷ھ میں ہوئی۔

غنی کے کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

جنونے کو کہ از قید خرد بیروں کشم پا را ۔۔۔ کنم زنجیر پائے خویشتن دامانِ صحرا را

بہ بزم مے پرستاں محتسب خوش عزتے دارد ۔۔۔ کہ چوں آید بہ مجلس شیشہ خالی میکنند جا را

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو ۔۔۔ کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

بہ بزم مے پرستاں سرکشی بر طاق نہ زاہد ۔۔۔ کہ میریزند مستاں بے محابا خون مینا را

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ روشن کرد نور دیدہ اش چشم زلیخا را

سرمد

سرمد کے آباؤ اجداد یہودی تھے۔ جب اس یہودی خاندان نے اسلام قبول کر لیا تو سرمد کا نام سعید رکھا گیا۔ شروع میں اس نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ ایران سے وہ مال لے کر ہندوستان میں وارد ہوا۔ جب سندھ کے شہر ٹھٹھ میں پہنچا تو ایک ہندو لڑکے کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ دیوانہ وار سندھ کے ریگستان میں پھرتا رہا۔ آخر شاہجہان آباد میں پہنچا۔

سرمد ایک بلند درجہ عالم اور شاعر تھا۔ مغل شاہزادہ دارا شکوہ سے ملاقات ہو گئی۔ دارا شکوہ کو اس سے عقیدت ہو گئی۔ جب اورنگزیب بادشاہ بن گیا تو دارا شکوہ اپنی جان بچانے کے لئے دہلی سے بھاگ گیا۔ لیکن سرمد دہلی ہی میں رہ گیا۔ حاسدوں نے سرمد پر کفر کا الزام لگایا۔ اورنگ زیب نے علمائے دین کی ایک مجلس منعقد کی۔ سرمد کو کافر قرار دیا گیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جس جگہ اس کی گردن کاٹی گئی وہیں اس کی قبر بنا دی گئی۔

نمونۂ کلام:۔

رباعیات

(۱)

از باد صبا خواست دلم بوئے ترا چشم ز چمن جست گلِ روئے ترا
آخر نہ ازیں دو چار گشتی نہ ازآں اندیشہ نشاں داد رہِ کوئے ترا

(۲)

ہر جا کہ غم یار بود آرام است
بے ایں بجہاں ہر کہ بود ناکام است
غافل نہ شوی ز یار و نوبادۂ ناب
گر دولتِ جم مے طلبی با جام است

(۳)

بے سرو قدی کہ رو نماید یار است
بے سیم بری کہ زر زباید یار است
آں یار گزیں کہ ہر چہ خواہی بدہد
یارے کہ بکار تو بیاید یار است

صائب اصفہانی - صائب ایک معزز خاندان کا فرد تھا۔ اس کا باپ مشہور تاجر تھا۔ اس کی ولادت تبریز میں ہوئی لیکن نشو و نما و تربیت و تعلیم اصفہان میں حاصل کی۔ اسی بنا پر اس کو تبریزی اور اصفہانی دونوں کہتے ہیں۔ شعر و شاعری سے اس کو قدرتی مناسبت تھی آغاز شعور میں جب اس کی شاعری کے چرچے ہونے لگے تو ایک شخص نے امتحان کے طور پر ایک مہمل مصرع پیش کیا کہ اس پر مصرع لگا دیجئے۔ مصرع یہ تھا ؎

"شمع گر خاموش باشد آتش از مینا گرفت"

صائب نے پیش مصرع کہہ کر مصرع کو با معنی کر دیا ؎

امشب از ساقی زلبس گرم ست محفل میتواں
شمع گر خاموش باشد آتش از مینا گرفت

باوجود شاعری کے صائب پر مذہبی خیالات بہت غالب تھے آغازِ شباب میں حرمین کا سفر کیا۔ واپسی کے بعد مشہد مبارک کی زیارت کی۔ اور اظہار عقیدت کے طور پر ایک قصیدہ لکھا۔

صائب نے شاعری کی باقاعدہ تعلیم حکیم رکنا مسیح کاشانی اور حکیم شفائی سے حاصل کی۔ حکیم رکنا مشہور شاعر گذرا ہے۔ شاہ عباس صفوی اس کے گھر پر اس سے ملنے آتا تھا۔ شاہ عباس کو حاسدوں نے اس کی طرف سے رنجیدہ کر دیا تو حکیم رکنا نے دربار سے قطع تعلق کر لیا۔

ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی فیاضیوں کے غلغلہ سے تمام ایران گونج اٹھا۔ صائب کے دل میں بھی ہندوستان آنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ خود کہتا ہے ؎

ہمچو عزم سفر ہند کہ در ہر دل است ۔۔۔ رقص سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

صائب چونکہ ایک معزز تاجر کا بیٹا تھا اس لئے تجارت کے ذریعہ سے دلّی میں آیا۔ شاہجہاں کے دربار میں رسائی حاصل کی اور ہزاری منصب اور مستعد خاں کا خطاب عطا ہوا۔ مرزا صائب کے باپ کو صائب سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ اس نے ستّر برس کی عمر میں ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور بیٹے کو واپس اپنے وطن ایران میں لے گیا۔ ایران میں سلاطین صفویہ نے مرزا صائب کی بڑی عزّت کی۔ مرزا نے بھی ان کی مدح میں پُر زور قصائد لکھے۔ شاہ عباس ثانی نے اس کو ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا۔

مرزا نے اگرچہ اخیر زندگی تک ایران سے قدم باہر نہ رکھا تاہم ہندوستان کی فیاضیاں رہ رہ کر یاد آتی تھیں۔ مرزا نے ۱۰۸۰ھ میں بمقام اصفہان وفات پائی۔ "صائب وفات یافت" مادہ تاریخ ہے۔ صائب اگرچہ تمام اساتذہ بلکہ ہمعصروں کو ادب سے یاد کرتا تھا

لیکن خاص خاص اساتذہ کا نہایت معتقد تھا۔ سب سے زیادہ حافظ کا معترف تھا۔ یہ اس کی صحیح المذاقی کی بہت بڑی دلیل ہے حکیم رکنا اور شفائی کا شاگرد تھا۔ اس لئے ان دونوں کا نام نہایت ادب سے لیتا ہے ؎

این آں غزل حضرت رکنا ست کہ فرمود
"پائے ملخ پیش سلیماں چہ نماید"
در اصفہان کہ بدر د سخن رسد صائب
کنوں کہ نبض شناس سخن شفائی نیست

میرزا صائب نے ہر قسم کے اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ قصائد متعدد ہیں۔ ایک چھوٹی سی رزمیہ مثنوی لکھی ہے۔ اور غزل تو اس کا خاص فن ہے۔ لیکن قصائد اور مثنویاں کم رتبہ ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اس دور سے پہلے ابتر ہو چکی تھیں۔ اور مرزا بھی اس کی کچھ تلافی نہ کر سکا۔

مرزا نہایت پُرگو اور بدیہہ گو تھا۔ جس زمانے میں وہ برہان پور دکن میں تھا ایک قصیدہ ساٹھ شعروں کا صرف دو پہر میں لکھا تھا ایک دفعہ اس کے ایک شاگرد نے ایک مہمل مصرع پیش کیا کہ اس پر مصرع لگائیے۔ مصرع یہ تھا۔

از شیشہ بے مے، مئے بے شیشہ طلب کن

صائب نے فوراً کہا:۔

حق را ز دلِ خالی از اندیشہ طلب کن

مرزا کی زندگی ہی میں اس کے کلام کو یہ حسنِ قبول حاصل ہو چکا تھا کہ سلاطین اور امرا شاہِ ایران سے اس کے کلام کی استدعا کرتے تھے اور تحفہ اور سوغات کی طرح اس کی غزلیں بھیجی جاتی تھیں۔

مرزا نے فنِ سخن کے متعلق ایک بڑا کام یہ کیا کہ قدما اور متاخرین

کا کلام انتخاب کر کے ایک بیاض مرتب کی جو سخندان کے لئے دلیلِ راہ
کا کام دیتی ہے۔ مرزا کا اپنا انداز گو خاص ہے اور وہ شاعری کا معمولی
درجہ ہے لیکن چونکہ اس کا مذاق نہایت صحیح تھا اس لئے بلند اور نادر
اشعار انتخاب کئے ہیں۔ جس شاعر کے جتنے اشعار انتخاب کر دیئے
ہیں وہی اس کے تمام دیوان کا عطر ہے۔

مرزا کے لطائف و ظرائف مشہور ہیں۔ جس زمانے میں وہ کشمیر
میں تھا ایک دن ظفر خاں کے دربار میں اشعار پڑھ رہا تھا اور ہر
طرف سے تحسین و آفرین کی صدا بلند تھی۔ ایک نوخیز نے حسد سے
کہا کہ یہ تمام مضامین قدما کے یہاں بندھ چکے ہیں۔ موجودہ شاعروں
کا یہ کام رہ گیا ہے کہ صرف لفظوں کو الٹ پلٹ کر دیتے ہیں۔ صائب
نے برجستہ کہا :-

اہلِ دانش جملہ مضمونہائے رنگیں بستہ اند   ہست مضمونِ نہ بستہ از مرا و از شما

چونکہ شعر اتفاقاً حسب حال تھا ظفر خاں بے اختیار ہنس پڑا
اور مرزا کو انعام دیا۔

مرزا کا خاص انداز تمثیل ہے۔ تمثیل کا طریقہ پہلے بھی تھا لیکن
صائب نے اس کثرت سے اس کو برتا ہے کہ اس کی خاص چیز ہو گئی۔
اس کے علاوہ اور شعرا عام مضامین میں تمثیل سے کام لیتے تھے
صائب نے اخلاقی مضامین کے لئے اسے خاص کر دیا۔ جا بجا
خیال بندی اور مضمون آفرینی ہے یہ خاص متاخرین کا انداز ہے۔
اگرچہ صائب کے ہاں وہ لطیف خیالات اور عشق و محبت کے
اسرار نہیں پائے جاتے جو عرفی اور نظیری کے ہاں نہایت کثرت سے

پائے جاتے ہیں تاہم زبان کی فصاحت، ترکیب کی بندش، محاورات کا استعمال ہاتھ سے نہیں جانے پاتا بخلاف اور متاخرین کے جن کے کلام کو پڑھ کر زبان کی خوبیوں کی طرف مطلق ذہن متوجہ نہیں ہوتا۔

نمونۂ کلام:

قمریاں پاسِ غلط کردہ خود می دارند ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تو نیست

چشم عاشق از تماشائے تو چوں سیر شود ہر نگہ سلسلہ جنبانِ نگاہِ دگر است

مرا بروز قیامت غمے کہ ہست این است کہ روئے مردم عالم دوبارہ باید دید

کہ گذشت ست ازیں یاد بہ نگر کہ امروز نبضِ رہ مے طپد و سینہ صحرا گرم است

صائب کا خاص فن تغزل ہے۔

نظیری نیشاپوری: محمد حسین نام، نظیری تخلص اور نیشاپور وطن تھا۔ شاعری کا ابتدا سے شوق تھا۔ اور ابتدائے مشق سے ہی شہرت ہو چکی تھی۔ خراسان میں جب اس کی شاعری مسلم ہو چکی تو کاشان میں آیا۔ یہاں حاتم، فہمی، مقصود خردہ، شجاع، رضائی شاعری میں استاد تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کے مشاعروں میں نظیری بھی طبع آزمائی کرتا تھا۔ اس زمانے میں عبدالرحیم خانخاناں کی فیاضیوں کا شہرہ دور دور پھیل چکا تھا۔ نظیری نے بھی اس کے

دربار کا قصد کیا اور آگرہ میں خانخاناں سے ملا۔ خانخاناں کی مدد سے اسے اکبر کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ اکبر کی مدح میں اس نے متعدد قصیدے لکھے جو مقبول ہوئے لیکن دربار میں اُسے کوئی خاص امتیاز نصیب نہ ہو سکا اس لئے اس نے اپنا مستقل تعلق خانخاناں کے دربار سے قائم رکھا۔ احمد آباد (گجرات) میں سکونت اختیار کی چند برس کے بعد حج کا ارادہ کیا۔ اور اس تقریب میں ایک قصیدہ لکھ کر خانخاں کی خدمت میں پیش کیا۔

خانخاناں نے نظیری کے سفر حج کا سامان کر دیا۔ چنانچہ سورت سے جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ کو روانہ ہوا۔ راستہ میں بدوؤں نے لوٹ لیا۔ تاہم اس نے حج اور زیارت حاصل کیں۔ حج سے واپس آکر نظیری نے مراد (شہزادہ) کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اکبر نے شہزادہ مُراد کو دکن کی مہم پر بھیجا تھا وہ ان اطراف میں فوجیں لئے ہوئے پڑا تھا۔ نظیری چلتا پھرتا اس طرف جا نکلا۔ اور شہزادہ مُراد کے حضور میں نوروز کے جشن کے موقع پر ایک قصیدہ پیش کیا۔

اکبر کی وفات (سنہ ۱۰۱۴ھ) کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے نظیری کا شہرہ سُن کر اسے دربار میں طلب کیا۔ نظیری حاضر ہوا اور انوری کے ایک قصیدہ پر لکھ کر پیش کیا۔ بادشاہ نے ایک ہزار روپیہ اور خلعت عطا کی جہانگیر کی فرمائش پر ایک عمارت کا کتابہ لکھنے پر نظیری کو تین ہزار بیگہ زمین انعام میں ملی۔

گلزار ابرار میں مذکور ہے کہ نظیری نے مرنے سے بارہ برس پہلے ترکِ دنیا کر کے گوشۂ عزلت اختیار کیا۔ نظیری نے سنہ ۱۰۲۱ھ میں وفات

پائی اور احمد آباد میں مکان کے قریب ایک مسجد میں مدفون ہوا۔

ایک دفعہ نظیری نے خانخاناں سے کہا کہ لاکھ روپے کا ڈھیر لگایا جائے تو کس قدر ہوگا؟ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ خانخاناں نے لاکھ روپے منگوا کر سامنے رکھ دیئے۔ نظیری نے کہا خدا کا شکر ہے آپ کی بدولت میں نے لاکھ روپے تو دیکھ لیئے۔ خانخاناں نے روپے اس کے گھر بھجوا دیئے۔

نظیری نے امیرانہ زندگی بسر کی اور امرا میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ بخلاف اور شعرا کے وہ مذہب میں سخت تھا۔ اور آزادیٔ خیال پر تلملاتا تھا۔

اس زمانہ میں نظیر نام کا ایک شاعر تھا۔ نظیری نے اسے لکھا کہ تم اپنا تخلص بدل دو کیونکہ دونوں تخلصوں میں اشتباہ ہوتا ہے۔ نظیری نے اسے دس ہزار روپے دیئے اور نظیر نے اپنا تخلص ترک کر دیا۔

کلام نظیری کی خصوصیات:

۱۔ ندرت تراکیب وجدّت انداز: نظیری نے اپنے کلام میں سینکڑوں نئی ترکیبیں نئے اور اچھوتے انداز میں استعمال کی ہیں۔ جس سے زبان میں وسعت اور زور پیدا ہونے کے علاوہ تاثیر کا سامان بھی فراہم ہوا۔

۲۔ اکثر وجدانی باتوں کو ایسے طریقے سے ادا کرتا ہے کہ مجسّم بن کر سامنے آجاتی ہیں۔ اور اس سے خاص لطف پیدا ہوتا ہے۔ خیالات اور جذبات کی صحیح صحیح تصویر لفظوں میں کھینچ کے رکھ دیتا ہے اور

جس چیز کو بیان کرتا ہے وہ سامع کی آنکھوں میں گھومنے لگتی ہے۔

۳۔ نظیریؔ اکثر حالات اور کیفیات کی تشبیہ مادیات اور محسوسات سے دیتا ہے اس سے ایک خاص استعجاب کا اثر پڑتا ہے۔

۴۔ نظیریؔ اکثر عشق اور عاشقی کی سچی اور صحیح وارداتیں بیان کرتا ہے۔ اس لئے دل پران کا خاص اثر ہوتا ہے ؎

خواہی کہ تو بیش شود عشق نظیریؔ | گاہ از نظر خویش پراں گاہ نگہ دار
بغل از نامۂ احباب پُر کردو نمے خواند | کہ مے ترسد شود مکتوب من ہم از میاں پیدا

۵۔ نظیریؔ کے کلام میں فلسفہ کم ہے۔ لیکن جس قدر ہے نہایت خوبی سے ادا ہوا ہے ؎

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ | جرمِ گناہِ دیدۂ صورت پرست ماست
خضر صد منزل بہ پیشم آمد و نشناختم | بازے باید ز سر گیرم رہِ پیمودہ را

۶۔ اس زمانے کے تمام شعرا کا اصلی جوہر طرزِ ادا کی جدّت ہے۔ نظیریؔ اس میدان میں اکثر حریفوں سے آگے ہے ؎

از کف نمی دہد دل آساں ربودہ را | دیدیم زورِ بازوئے نا آزمودہ را
بازم بہ کلبہ کیست نہ شمع و نہ آفتاب | بام و درم ز ذرہ و پروانہ پر شد است
عارفاں گوشۂ چشمے بدو عالم ندہند | ہر کجا یار نقاب از رُخِ زیبا برداشت

۷۔ نظیریؔ غزلوں میں کسی حالت کو مسلسل لکھتا جاتا ہے اور غزل کی غزل اُسی ایک حالت کے بیان میں تمام ہو جاتی ہے ؎

دارم درین دیارِ مغاں شیوۂ دلبری | بیخود خوش و میانہ خوش و ہوشیار خوش
دستار افگند خم کاکل پراگند | کاین است وضعِ صحبت و زیں ساں نگار خوش
شاد و شگفتہ مطرب و ساغر طلب کند | یک شوخ حجابے و در آید بکار خوش

۸۔ نظیری نے روزمرہ اور محاورات کا کثرت سے استعمال کیا ہے ؎

ع :۔ طفل بودیم کہ باز از شکر و شیر شدیم

ع :۔ سخت است حال مشکل اگر تا سحر کشم

ع :۔ شب آخر گشتہ افسانہ از افسانہ می خیزد

فغانی شیرازی ۔ تمام اہلِ فن اور ارباب تذکرہ کا اتفاق ہے کہ متوسطین کی شاعری میں انقلاب پیدا ہو کر جو نیا دور قائم ہوا وہ متاخرین اور نازک خیالوں کا دور کہلاتا ہے ۔ اس کا بانی فغانی ہے لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ ایسے شخص کے حالات بھی ارباب تذکرہ دو چار سطر سے زیادہ لکھنا گوارا نہیں کرتے ۔ بہر حال ایک ایک نکتہ کا سراغ لگا کر جو سرمایہ ہاتھ آیا ہے وہ نذر احباب ہے (شبلی)

فغانی کا وطن شیراز ہے ۔ سام مرزا نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ پہلے چاقو بنایا کرتے تھے ۔ شاعری کا آغاز تھا کہ ہرات میں آئے ۔ اس زمانے میں شاعری کا جو انداز مقبولِ عام تھا وہ سلطان حسین میرزا کے شعرا کا انداز تھا ۔ چونکہ فغانی کا رنگ ان سے الگ تھا اس لئے کسی نے ان کی قدر نہ کی بلکہ ان کے کلام کو اس قدر لغو سمجھتے تھے کہ جب کسی کا کوئی مہمل شعر پڑھا جاتا تھا تو کہتے تھے فغانیہ ہے ۔ جامی اس وقت تک زندہ تھے ۔ فغانی ان سے ملے لیکن ان سے بھی فغانی کو داد نہ ملی ۔ بالآخر تبریز میں آئے ۔ یہاں سلطان یعقوب فرمانروا تھا ۔ اس نے ان کی نہایت قدر دانی کی ۔ چنانچہ انہوں نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے جو دیوان میں موجود ہیں ۔ سلطان

نے ان کو بابا کا خطاب دیا۔ سلطان یعقوب کے انتقال کے بعد بیورو میں آکر قیام کیا۔

نہایت لاابالی مزاج اور رند تھے۔ شراب حد سے زیادہ پیتے تھے۔ اکثر میخانوں میں گذرتی تھی۔ اسی بنا پر بیورو کے حاکم نے ان کا روزینہ شراب اور گوشت مقرر کر دیا تھا۔ آخیر عمر میں توبہ کی اور مشہد میں معتکف ہو گئے۔ ۹۲۵ھ میں وفات پائی۔

شروع میں جب اپنے بھائی کی دوکان میں چھری بنایا کرتے تھے تو اس مناسبت سے سکاکی تخلص رکھا تھا۔ پھر فغانی رکھا۔

ان کا دیوان ایک لڑائی کے ہنگامے میں تلف ہو گیا۔ بھائی کو خط لکھا کہ جہاں کہیں سے جو کچھ مل سکے جمع کرو۔ چنانچہ جگہ جگہ سے تلاش کر کے وہ مجموعہ مرتب ہوا جو آج موجود ہے لیکن اصل مرتب شدہ دیوان جاتا رہا۔

تبصرہ:۔ ان کو تمام اہلِ سخن مجددِ فن مانتے ہیں۔ والہ داغستانی لکھتے ہیں: "بابا فغانی ایک ایسا جدت پسند شاعر ہے جس سے پہلے کسی نے اس کی طرز میں شعر نہیں کہے۔ اس نے شاعری کا درجہ اس قدر بلند کیا جہاں طائرِ خیال کی رسائی بھی نہیں۔ زمانے کے اکثر اساتذہ مثلاً مولانا وحشی یزدی، مولانا نظیری نیشاپوری، مولانا ضمیری اصفہانی، خواجہ حسین ثنائی، مولانا عرفی شیرازی، حکیم شفائی اصفہانی، حکیم مسیحا کناری کاشی اور مولانا محتشم کاشانی وغیرہ اس (فغانی) کے پیرو اور شاگردِ اور اس کی طرزِ ادا کے خوشہ چین ہیں۔

متاخرین کی جو خصوصیتیں ہیں وہ متوسط حد تک فغانی کے

کلام میں موجود ہیں۔

نمونہ کلام :۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست ۔ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اے کہ میگوئی چرا جامے بجانے مے خری ۔ ایں سخن با ساقی ما گو کہ ارزاں کردہ است

بد گفتن من شد ہنر حاسدِ منکر ۔ صد شکر کہ علیم ہنر بے ہنراں است
خراب آں کمر ناز کم کہ چوں مہ تو ۔ بہ شیوہ ہائے بلند از میان زمین پیدا ست
ساقی مدام بادہ باندازہ می دہد ۔ ایں بیخودی گناہِ دلِ و دمستِ ماست

طالب آملی :۔

سلسلۂ تیموریہ میں یوں تو ہر فرمانروا سخن فہم اور ادا شناس گذرا ہے لیکن جہانگیر اس فن میں اجتہاد کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ فطرتاً محبّت کیش تھا، عشق اس کا خمیر تھا۔ چونکہ فیضی کا شاگرد رشید تھا اس لئے شعر و شاعری کا نکتہ دان اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔ شہزادگی کے زمانہ سے شعرا اس کے دربار میں ملازم رہتے تھے۔ لیکن ملک الشعرائی کا تاج اس نے طالب آملی کے سر پر رکھا جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ شاعر کس پایہ کا ہوگا۔ اس وقت طالب کی عمر بیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس عمر میں یہ اعزاز خاص اسی شاعر کا کارنامۂ اقبال ہے۔

طالب آمل کا رہنے والا تھا جو مازندران کا ایک شہر ہے۔ بچپن میں درسی علوم و فنون کی تعلیم پائی پندرہ سولہ برس کی عمر تک اس نے

ہندسہ، منطق، فلسفہ، تصوف اور خوش نویسی میں کمال حاصل کر لیا تھا۔

اس زمانہ میں مازندران کا حاکم جس کو ایران کی اصطلاح میں وزیر کہتے تھے میر ابوالقاسم تھا۔ اس کی مدح میں متعدد قصائد لکھے یہ معلوم نہیں کہ کن اسباب سے یہاں طبیعت سیر ہوئی اور کاشان میں چلا آیا۔ یہاں مستقل سکونت اختیار کی اور شادی بھی کر لی۔ تذکرہ میخانہ میں لکھا ہے کہ اس کی شاعری کا نشوونما یہیں ہوا۔ لیکن چند روز کے بعد یہاں سے بھی برداشتہ خاطر ہو کر مرو میں آیا۔ یہ عباس صفوی کا زمانہ تھا اور ملکش خاں صوبے کا گورنر تھا۔ طالب نے ملکش خاں کے دربار میں رسائی حاصل کی اور مدحیہ قصائد لکھے۔ دو برس تک یہاں قیام رہا۔ ملکش خاں نے قدردانی میں کمی نہ کی ہو گی لیکن طالب ہندوستان کی فیاضیوں کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ایک مثنوی لکھ کر ملکش خاں سے وطن جانے کی اجازت حاصل کی۔ وطن کا بہانہ تو اس لئے تھا کہ ہندوستان کا نام لیتا تو اجازت کیونکر ملتی ملکش خان سے رخصت ہو کر طالب نے سیدھا ہندوستان کا راستہ لیا۔

میخانہ کے مصنف نے جو خود طالب کا ہمعصر اور ہم صحبت تھا، لکھا ہے کہ طالب مرو سے نکل کر سیدھا قندھار پہنچا۔ لیکن یہ تعجب انگیز غلطی ہے۔ قندھار جانے کا حال طالب نے خود ایک قصیدہ میں لکھا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان میں برسوں رہ کر قندھار گیا تھا۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اول جب وہ ہندوستان میں آیا تو یہاں اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اور اس وجہ سے وہ تمام مشہور

مقامات میں بہ تلاشِ معاش پھرتا رہا۔ دلی، لاہور، ملتان، سرہند کا ذکر اس نے خاص طور پر کیا ہے۔ لاہور میں زیادہ دل لگا۔ چنانچہ لاہور کی مدح میں اس نے ایک خاص قصیدہ لکھا۔ ان شہروں میں وہ رندانہ وضع سے رہا اور خرمنِ حسن کی خوشہ چینی کرتا رہا۔ خوش قسمتی سے حسینوں نے بھی اپنے پہلو میں اس کو جگہ دی۔

قندھار سے واپس آنے کے بعد طالب آگرہ میں آیا۔ خواجہ قاسم دیانت خاں نے جو امرائے جہانگیری میں حضور رس تھا اس کی قدر دانی کی۔ اور سفارش کر کے اُسے گجرات کے حاکم عبداللہ خاں کے پاس بھیجا۔ عبداللہ خاں نے طالب کی بڑی قدر کی اور انعام و اکرام سے مالامال کیا۔

شاہ پور طہرانی کے نام کے شاعر سے طالب نے راہ و رسم پیدا کی اور لاہور میں اس سے جا ملا۔ اس شاعر کی مدد سے طالب نورجہاں بیگم کے والد اعتماد الدولہ کے دربار میں پہنچا۔ اعتماد الدولہ کی عنایت و مدد سے طالب کو جہانگیر کے دربار میں رسائی حاصل ہو گئی۔ اور وہاں تقرب نصیب ہوا۔ اور بادشاہ نے اُسے زمرۂ شعرا میں داخل کر لیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۰۲۸ھ میں ملک الشعرائی کا خطاب عطا ہوا۔

طالب نہایت دوست پرور، وفا شعار اور خوش اخلاق تھا۔ زمانہ کی ضرورتوں نے اگرچہ اُس سے در در کی خاک چھنوائی لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرتاً غیور تھا۔ اس نے ہر موقع پر اپنی آن قائم رکھی۔

تبصرہ:۔ اس امر میں طالب تمام شعرا سے ممتاز ہے کہ وہ فطرتاً شاعر تھا یعنی جب نہایت کم سن تھا اس وقت سے شعر کہتا تھا۔ ایک قصیدہ جو کلیات میں موجود ہے اس وقت کا ہے جب تقریباً اس کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ وہ نہایت جلد شعر کہتا تھا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اس نے قلم ہاتھ میں لیا اور بے تکلف لکھتا گیا۔ دو تین گھنٹے میں پچاس ساٹھ شعروں کا قصیدہ تیار ہو گیا۔

شاعری میں طالب کا امتیازی وصف صرف دو چیزیں ہیں۔ ندرت تشبیہ و لطف استعارہ۔ استعارات کی نزاکت اس کے دور سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ لیکن اس نے اور زیادہ لطافت اور ندرت پیدا کر دی۔ اس کا کلام کہیں سے اٹھا کر دیکھو ہر جگہ نئے نئے استعارات نظر آئیں گے۔ ان میں سے اکثر لطیف اور نازک ہیں اور بعض معمہ سازی اور چھوٹے طلسم میں

نمونۂ کلام:۔

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

عشق در اوّل و آخر ہمہ جداست و سماع
ایں شرابے ست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

دو لب خواہم یکے در مے پرستی
یکے در عذر خواہی ہائے مستی

بے نیازانہ ز ارباب کرم میگذرم
چوں سیہ چشم کہ بر سرمہ فروشاں گذرد

یا صد کرشمہ آں بت بد مست می رود
خود می کند خرام و خود از دست می رود

ابو طالب کلیم:

ابوطالب کلیم ہمدان میں پیدا ہوا۔ لیکن کاشان میں زیادہ قیام رہا۔

آغاز جوانی میں شیراز جاکر علوم درسیہ کی تحصیل کی۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا۔ شاہ نواز خاں صفوی (جو امرائے جہانگیر میں شامل تھا) کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ لیکن ۱۰۲۸ھ میں وطن کی یاد نے ستایا۔ اس زمانے کا ہندوستان وہ چیز تھی کہ کلیم گو وطن جارہا تھا لیکن حسرتوں کا انبار لیئے جاتا تھا۔ اس حالت میں وطن میں کیا جی لگتا۔ دو برس بعد پھر ہندوستان کو لوٹ آیا۔ اور میر جملہ کا دامن پکڑا۔ چنانچہ ۱۰۳۷ھ میں باریاب ہوا۔ دونیم ہزاری کا منصب ملا۔ شاہجہاں کے زمانے میں پنجہزاری تک پہنچا۔ کلیم کی شاعری کا اگرچہ سکہ جمتا جاتا تھا اس کے سرپرست بھی دربار شاہی میں خاص اعزاز رکھتے تھے لیکن جہانگیر تک اس کی رسائی نہ ہوسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعرا طالب آملی تھا اور اس کے سامنے کلیم کا فروغ پانا ناممکن تھا۔ کلیم کی ناکامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نور جہاں اس کی شاعری کی معتقد نہ تھی۔ اور اکثر اس کے اشعار پر حرف گیری کیا کرتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کلیم نے دربار میں پہنچنے سے پہلے جا بجا خاک چھانی۔ شاہجہان نامہ میں لکھا ہے کہ وہ دکن میں مارا مارا پھرا۔ اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ کلیم کا ایک قصیدہ ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں بھی ہے۔ ایک آدھ قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیجاپور کے ارادہ سے چلا تھا کہ راہ میں جاسوسی کے شبہ میں پکڑا گیا اور قلعہ شاہدرہ میں قید رکھا گیا۔

بہر حال رفتہ رفتہ شاہجہاں کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور ملک الشعرا کا خطاب ملا۔ ۱۰۴۲ھ میں جب شاہجہاں نے

کروڑ روپے کی لاگت سے تخت طاؤس تیار کرایا اور آگرہ میں جشن نوروز کے دن اس پر جلوس کی رسم ادا کی تو کلیم نے قصیدہ لکھا۔ شاہجہاں نے اس کے صلے میں اسے روپوں کے برابر تلوایا چنانچہ پانچہزار پانچ صد روپے وزن میں آئے اور اس کو عطا کئے۔

کلیم بخلاف اور شعرا کے نہایت صاف دل، سیر چشم اور فیاض طبع تھا۔ معاصر اور حریف شعرا کی عزت کرتا تھا اور گرمجوشی سے ملتا تھا وہ نہایت حاضر جواب اور مضمون یاب بھی تھا۔

کلیم نے شاعری کی تمام قسموں میں طبع آزمائی کی ہے۔ قصائد کثرت سے ہیں، مثنویاں بھی خوب ہیں۔ غزلوں کا دیوان الگ ہے۔ قطعات اور رباعیات پر بھی توجہ دی ہے۔ قصیدہ گوئی میں کلیم نے حاجی محمد جان قدسی کا انداز اختیار کیا ہے یعنی عرفی اور نظیری کی پیچیدار اور مشکل بندشیں صاف کر دیں۔ مبالغہ اور حسن تعلیل کو وسعت دی لیکن اس کے ساتھ ہی قصیدہ کی متانت، زور اور بلندی کم ہو گئی اور غزلیت کا رنگ غالب آگیا۔

جس چیز کو لوگ مضمون آفرینی کہتے ہیں کلیم کے یہاں اس کی اس قدر بہتات ہے کہ ہر قصیدہ گویا مضامین کا ایک انبار ہے۔ قصائد کی تمہید اکثر واقعات سے شروع کرتا ہے مثلاً موسم کی گرمی اور سردی، سفر کی سختی، پہاڑوں کی دشوار گذاری وغیرہ۔ لیکن مضامین کی باریکیوں سے ایک طلسم پیدا کر دیتا ہے۔ کلیم کے کلام میں اپنے معاصرین کے مقابلے میں ترکیبوں کا سلجھاؤ، روزمرہ کی صفائی، محاورات کی برجستگی روانی اور شستگی زیادہ ہے۔

کلیم کا اصلی کمال غزل گوئی ہے۔ غزل میں اس کے پیشروؤں نے خاص خاص باتیں پیدا کی تھیں، مثلاً عرفی نے فلسفہ، نظیری نے تغزل، طالب آملی نے شوخی، استعارات، وحشی نے معاملہ بندی، کلیم کے یہاں گو تغزل کے سوا اور سب کچھ ہے لیکن اس کا خاص رنگ مضمون بندی اور خیال آفرینی ہے۔ مثالیہ جو صائب کا خاص انداز ہے اس کی ابتدا بھی کلیم نے ہی کی۔

اکثر لوگوں کے نزدیک شاعری صرف تخیئل کی قوت کا نام ہے۔ کلیم ہمہ تن شاعری ہے۔ اس کا ہر شعر تخئیل کا ایک منظر ہے۔ شاعر کو تمام عالم اور عالم کے تمام واقعات قوت تخئیل کی وجہ سے ایک اور ہی صورت میں نظر آتے ہیں۔

کلیم کبھی بھی روزمرہ اور محاورہ سے غافل نہیں ہوتا۔ مضمون آفرینی اور خیال بندی کی رو میں بہہ کر وہ لطف زبان سے کبھی لاپروا نہیں ہوتا۔ روزمرہ کے علاوہ اکثر وہ ٹھیٹ محاورے برتتا ہے جو ایران کے اہلِ زبان کا حصہ ہیں اور جن کو عام آدمی فرہنگ کے بغیر سمجھ بھی نہیں سکتے۔ مثلاً ع

"گریاں ز بزم رفت و سر خویشتن گرفت"

(سر خویشتن گرفت :- اپنی راہ لی)

ع :- دشمنِ خود را چرا کس ایں قدر پہلو دہد

(پہلو دادن :- پہلو بچانا)

ع :- عجب پیرے کہ می مالد جواں را

(مالیدن :- پچھاڑنا)

ع :- امید بوسہ ات چہ نمک ، داشت اے کلیم

(چہ نمک داشت : یعنی اس میں کیا لطف تھا!)

ملک الشعرا فیضی :-

فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا کئے جن کو اہلِ زبان (ایرانیوں) نے شاعر مانا۔ وہ ہیں خسرو اور فیضی۔ افسوس ہے کہ شاعری کی شہرت نے فیضی کے دیگر تمام کمالات پر پردہ ڈال دیا۔ وہ خود کہتا ہے اور سچ کہتا ہے ؎

امروز نہ شاعرم حکیمم   دانندۂ حادثات و قدیم

فیضی عربی النسل ہے۔ اسلاف یمن میں رہتے تھے شیخ موسیٰ جو فیضی کی پانچویں پشت میں ہیں وطن سے ترکِ تعلق کر کے سیاحت کو اٹھے۔ اور چلتے پھرتے سندھ کے علاقے میں آئے۔ ریل نام کے ایک قصبہ میں قیام کیا۔ اور شادی کر لی۔ دسویں صدی ہجری میں شیخ خضر فیضی کے دادا وطن چھوڑ کر ناگور میں آئے۔ یہاں ایک عربی خاندان میں شادی کی جس سے شیخ مبارک پیدا ہوئے۔ فیضی اسی شیخ مبارک کا بیٹا تھا۔

شیخ مبارک ناگور سے گجرات اور گجرات سے آگرہ میں آئے۔ جمنا کے کنارے میر رفیع الدین حسین کے ہمسایہ میں قیام اختیار کیا اور یہیں ایک معزز خاندان میں شادی کی۔ خدا نے کثرت سے اولاد دی جن میں سب سے پہلا فیضی تھا جو ۹۵۴ھ میں پیدا ہوا۔ فیضی نے ابتدائی تعلیم باپ سے حاصل کی۔

شیخ مبارک اور اس کے بیٹے فیضی اور ابوالفضل شیعی اور آزاد خیال تھے۔ اس لئے شہنشاہ اکبر کے درباری مُلّا اور اُمراء ان کے خلاف تھے متعصب مولویوں کے ڈر سے تینوں اپنی جان بچانے کے لئے ایک رات چپکے سے گھر سے نکل پڑے۔ کوئی منزل مقصود نہ تھی۔ آخر فیضی کے ایک آشنا کے گھر میں پہنچے۔ لیکن وہ بھی ان کی آمد سے گھبرا گیا۔ چنانچہ وہاں سے آگے چل دیئے۔ اُدھر دشمنوں کے بھڑکانے سے شاہی حکم صادر ہوا کہ شیخ مبارک کا سارا خاندان دربار میں حاضر ہو۔ شاہی چوبدار شیخ کے گھر پر آئے تو شیخ کے چھوٹے بیٹے ابوالخیر کو پایا اور اسے پکڑ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ اکبر کو بچّے پر رحم آ گیا اور اُسے چھوڑ دیا۔ شیخ مبارک، فیضی اور ابوالفضل بھیس بدل کر بھٹکتے پھرے۔ کبھی کسی آشنا اور کبھی کسی واقف کے یہاں قیام کرتے۔

آخر جا بجا خاک چھاننے کے بعد آگرہ میں آئے۔ اور ایک ہمدرد دوست کے گھر میں پناہ لی۔ چند لوگ اور بھی شیخ کے طرفدار ہو گئے دربار شاہی میں تقریب ہو لی۔ بادشاہ تو پہلے ہی مہربان تھا وہ حقیقت سے آگاہ تھا اور ان بیگناہوں کے مصائب پر افسوس کھاتا تھا۔ اکبر نے احترام کیا۔ فیضی بادشاہ کی نوازش خاص سے بہرہ یاب ہوا۔ حاسدوں کے سینوں پر سانپ لوٹتے لگے لیکن لاچار تھے۔

اب اکبر کے دربار میں فیضی اور ابوالفضل کا طوطی بولنے لگا۔ اور بادشاہ پر ان کا اتنا اثر تھا کہ تمام ملاؤں کا تعصب دب گیا اور بادشاہ کے مزاج میں بھی آزاد خیالی پیدا ہو گئی۔ بادشاہ میں مذہبی تعصب

نام کو بھی نہ رہا۔

شہزادوں کی تعلیم و تربیت فیضی کے سپرد ہوئی۔ آگرہ، کالنجر اور کالپی کی صدارت بھی فیضی کو دی گئی۔ ۹۹۶ھ میں فیضی کو ملک الشعرا کا خطاب عطا ہوا۔ اکبر کے ہمراہ فیضی نے کشمیر کا سفر بھی کیا۔ اور ایک قصیدہ کشمیر پر لکھا۔ اس کے بعد فیضی کو مختلف عہدوں اور مہموں پر مامور کیا گیا جو اس نے خوبی اور قابلیت کے ساتھ انجام دیں۔ سفارت کے فرائض بھی ادا کئے۔

اکبر کے حکم پر فیضی نے نظامی کے خمسہ کے جواب میں نل دمن سے آغاز کیا۔

فیضی کا اصلی مذاق علم و فن کی خدمت تھی۔ کتابوں کا نہایت شائق تھا۔ ایک گراں بہا کتب خانہ جمع کر رکھا تھا جس میں چار ہزار کتابیں تھیں۔ ہر قسم کے علوم و فنون پر اس کے پاس کتابیں تھیں مثلاً طب، نجوم، موسیقی، حکمت و تصوف، ہیئت، ہندسہ، تفسیر و حدیث وغیرہ۔

فیضی نہایت فیاض اور سخی تھا۔ اہل کمال کے لئے اس کا گھر مہمان سرائے عام تھا۔ فقرا اور اہلِ دل کا نہایت گرویدہ تھا۔ اکثر بزرگوں کے مزار پر حاضر ہوتا تھا۔ اپنے مخالفوں اور حاسدوں سے بھی اس کا سلوک نیک اور ہمدردانہ تھا۔ اُسے اپنے بھائیوں سے بے حد محبت تھی جس کا اظہار وہ اپنے خطوط میں کرتا تھا۔ اس کے قصائد اور مراثی سے اس کے اخلاق و خصائل کا اچھی طرح علم ہوتا ہے۔

تصنیفات۔ فیضی نے ایک سو ایک کتابیں تصنیف کیں۔ خمسۂ نظامی کے جواب میں یہ مثنویاں اس کی تصنیف کردہ ہیں۔

(۱) نل دمن (۲) مرکز ادوار (۳) سلیمان و بلقیس (۴) ہفت کشور (۵) اکبر نامہ۔

موارد الکلم: ۹۸۵ھ میں لکھی گئی۔ تفسیر غیر منقوط ہے۔

سواطع الالہام: یعنی تفسیر غیر منقوط ۱۰۰۲ھ میں تمام ہوئی اس پر جو تقریظیں اور تاریخیں لکھی گئیں خوب ہیں۔

انشائے فیضی۔ اس میں فیضی کے مکاتیب و خطوط شامل ہیں جن میں انشا پردازی کا حق ادا کیا ہے۔ طرز اور زبان سادہ ہے۔ بعض اوقات ہندی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔

دیوانِ غزلیات۔ کچھ نو ہزار شعر ہیں۔ دیوان کا نام طباشیر الصبح رکھا۔

قصائد۔ مختصر سا مجموعہ ہے۔ حمد، نعت، مدح، فخر، تصوف، اخلاق وغیرہ مضامین پر الگ الگ قصیدے لکھے ہیں۔ ان میں بیٹے کا مرثیہ بھی شامل ہے جو نہایت پُر درد ہے۔ خاتمہ پر قطعات بھی ہیں۔

مہابھارت۔ یہ اکبر کے حکم پر لکھی گئی۔ اس میں فیضی نے جزواً کام کیا ہے۔

اتھروَن وید۔ اس کا ترجمہ بھی فیضی کی طرف منسوب ہے۔

لیلاوتی۔ یہ کتاب حساب میں ہے۔ فیضی نے اس کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

فیضی کی شاعری۔ فیضی فطرتاً شاعر تھا۔ اور بچپن سے ہی شعر

کہتا تھا۔ لیکن اس کی طبیعت مشکل پسند تھی۔ اور عربیت کا زور تھا طبیعت صنائع کی طرف بھی مائل تھی۔ ابتدا میں جو قصیدے لکھے ان میں نامانوس عربی الفاظ کثرت سے ہیں۔ لیکن جوں جوں وقت گذرا اور اہلِ زبان سے اختلاط بڑھا زبان سادہ اور صاف ہوتی گئی۔

فیضی نے قصیدہ، غزل، مثنوی، سب کچھ کہا ہے لیکن قصیدے بے مزہ ہیں۔ البتہ مثنوی اور غزل لاجواب ہے۔

فیضی کے کلام کی خصوصیات میں سب سے بڑھ کر جوشِ بیان ہے۔ فیضی کے یہاں فخریہ عشقیہ فلسفیانہ ہر قسم کے مضامین ہیں۔ اور جوش بیان ان سب کی امتیازی خصوصیت ہے۔

دوسری خصوصیت استعارات کی شوخی اور تشبیہات کی ندرت ہے۔ فیضی کے اکثر فلسفیانہ مضامین کے ساتھ اِدّعا اور غرور کی جھلک ہوتی ہے۔

ہاتف اصفہانی۔ سید محمد ہاتف اصفہانی افشاری اور زندی دور کا بہت بلند درجہ شاعر تھا۔ اس کے بزرگ آذربائیجان کے رہنے والے تھے۔ ہاتف کی بیشتر زندگی اصفہان میں بسر ہوئی۔ عربی زبان میں بھی ہاتف کو بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ اور کہتے ہیں کہ اس نے عربی زبان میں شعر بھی کہے تھے۔

غزل گوئی میں ہاتف سعدی اور حافظ کی روش کا پیرو ہے۔ اس فن میں اس نے کمال حاصل کیا۔ شاعر نے قطعے، قصیدے اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ لیکن اس کی شہرت کا مدار اس کے غیر فانی

ترجیع بند پر ہے۔ اس کے کلام کا خاص جوہر بندش کی چستی اور دقتِ معنی ہے۔ الفاظ کی ترکیب بڑی حسین ہوتی ہے۔

ترجیع بند میں معرفت و تصوف کی حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ وحدتِ ذات کا موضوع خوب بیان کیا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ یہ عالم جس ذات کا مظہر ہے وہ ایک ہے۔ اس ذاتِ واحد نے کثرت سے صورتیں اختیار کر رکھی ہیں۔ کثرت میں وحدت کا جلوہ صرف عارف ہی دیکھ سکتا ہے۔ ظاہری آنکھ اس سے ناآشنا ہے چشمِ باطن یا بصیرت سے ہی حقیقت کا دیدار ہوتا ہے۔

یار بے پردہ از در و دیوار | در تجلّی است یا اولی الابصار
شمع جوئی و آفتاب بلند | روز بس روشن و تو در شبِ تار
گر ز ظلمات خود رہے بینی | ہمہ عالم مشارق الانوار
ز آبِ بیرنگ صد ہزاران رنگ | لالہ و گل نگر دراں گلزار
شود آساں ز عشق کارے چند | کہ بود نزدِ عقل بس دشوار
صد رہت لن ترانی ار گوید | باز مے دار دیدہ بر دیدار

مجمر اصفہانی: سید حسین طباطبائی نام اور مجمر تخلص تھا۔ آپ اصفہان کے نزدیک ایک موضع زوارہ میں پیدا ہوئے تاریخ ولادت کا کچھ پتہ نہیں۔ البتہ تذکرہ نگاروں کے قول کی رُو سے آپ بارھویں صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر میں ہی علوم متداولہ حاصل کر لئے۔ بڑے ذہین اور ذکی تھے۔ جوان ہوتے ہی اپنی استعداد اور ملکۂ شاعری کا اظہار کیا اور زمانے کے عظیم المرتبہ

شاعر نشاط کی صدارت میں قائم کی گئی انجمن شعرا میں شامل ہو گئے۔
نشاط کے ساتھ بڑے گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔ اپنی قابلیت اور مقبولیت کے بل بوتے پر جلد بادشاہِ وقت فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں تقرّب حاصل کیا۔ او مجتہد الشعرا کا لقب عطا ہوا۔ شاہی دربار سے خوب انعام واکرام پائے۔

مجمر کا خاص میدان قصیدہ گوئی ہے۔ آپ نے فتح علی شاہ اور اس کے بیٹے کی مدح میں پُرزور قصیدے لکھے۔ اس کے علاوہ امرا کی مدح سرائی بھی کی۔ آپ نے اکثر قصیدوں میں قدیم اساتذہ، انوری اور خاقانی وغیرہ کی طرز کی تقلید کی ہے۔ مدح کے علاوہ مجمر کے قصائد میں عرفان و حقیقت کے مضامین بھی بکثرت موجود ہیں، عید کی تہنیت میں جو قصیدہ ہے اس میں رندی اور معرفت کے خیالات بیان کیے ہیں۔

مجمر کے قصائد میں جوشِ بیان کے علاوہ جذبات نگاری اور منظر کشی کے مرقّع بھی بکثرت ملتے ہیں۔ مضامین کی گونا گونی قابل قدر ہے۔ قدما کی روش جو عرصے سے متروک تھی اس کو ازسرِنو زندہ کرنے میں مجمر کا بھی قابل داد حصّہ ہے مضمون کی متانت اور پختگی اور موزونیت کے لحاظ سے مجمر کا کلام خراسانی طرز کا نمونہ ہے۔

مجمر کے قطعے اور غزلیات بھی ہیں۔ اور ہزل اور ہجویہ اشعار بھی۔ آپ کی غزلوں میں وہ رنگ اور خوبیاں ہیں جو بڑے غزل گو شعرا کی ہیں۔ آپ نے خاقانی کی مثنوی تحفتہ العراقین کی تقلید میں ایک مثنوی لکھی ہے۔ آپ نے ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی۔

نشاط اصفہانی : مرزا عبدالوہاب نشاط اصفہانی فتح علی شاہ قاچار کا وزیر خارجہ تھا۔ نہایت خوش نویس اور عربی، فارسی اور ترکی زبان کا ماہر انشا پرداز تھا۔ نشاط کی شاعری درباری ملک الشعرا صبا کے کلام کے مقابلے میں بہت بلند، خوش آہنگ اور لطیف ہے۔ گویا اگر صبا کو فارسی شاعری کا ذوق کہیں تو نشاط غالب تھا۔ فتح علی شاہ نے اسے معتمد الدولہ کے خطاب سے نوازا تھا۔

اس زمانے میں برطانیہ فرانس اور روس ایک شدید سیاسی کشمکش میں گرفتار تھے کہ ایران میں کیونکر اقتدار پیدا کیا جائے۔ اس سلسلے میں نشاط کی خط و کتابت انشا پردازی کا ایک بہترین مرقع پیش کرتی ہے۔

نشاط کا خاص انداز تغزّل تھا۔ اس کے بہترین شاہکار کا نام گنجینہ ہے اس نے فتح علی شاہ اور صبا کی کلیات کا مقفیٰ عبارتیں تعارف نامہ بھی لکھا ہے۔

نشاط درباری امرا کے زمرے میں شمار ہوتا تھا۔ انہیں حکمت، ریاضی اور ادبی علوم میں نہایت اچھی دسترس حاصل تھی۔ نشاط کی شاعرانہ اور ادبی سرگرمیوں اور کوششوں سے اصفہان علم و ادب کا مرکز بن گیا تھا آپ نے اور آپ کے مقلدوں نے مل کر قدما کی روش کو شعر و شاعری میں از سر نو زندہ کیا۔

نشاط نے غزل کے علاوہ قصیدے، مثنوی اور رباعیات بھی کہی ہیں۔ قصائد میں انہوں نے متقدمین کا رنگ اختیار کیا۔ آپ نے امیر معزّی، انوری ایسے اساتذہ کے قصائد کے جواب میں قصیدے

لکھے۔ غزل گوئی میں بھی قدیم استادوں کے کلام کو پیش نظر رکھا اور حافظ، سعدی جیسے استادوں کی تقلید کی۔

نثر میں نشاط کے مراسلات، منشآت، مقالات، تمہیدات و تقاریظ اور مناجات و شکایات وغیرہ ہیں۔ ان میں آپ نے ادیبانہ انداز اپنایا۔ اور فن انشا پردازی کی داد دی۔ آپ کی نثر اس زمانے کی مراسلہ نگاری اور درباری خط و کتابت کا نمونہ ہے۔ آپ نے ۱۲۴۴ھ میں وفات پائی۔

فتح علی خاں صبا: صبا متاخرین میں اوّل درجہ کے قصیدہ گو شاعر ہیں۔ آپ نے قصیدوں کے علاوہ غزل، رباعی اور مثنوی بھی کہی ہے۔ آپ کے ترجیع بند بھی خوب ہیں۔ فتح علی شاہ قاچار (شاہ ایران) کے دربار میں تقرب حاصل کرنے کے بعد ملک الشعرا بن گئے۔

بقول رضا قلی خاں صبا سات سو سال بھر میں بہترین شاعر ہوا ہے۔ لیکن اس میں مبالغہ ہے۔ رضا قلی خاں یہ بھی لکھتا ہے کہ بعض نقاد صبا کے شہنشاہ نامہ کو فردوسی کے شاہنامہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ خداوند نامہ، عبرت نامہ، گلشنِ صبا اس کی یادگار میں سے ہیں۔ اس کے دیوان میں دس اور پندرہ ہزار کے درمیان اشعار ہیں۔ صبا کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا مرزا حسین خاں عندلیب فتح علی شاہ کے دربار کا ملک الشعرا بنا۔ اس کا انداز محض قصیدہ گوئی تک محدود رہا۔ صبا کے قصیدے فتح علی شاہ، اس کے بیٹوں اور امرائے دربار کی مدح میں ہیں، صبا نے ۲۳-۱۸۲۲ء میں وفات پائی۔

صبا کی مشہور ترین مثنوی شاہنشاہ نامہ فردوسی کے شاہنامہ

کی پیروی میں اور اسی وزن میں لکھی گئی۔ اور اُسے صبا نے اپنے ممدوح فتح علی شاہ کے نام پر معنون کیا۔

صبا بھی ان شاعروں کے زمرے میں شامل ہے جنھوں نے قدما کی روش کو زندہ کیا۔ اس کے قصیدوں کے ملاحظہ سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے فرخی اور منوچہری کے سے اساتذہ فن کی پیروی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور کسی حد تک ان کے انداز میں کہنے میں کامیاب ہوا ہے۔

صبا بہار کے نظاروں کا خاص طور پر مشتاق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بہت سے پُر لطف اور دلکش نوروزیئے بھی لکھے ہیں۔

وصال شیرازی: مرزا شفیع وصال شیراز کا رہنے والا تھا۔ قاچاری دور کا مشہور شاعر ہُوا ہے۔ چھوٹی عمر میں ہی خوش نویسی کا فن سیکھ لیا تھا اور اس میں اُسے کمال حاصل ہو چکا تھا۔ علم موسیقی میں بھی قابلِ قدر دستگاہ رکھتا تھا۔ شاعری میں فطری ملکہ اس کی طبیعت میں ودلیعت تھا۔ اس نے قصیدے بھی کہے اور غزلیات و مثنوی بھی۔ شاعری میں اس نے صبا کی طرح قدما کی روش اختیار کی۔ غزل میں سعدی اور حافظ کی روش پر چلا۔

اس کی مشہور مثنوی "بزم وصال" ہے جو استاد فردوسی کی طرز میں ہے۔ وصال نے وحشی کی مثنوی "فرہاد و شیریں" کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور اس کام کو بوجہِ احسن انجام دیا۔ وصال نے "اطواق الذہب" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ وصال نے ۱۸۴۶ء میں وفات پائی۔

غزل گوئی وصال کا خاص میدان تھا۔ اس میں اس نے جدتِ خیال اور دقتِ مضمون کا حق ادا کیا۔ ترکیب کی چستی اور محاورہ کی برجستگی قابلِ داد ہے زبان تعقید سے پاک ہے۔ سعدی اور حافظ کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔

وصال کا خاندان علم و ادب میں نامور ہے۔ اس کے بیٹے بھی بلند درجہ کے ادبا اور شعرا تھے۔ وقار کے ترجیع بند اور مسمط مشہور ہیں میرزا محمود ماہر طبیب ہونے کے علاوہ شعر و شاعری میں بھی ذوقِ سلیم رکھتا تھا۔ کئی ایک زوردار قصیدے بھی لکھے ہیں۔ اپنے باپ کی طرح خوش نویس بھی تھا اور نستعلیق میں کمال رکھتا تھا۔ وقار خط نسخ میں استادانہ دستگاہ رکھتا تھا۔

نمونۂ کلام:

بغیرِ دیرِ مغاں دل ندید جائے را	کہ فرق مے ننہد از شہی گدائی را
سلوک وادیِ خونخوارِ عشق یکسانست	چہ راہ گمشدہ را چہ رہنمائی را

بگشتہ در کعبہ و بتخانہ مجو از من مپرس	بدور آں سوختہ چند و دریں خامے چند

قائم مقام اصفہانی۔

مرزا ابو القاسم قائم مقام ۱۱۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کو حکمت اور علم و ادب میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں قدرت رکھتے تھے۔ آپ کی عبارت فصاحت و بلاغت کا مرقع ہے۔ آپ کا کلام اور نثر دونوں مبالغہ، تصنع و تکلف اور پیچیدہ عبارت آرائی

سے پاک ہیں۔ آپ سادگی اور سلاست کے پرستار ہیں۔ آپ کی تحریریں انشاپردازی کا عمدہ نمونہ ہیں۔

قائم مقام نے قصیدے بھی کہے ہیں اور رباعیات اور قطعات بھی۔ آپ کی نثر کو شاعری پر فوقیت حاصل ہے۔ حقیقت نگاری اور شستہ اسلوب بیان آپ کے خطوط کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

شاعر کے کلام سے حبِ وطن کا جذبہ ٹپکتا ہے۔ ایک قطعہ جو آپ نے روس کے حملے اور ایران کی شکست پر لکھا نہایت پُرتاثیر اور دردانگیز ہے۔ اس قطعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

روزگاراست آنکہ گہ عزت دہد گہہ خوار دارد
چرخ بازیگر ازیں بازیچہ ہا بسیار دارد

لشکرے را گہہ بکار گرگِ مردم خوار خواہد
کشورے را گہہ بدست مردم مدار دارد

گہہ تبر یز از لیطر برگ اسپہی خونخوار دارد
گہہ بہ تفلیس از خراسان لشکرے جرار دارد

رنج و شکوہ کے انداز میں ایک پُرزور قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

اے بختِ بد اے مصاحبِ جانم
اے وصلِ تو گشتہ اصلِ حرمانم

اے بے تو نگشتہ شام یک روزم
اے با تو نرفتہ شاد یک آنم

اے خرمنِ عمر از تو بر آہوم
وے خانۂ صبر از تو ویرانم

ہم کوکبِ سعد از تو منحوسم
ہم مایۂ نفع از تو خسرانم

قائم مقام محمد شاہ کے حکم سے ۱۸۳۵ء (مطابق ۱۲۵۱ھ) میں طہران کے مقام پر قتل ہوا۔

مولانا شیخ علی حزیں۔ آبروئے متقدمین و فخر متاخرین مولانا شیخ

محمد علی بن ابی طالب ۱۱۰۳ھ میں بمقام اصفہان پیدا ہوئے آپ کی زندگی کا ابتدائی حصہ سیر و سیاحت اور تصنیف و تالیف میں صرف ہوا۔ آخر ایک سیاسی سازش سے مجبور ہو کر ۱۷۳۳ء میں ہندوستان کی طرف بھاگنا پڑا۔ حزیں بہت پُر گو تھا۔ اس کی تصنیفات میں سے تذکرۃ المعاصرین اور تذکرۃ الاحوال مشہور ہیں۔ پہلی کتاب میں ہمعصر فضلا اور شعرا کا ذکر ہے۔ دوسری میں اپنے سوانح حیات بیان کئے ہیں۔ ایرانی حکمرانوں نے ہندوستان پر جو حملے کئے تھے ان کے حالات بھی حزیں نے رسالوں کی صورت میں قلم بند کئے ہیں۔ حزیں نے سات مثنویاں اور چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔

شیخ علی حزیں نے ۲۲-۱۷۲۳ء میں ایک ادبی مجموعہ یا رسالہ تالیف کرنا شروع کیا۔ اس کا نام تھا "مدۃ العمر" جب افغانوں نے اصفہان کو لوٹا تو مدۃ العمر ضائع ہو گیا۔ اسی اثنا میں وہ کئی ایک فلسفیانہ تفاسیر کے علاوہ فرس نامہ اور دو دیوان مرتب کر چکا تھا۔ اس نے اپنی مشہور تصنیف تذکرۃ الاحوال میں ہندوستان کے متعلق واقعات درج کرنا پسند نہیں کیا۔ ۱۷۵۲ء میں شیخ علی حزیں نے اپنے ہمعصر شعرا کے حالات تذکرۃ المعاصرین میں بیان کئے۔ واقعہ گوئی اور حقیقت نگاری کے لحاظ سے حزیں کی تصنیفات اس کے پیشرو اہل قلم کی ادبی کاوشوں سے بہت حد تک مختلف ہیں۔ اور اس اختلاف کا سبب وہی مغربی اثر ہے۔

تذکرۃ الاحوال خوبیٔ عبارت اور حسنِ مطالب کی وجہ سے بہت مقبول ہے ہزار شعر کا ایک ساقی نامہ بھی خوشگوار انداز میں لکھا ہے۔ حزیں کا کلام

با محاورہ، متین، صاف اور بے اشکال ہے۔ اس کی بنیاد نصیحت، حکمت اور تصوف پر ہے۔ حمد ہیں اور اکثر بزرگوں کی تعریف میں قصائد بھی لکھے ہیں۔ حافظ کی غزلوں کے جواب میں حزیں کی غزلیں خوب ہیں۔ اپنے بعض قابلِ اعتراض ارشادات کی وجہ سے حزیں اپنے ہمعصروں کی نکتہ چینی کا نشانہ رہا ہے۔

حزیں ۱۷۶۶ء میں بنارس کے مقام پر فوت ہوا۔ بنارس کے ساتھ اُسے عجیب دل بستگی تھی ؎

از بنارس نروم معبدِ عام است اینجا　　ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

نمونۂ کلام:

گر رخ بنمائی اے خوش لقا! چہ باشد　　مارا ز ما ستانی اے دلربا! چہ باشد

از یارِ ناموافق دوری ضرورت آمد　　گر ساعتے نشینی از خود جدا! چہ باشد

زاں پیشتر کہ گردشِ دوراں کند خراب　　ساقی! مرا بیک دو سہ ساغر خراب کن

لطف علی بیگ آذر

آپ اصفہان میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ تک افشاریہ خاندان کے حکمرانوں (۱۷۳۶ء تا ۱۷۹۶ء) کی خدمت میں رہے۔ آخر عمر میں آپ درویش ہو کر فقر اور مطالعہ میں محو ہو گئے۔ ۱۷۶۰ء سے ۱۷۷۱ء تک کے دوران مشہور کتاب "آتش کدہ" لکھی۔ اس میں ایک سو آٹھ سے زیادہ شعرا کے سوانح حیات ہیں۔ آپ کا دیوان عام قسم کے تقریباً تمام اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ رومانتیک انداز میں "یوسف و زلیخا"

کے نام سے ایک مثنوی بھی نظم کی۔ اس کا انداز بیان بہت بلند اور سجا تلا ہے۔ آذر نے ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی۔

آپ کی شہرت کا مدار آپ کی مشہور تصنیف "آتش کدہ" پر ہے۔ آتش کدہ میں ان شعرا کے حالات اور کلام پر نقد و تبصرہ ہے جو مصنف سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ تاریخ نویسی، سوانح نگاری، تنقید اور فن کاری کے نقطۂ نظر سے آتش کدہ کو تذکرۃ الاحوال اور تذکرۃ المعاصرین ہر دو پر فوقیت حاصل ہے۔ شاعروں کی ترتیب ان کے مولد و منشا کے مطابق پیش نظر رکھی گئی ہے۔ کتاب کے خاتمے پر آذر نے اپنی سوانح حیات درج کی ہے۔ اگرچہ آتش کدہ میں دقیق ترین مغربی تنقید و تحقیق غائب ہے تاہم سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کے اعتبار سے ایک نئے فن کا آغاز نظر آنے لگتا ہے۔

آذر افشاریہ اور زندیہ خاندانوں کے عہد کے علما اور فضلا میں سے ہے۔ اس نے اپنے دور میں متاخرین کی روش سے ہٹ کر قدما کی طرز کی جانب رجوع کیا اور سبک ہندی سے اعراض کیا۔

قاآنی:

قاآنی کا نام مرزا حبیب اللہ تھا۔ وہ ۱۸۰۷ء میں بمقام شیراز پیدا ہوا۔ اس کا باپ بھی شاعر تھا اور گلشن تخلص کرتا تھا۔ قاآنی کی تاریخ ولادت کا پتہ اس کے اپنے ایک بیان سے چلتا ہے جو اس نے اپنی تصنیف "کتاب پریشان" کے آخر میں دیا ہے۔ شروع شروع میں وہ حبیب تخلص کرتا تھا۔ اس نے شعر و شاعری کا شغل علوم درسیہ

کی تحصیل کے بعد اختیار کیا تھا۔ پہلے پہل وہ شجاع السلطنۃ کی مداحی کرتا تھا۔ پھر جب زیادہ شہرت حاصل کر لی۔ تو قاچار خاندان کے شاہی دربار میں رسائی نصیب ہوئی۔ محمد شاہ اور ناصر الدین قاچار (۱۸۴۸ء تا ۱۸۹۶ء) نے اس کی نہایت قدردانی کی۔

قاآنی کی زندگی کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہیں۔ غالباً اسے غیر معمولی حادثات اور واقعات کا بہت کم سامنا ہوا۔ اس کی موت ۱۸۵۳-۵۴ء میں طہران کے مقام پر ہوئی۔

قاآنی کو تیرھویں صدی ہجری کا سب سے بڑا شاعر خیال کیا جاتا ہے اور یہ بات ہے بھی سچ۔ قاآنی سے پہلے فارسی شاعری میں جس نئے دور کا آغاز ہوا اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مشتاق اصفہانی، لطف علی آذر اور سید احمد ہاتف وغیرہ نکتہ دانوں نے قدما کا تتبع شروع کیا۔ قاآنی نے اس دور کو بہت ترقی دی۔ یہاں تک کہ اس کی قادر الکلامی قدما کے دور کو ایک حد تک واپس لے آئی۔

قاآنی کے کلام میں خوشنوائی اور روانی بدرجۂ اتم ہے۔ اُسے فارسی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں ایک بہت بڑا عیب تھا تو یہ خوبیاں مدھم پڑ جاتی ہیں۔ وہ عیب تھا بے اصولی۔ خوشامد سرائی ابن الوقتی اور پست گوئی۔ اس نے اپنے بہت سے قصیدوں میں محمد شاہ قاچار کے وزیر اعظم حاجی مرزا آقا سی کی خوبیوں اور عدل پروری کی تعریف کی ہے۔ لیکن جب اسی مرزا آقا سی کی بجائے مرزا تقی خاں امیر کبیر اس عہدے پر فائز ہوتا ہے تو قاآنی ایک قصیدہ میں لکھتا ہے ؎

بجائے ظالمے شقی نشستہ عادلے تقی　　کہ مومنانِ متقی کنند افتخار ہا

قاآنی کی کلیات میں قصیدے، مسمط اور ترکیب بند کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس نے گلستانِ سعدی کے انداز میں کتاب پریشان لکھی اس میں ایک سو تیرہ حکایتیں اور تیس سے زیادہ نصیحتیں ہیں جو بادشاہوں اور شہزادوں کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہیں۔ کتاب پریشان میں قاآنی کے سوانحِ حیات کے متعلق بھی کچھ مواد موجود ہے۔ قاآنی کا کلام کئی بار چھپ چکا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے مخصوص انداز میں قاآنی کی شاعری پر جو بحث فرمائی ہے اس کا نچوڑ یہ ہے:۔

قاآنی کے تمام قصیدے قدما یعنی فرخی، منوچہری، سنائی اور خاقانی کے جواب میں ہیں۔ الفاظ کی بہتات، مترادف الفاظ کا اجتماع، صنعت ترصیع اور لف و نشر جو قدما کے خصائص ہیں۔ ان باتوں میں وہ قدما کا ہمسر ہے۔ ان باتوں کے ساتھ جو قدرتِ کلام، صفائی اور روانی اس کے کلام میں ہے قدما میں بھی نہیں۔ اس کی خصوصیات یہ ہیں:۔

۱۔ تشبیہات اکثر نیچرل ہوتی ہے۔

۲۔ واقعہ نگاری میں کوئی شاعر آج تک اس کے رتبہ کا نہیں ہوا۔

۳۔ قدما کے جو الفاظ سینکڑوں برس سے متروک ہو گئے تھے اور جن میں اکثر غلط بھی تھے قاآنی ان کو بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ اسے شاعری کا دائرہ وسیع کرنا تھا یا یہ کہ قدما کی مکمل تقلید مقصود تھی۔

۴۔ شعر کے متروک زحافات کو بھی وہ استعمال میں لایا جس کی

وجہ سے اس کا طرز تمام ایران پر چھا گیا لیکن یہ وہ روش ہے کہ قاآنی کے رتبہ کی شاعری ہو تو لطف دیتی ہے ورنہ بالکل بدمزہ اور خالی الفاظ کا ڈھیر رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قاآنی کے بعد پھر کوئی نامور ایران میں پیدا نہیں ہوا۔ سر آغا فرماتے ہیں :-

انیسویں صدی میں ایران میں جو شعرا پیدا ہوئے ان میں قاآنی کا شمار عظیم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ جس جوش، حسن بیان اور تنوع کے ساتھ قاآنی نے فطرت کے مناظر کی تصویر کھینچی ہے اور فطرت کی روح کی ترجمانی کی ہے شاید ہی کسی فارسی شاعر نے کی ہو۔

قاآنی کا کلام موسیقی اور مسرت کے نغموں سے مملو ہے۔ اس کے شعر شعر میں ترنم اور نشاط کی روح دوڑتی ہے۔ قاآنی کا عقیدہ ہے کہ زندگی ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ اس کی عظمت اور شان میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ غنیمت ہے۔ اور اسے راحت و سرور میں صرف کرنا چاہیے ؎

"دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد"

نمونۂ کلام :-

بازبر آمد بکوہ رایتِ ابرِ بہار	سیل فرو ریخت سنگ از زبر کوہسار
باز بجوش آمدہ مرغان از ہر کنار	فاختہ و بوالملیح صلصل و سیک ہزار

طوطی و طاؤس و بط سیرہ و سرخاب سار

بنفشہ رستہ از زمیں بطرف جوئبارہا	و یا گسستہ حور عین ز زلفِ خویش تارہا
ز سنگ اگر ندیدہ کہ چسپاں جہد شرارہا	بہ برگہائے لالہ بیں میانِ لالہ زارہا

کہ چوں شرارہ مے جہد ز سنگ کوہسار ہا

کارِ طرب در روزِ مے و فصلِ بہار است
جان خرم و دل فارغ و شاہد بکنار است
بادِ سحر از آتشِ گل مجمرہ سوز است
خاکِ چمن از آبِ روان آئینہ وار است
نامی نگری کو کبہ سوری و سرو است
نامے شنوی زمزمہ صلصل و سار است

محمود خاں ملک الشعراء

محمود خاں کا خاندان بلند پایہ شاعروں کا خاندان تھا۔ آپ کا دادا فتح علی خاں صبا بادشاہ فتح علی شاہ کے دربار کا ملک الشعرا تھا اور آپ کا والد محمد حسین خاں عندلیب بھی اسی بادشاہ کا درباری شاعر اور ملک الشعرا تھا گویا ملک الشعرائی کا لقب آپ کے خاندان کے لئے مخصوص تھا۔ محمود خاں کاشان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان زندیوں کے عہد میں عراق میں آگیا تھا۔ محمد حسین خاں عندلیب ناصر الدین شاہ کے زمانے میں بھی ملک الشعرائی کے لقب سے سرفراز تھا۔

محمود خاں قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ علوم ادبی، حدیث، تفسیر، حکمت اور نقاشی میں بھی خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ قصیدہ گوئی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ اور اس فن میں آپ نے قدما کی روش کی تقلید کی۔ عنصری، منوچہری، فرخی، صابر، معزی وغیرہ کی طرز سے بہت قریب رہے۔ ناصر الدین شاہ کے دربار میں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اور اپنے والد عندلیب کی طرح آپ کو بھی ملک الشعرائی کا عہدہ حاصل تھا۔ آپ نے ۱۳۱۱ھ میں ناصر الدین شاہ قاچار کے قتل

سے دو سال پہلے وفات پائی۔

محمود خاں کو فطرت سے خاص لگاؤ تھا۔ اور ان کی یہ دلبستگی ان کے کلام سے جا بجا ٹپکتی ہے ؎

بادِ صبا بیامد و بر بوستاں گذشت — بگرفت زلفِ سنبل ازاں باد تابہا
دوشیزہ بادہائے نغز از سوئے بوستاں — بر چہرۂ گل زدند سحرگہ گلابہا
چوں صد ہزار جام بلوریں واژگوں — ہم آبداں ز ریزشِ باراں حبابہا
خوباں سپیدہ دم بسوئے بوستاں شدند — از بہرِ دیدنِ رخِ گل با شتابہا
وقتے خوش است عاشقِ دلدادہ را کنوں — درخانہ داشتن نتواں با طنابہا
جز از خرمی نبود در حسابِ عمر — ما برگرفتہ ایم ز گیتی حسابہا

محمود خاں نے اپنے بیشتر قصائد میں ناصر الدین شاہ اور ارکینِ دربار کی مدح سرائی کی ہے۔ مدح کے علاوہ کئی تاریخی واقعات کا بھی ذکر ملتا ہے۔

مثلاً محمد شاہ کی وفات، ناصر الدین شاہ کی تخت نشینی، جشن اور بزم کے رسوم وغیرہ۔ ذیل کے شعروں سے محمد شاہ کی وفات پر ملک کی حالت کا نقشہ ظاہر ہے ؎

چوں تختِ ملک تہی ماند از محمد شاہ — کہ نوشہ باد روانش بعالمِ دیگر
بشہر تبریز اندر خبر رسید بشاہ — کہ حال دگر شد ز کینۂ اختر
ہمے گشت درون دو چشم خسرو آب — ہم ازاں فراق پدر ہم ز سوزشِ کشور
ز ہر سپارِ سفر چوں ز سوگ شہ پرداخت — بگشت در سرِ خسرو ہزار گونہ فکر
بخواند ملتش بے مصلحت خدیو بزرگ — ہر آنکہ بود پدرگہ ز کہتر و مہتر

رضا قلی خاں ہدایت

رضا قلی خاں ۱۲۱۸ھ میں بمقام طبرستان پیدا ہوا۔ محمد شاہ اور ناصر الدین شاہ کے دوبار میں رہ کر بہت سے علوم و فنون حاصل کرے۔ آپ بے شک شاعروں کے زمرے میں شامل ہیں لیکن شاعری آپ کا اصلی میدان نہیں ہے۔ آپ کی شہرت کا مدار آپ کی قابل قدر تصنیف مجمع الفصحا ہے یعنی آپ تذکرہ نگار کی حیثیت سے بلند درجہ رکھتے ہیں مجمع الفصحا دو جلدوں میں تقسیم ہے۔ اس میں بادشاہوں اور شاہزادوں کے درباری شاعروں کے ساتھ ساتھ دوسرے مشہور اور معروف ایرانی شاعروں کے حالات دلچسپ پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب کی خوبی اور شہرت کا سبب یہ ہے کہ رضا قلی خاں نے جن شعرا کا ذکر کیا ہے نمونہ کے طور پر ان کے بہترین اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ رضا قلی خاں نے یہ کتاب لکھ کر فارسی علم و ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اور بعض ایسے اشعار اور ایسے شاہکار ہم تک پہنچائے ہیں جن کا اس کے بغیر ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔

رضا قلی خاں نے ہدایت تخلص کرتے ہوئے تیس ہزار سے زیادہ اشعار یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں۔ آپ نے اپنی غزلوں اور قصیدوں کے کچھ نمونے خود مجمع الفصحا میں پیش کئے ہیں آپ کا کلام اوسط درجے کے شاعروں کا سا ہے۔ مجمع الفصحا کے علاوہ آپ کی تصنیفات ہیں:۔
(۱) تکملہ روضتہ الصفا (۲) لغت انجمن آرا (۳) ریاض العارفین۔
اس تذکرے میں ایران کے صوفی شاعروں کا ذکر ہے۔ شاعروں کے

کلام سے انتخابات دیئے گئے ہیں۔ مصنف نے اپنی مثنویوں کا انتخاب بھی اس میں شامل کیا ہے۔

رشید یاسمی

آپ کا نام غلام رضا خاں اور تخلص رشید ہے۔ آپ کی ولادت ۱۳۱۴ھ میں ہوئی۔ اپنے وطن کرمان شاہ (ایران) میں ابتدائی تعلیم پائی تحصیل علم و ادب کے لیئے آپ تہران تشریف لے گئے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ وزارت تعلیم اور وزارت مالیہ میں خدمات انجام دیں۔ دانشکدۂ ادبیات میں تاریخ اسلام کے لکچرار کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ آپ نے اخبارات اور رسائل، وجرائد میں اپنے قابل قدر مضامین بھی اشاعت کے لیئے بھیجے۔ آپ کو ہندوستان کا سفر کرنے کا بھی موقع نصیب ہوا۔

آپ کا طرز ادا قدیم ہے لیکن مضامین جدید رنگ کے ہیں۔ آپ نے ہر قسم کی شاعری کی ہے۔ قصیدے اور غزلیں لکھی ہیں۔ مقطعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ آپ آخر عمر میں سکتہ کے مرض کا شکار ہو گئے اور پچپن (۵۵) سال کی عمر میں انتقال کیا۔

رشید صاحب کی تصنیفات حسب ذیل ہیں :-

(۱) ایران و ہند (نظم) (۲) خاطرات ہند (نظم) (۳) شرح حال سلمان ساوجی (نثر) (۴) منتخبات فردوسی (نظم) (۵) اندرزنامہ اسدی (نظم) (۶) تاریخ مختصر ایران (نثر) (۷) ترجمہ ادبیات ایران (نثر)

نمونہ کلام ملاحظہ ہو :-

وحشت آبد زیں خرابم خلوت آبادکو؟ نالہ ہا در سینہ دارم طاقت فریاد کو؟
گل ندارد غنچہ برلب، بلبل خوش خواں کجاست؟
دل نگیرد راہِ بستاں، جلوۂ شمشاد کو؟
خرمی از کشت زاراں، شادی از دلہا برفت؟
فیضِ باراں، پرتوِ خورشید ولطفِ باد کو؟
بادہ صافی شد دریغا، بادہ پیمائی نماند؟
نیست بے شیریں جہاں، شوریدہ دل فرہاد کو؟

صفوی اور قاچاری دور کا نثری ادب

لغات :-

صفوی دور خاص طور پر فارسی فرہنگوں اور لغات کی تالیف وتدوین کے لئے مشہور ہے۔

۱۔ برہانِ قاطع۔ اس کتاب کا مصنف محمد حسین بن خلف تبریزی ہے۔ اس کا تخلص برہان تھا۔ اس لغت کی تالیف میں مصنف نے فرہنگ سروری اور فرہنگ جہانگیری سے استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۰۶۲ھ میں مکمل ہوئی۔ اور ہندوستان میں گولکنڈہ کے حکمران سلطان عبداللہ قطب شاہ کے نام پر معنون کی گئی۔

یہ ایک مفصل اور جامع لغت ہے۔ اس میں عربی، یونانی اور دوسری زبانوں کے الفاظ بھی دیئے گئے ہیں۔ ہندوستان کے نامور اردو شاعر غالب نے جو فارسی کے بھی عالم تھے اس کتاب پر نکتہ چینی

کرتے ہوئے ایک کتاب "قاطعِ برہان" کے نام سے لکھی۔

۲۔ **غیاث اللغات** ۔ یہ کتاب محمد غیاث الدین کی تصنیف ہے۔ یہ ۱۰۴۳ھ میں لکھی گئی۔ اس میں فارسی، عربی اور ترکی کے وہ تمام الفاظ و تراکیب مندرج ہیں جو فارسی نظم و نثر کے مطالعہ میں پیش آتے ہیں۔

۳۔ **فرہنگ جہانگیری** ۔ اس کتاب کا مصنف جمال الدین حسین انجو بادشاہ اکبر اور جہانگیر کے درباروں سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اُسے دونوں بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ لغت شہنشاہ اکبر کے حکم پر شروع ہوئی اور ۱۰۱۷ھ میں مکمل ہونے پر شہنشاہ جہانگیر کے نام سے منسوب کی گئی۔ اس لغت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر لفظ کی وضاحت کرتے وقت اساتذہ کے شعر بطور مثال پیش کئے گئے ہیں۔

۴۔ **فرہنگِ رشیدی** ۔ اس لغت کا مصنف عبدالرشید ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا۔ اُسے شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار میں تقرب حاصل تھا۔ اس کتاب میں دیگر بیشتر لغات کے مقابلے میں زیادہ احتیاط اور دقّتِ نظر سے کام لیا گیا ہے۔ یہ ۱۰۶۴ھ میں لکھی گئی۔

۵۔ **مجمع الفرس** ۔ اس فارسی لغت کو فرہنگ سروری بھی کہتے ہیں۔ اس کا مصنف محمد قاسم کاشانی المعروف "سروری" ہے۔ یہ کتاب شاہ عباس اوّل کے دورِ حکومت میں ۱۰۰۸ھ میں تصنیف ہوئی۔

۱۶- انجمن آرا- فرہنگ انجمن آرا رضا قلی خاں ہدایت کی آخری تصنیف ہے یہ خالصتہً فارسی الفاظ کی لغت ہے اور بالعموم فارسی الفاظ کی تشریح کے ساتھ ساتھ فارسی مثالیں اور شعر دیئے گئے ہیں۔ ضمیمہ کے طور پر اس میں فارسی ضرب الامثال بھی درج کی گئی ہیں۔ اس کتاب کو لکھتے وقت مصنف نے فرہنگ جہانگیری کو سامنے رکھا۔

مذہب اور فلسفہ

۱- جامع عباسی- یہ کتاب شیخ محمد بن حسین عاملی المعروف "شیخ بہائی" کی لکھی ہوئی ہے۔ شیخ بہائی شاہ عباس کے دربار کا نامور اور معزز و مقرب عالم تھا۔ اس کتاب میں شیعی احکام فقہ کا بیان ہے۔

۲- گوہر مراد:- اس کتاب کا مصنف عبدالرزاق بن علی بن حسین لاہجی ہے۔ یہ کتاب شاہ عباس کے عہد میں تصنیف ہوئی اور حکمت و علم کلام اس کا مبحث ہے۔ لاہجی صفوی دور کا مشہور عالم و حکیم تھا۔

۳- اسرار الحکم: اس کتاب کا مصنف حاجی ملا ہادی سبزواری ہے یہ کتاب ناصر الدین شاہ کے حکم پر لکھی گئی۔ اس میں حکمت و عقاید دین پر بحث ہے۔ حاجی ملا ہادی کا شمار قاچاری دور کے درجہ اول کے حکما و علما میں ہوتا ہے۔ آپ شعر بھی کہتے تھے اور اسرار تخلص کرتے تھے۔ آپ کی وفات ۱۲۸۹ھ میں ہوئی۔

۴- ابواب الجنان: مصنفہ رفیع الدین محمد واعظ قزوینی۔

عقاید دین اور اخلاق پر ہے۔

۵۔ معراج السعادت: احمد بن مہدی عراقی کی تصنیف ہے۔ اور یہ آپ کے والد مہدی کی عربی کتاب "جامع السعادت" کا فارسی ترجمہ ہے۔

۶۔ عین الحیات، مشکوٰۃ الانوار، معراج المومنین، حق الیقین، حیات القلوب، وغیرہ یہ تمام کتابیں محمد باقر مجلسی کی تصنیف کردہ ہیں۔ اور دین و حکمت و اخلاق کے مسائل سے متعلق ہیں۔

تذکرات و سوانح:-

۱۔ مجالس النفائس: یہ کتاب امیر شیر علی نوائی کی ترکی زبان میں لکھی ہوئی ایک کتاب کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس میں شیر علی نوائی کے زمانے کے شاعروں اور ادیبوں کے سوانح حیات مذکور ہیں۔ شاہ عباس کے عہد میں شیر علی نے اس کتاب کو فارسی زبان میں منتقل کیا۔

۲۔ تحفۂ سامی: اس کتاب کا مصنف شاہ اسماعیل کا بیٹا سام مرزا ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے ہمعصر شعرا کا حال بیان کیا ہے۔ یہ ۹۵۷ھ میں مکمل ہوئی۔

۳۔ مجالس المومنین: یہ کتاب قاضی نور اللہ شوشتری کی تصنیف ہے۔ جو ایران سے ہندوستان میں آئے اور شہنشاہ اکبر کی طرف سے شہر لاہور کے قاضی مقرر کئے گئے۔ لاہور میں ہی یہ کتاب ۹۹۳ھ میں شروع ہوئی اور ۱۰۱۰ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس میں شعرا، صوفیا، فقیہوں، بادشاہوں اور شیعہ علما و حکما کے حالات

بیان کئے گئے ہیں۔

۴۔ ہفت اقلیم: اس کتاب کا مصنف امین احمد رازی ہے۔ اس کتاب کو مکمل کرنے میں اُسے چھ سال لگے۔ اور ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوئی۔ کتاب میں اقالیم کے لحاظ سے شعرا کی طبقہ بندی کی گئی ہے۔

۵۔ آتش کدہ: یہ کتاب لطف علی بیگ آذر کی تصنیف ہے۔ فارسی تذکرات میں اس کا بہت بلند مقام ہے۔ یہ تذکرہ ۱۱۷۴ھ میں مکمل ہوا جب مصنف کی عمر چالیس برس کی تھی۔ آذر کی تمام تر شہرت کا مدار اسی کتاب پر ہے۔ "آتش کدہ" میں ان شعرا کے حالات اور کلام پر تبصرہ ہے جو مصنف سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ تاریخ نویسی، سوانح نگاری، تنقید اور فن کاری کے نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے اور تذکرۃ الاحوال اور تذکرۃ المعاصرین ہر دو پر فوقیت رکھتی ہے۔ شاعروں کی ترتیب ان کے مولد و منشا کے مطابق پیش نظر رکھی گئی ہے۔ کتاب کے خاتمے پر آذر نے اپنی سوانح عمری درج کی ہے۔ اگرچہ آتش کدہ میں دقیق ترین مغربی تنقید و تحقیق غائب ہے تاہم سوانح نگاری اور تاریخ نویسی میں ایک نئے فن کا آغاز نظر آنے لگتا ہے۔

۶۔ نامۂ دانش وراں۔ یہ کتاب ناصر الدین شاہ کے دورِ حکومت میں متعدد علما نے مل کر مرتب کی۔ یہ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک مفصل اور جامع تذکرہ ہے جس میں ایرانی علما و ادبا کے سوانح زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مصنفین میں شمس العلما عبد الرب اور میرزا ابوالفضل ساوجی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے آخری اور ساتویں جلد کو ایک اور ادیب غیاث

ادیب کی امداد سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا۔

۷۔ ریاض العارفین: پہلے بیان ہو چکا ہے۔

۸۔ مجمع الفصحا: پہلے بیان ہو چکا ہے۔

۹۔ نجوم السما: یہ تذکرہ محمد صادق بن مہدی کی تصنیف ہے جو ناصرالدین شاہ کے عہد میں ہوا ہے۔ اس میں صفوی اور قاچاری دور کے فقیہوں کے حالات لکھے ہیں۔ یہ فقیہہ شیعہ تھے۔

مذکورہ بالا تذکرات کے علاوہ مندرجہ ذیل تصنیفات بھی صفوی اور قاچاری دور کی یادگار ہیں:۔

۱۔ بزم آرا (مصنفہ سید علی)۔ تذکرہ میخانہ (لطف اللہ رازی)، خزانہ عامرہ (آزاد حسینی)۔ خلاصۃ الافکار (ابو طالب تبریزی)۔ ریاض الشعرا (علی قلی خاں)۔ قصص العلما (محمد بن سلیمان)

تواریخ:

۱۔ زبدۃ التواریخ: اس کتاب میں صفویوں کے آخری دور کے حالات مذکور ہیں نیز افغانوں کے حملوں کا بھی بیان ہے۔ اس کتاب کا مصنّف محمد حسن بن عبدالکریم ہے۔ اس نے اپنی اس تاریخ میں چشمدید واقعات بیان کئے ہیں۔

۲۔ حبیب السیر۔ اس کتاب کا مصنف خواند میر ہراتی ہے جو بابر بادشاہ کی دعوت پر ہندوستان میں آیا اور ہندوستان میں اس کتاب کی نظر ثانی کی۔ یہ ایک نہایت مبسوط اور مفصل تاریخ ہے جس میں ابتدائے عالم سے لے کر شاہ اسماعیل کے دورِ

حکومت کے حالات (سنہ ۹۳۰ھ) تک بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں شعرا و علما و ادبا کے احوال بھی مذکور ہیں۔

۳۔ صفوۃ الصفا: یہ ابن بزاز کی تصنیف ہے۔ اس میں صفویوں کے بزرگوں بالخصوص شیخ صفی الدین کے حالات مندرج ہیں۔ یہ کتاب از سر نو شاہ طہماسپ کے عہد میں لکھی گئی۔

۴۔ احسن التواریخ۔ اس کتاب کا مصنف حسن بیگ راملو ہے جو ایک بلند درجہ عالم و فاضل تھا۔ یہ کتاب دسویں صدی ہجری کے وسط میں لکھی گئی اور شاہ طہماسپ کے عہد کے حالات و واقعات مذکور ہیں۔

۵۔ مجمل التواریخ۔ یہ تصنیف ابوالحسن بن محمد امین گلستانہ کی ہے۔ اس میں نادر شاہ کے بعد آنے والے پینتیس سالوں کے حالات یعنی افشاریہ اور زندیہ خاندانوں کے واقعات مذکور ہیں۔

۶۔ تاریخ عالم آرائے عباسی۔ اس تاریخ کا مصنف اسکندر منشی ہے اس میں شاہ عباس اول اور اس کے اسلاف کی حکمرانی کے حالات مذکور ہیں۔ یہ شاہ صفی (ابن شاہ عباس) کی تخت نشینی (سنہ ۱۰۳۸ھ) تک کے واقعہ پر ختم ہوتی ہے۔

۷۔ تاریخ نادری۔ یہ تاریخ میرزا مہدی خاں بن محمد نصیر استرآبادی کی تصنیف ہے۔ اس میں نادر شاہ کے آغاز سلطنت سے اس کی وفات (سنہ ۱۱۶۰ھ) تک واقعات مذکور ہیں۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ مصنف خود نادر شاہ کے سفروں اور حملوں میں اس کے ساتھ ہمراہ تھا۔ اور جو واقعات اس نے بیان کئے ہیں وہ اس کے چشم دید ہیں۔

۸۔ تاریخ زندیہ۔ اس کتاب میں کریم خاں زند کے وارثوں اور جانشینوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا مصنف علی رضا بن عبدالکریم ہے۔

۹۔ تتمہ روضتہ الصفا۔ غیاث الدین میر خواند (نبیرہ خواند میر) نے تاریخ روضتہ الصفا کی ساتویں جلد کو مکمل کیا اور اس میں سلطان حسین بایقرا کی وفات کے بعد تک کے حالات بیان کئے اور سلطان کی اولاد اور اس دَور کے مشاہیر کا بھی ذکر کیا۔ بعد میں قاچاری عہد کے دوران رضا قلی خاں ہدایت نے اس پر مزید تین جلدوں کا اضافہ کیا اور ناصر الدین شاہ قاچار کے دَور تک کے حالات و واقعات بیان کئے۔ گویا تتمہ و تکملہ سمیت روضتہ الصفا کی کل دس جلدیں ہیں۔

۱۰۔ ناسخ التواریخ۔ یہ نہایت اہم اور مبسوط تاریخ ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد میں لکھی گئی۔ اس کا مصنف میرزا تقی سپہر ہے جو ناصر الدین شاہ کے دربار میں مستوفی تھا۔ یہ ایک بڑا عالم اور مورخ تھا۔ اس نے اس کتاب کی گیارہ جلدیں مکمل کیں۔ بعد میں علی خاں سپہر نے چند مزید جلدیں لکھ کر اس میں اضافہ کیا۔ ان جلدوں میں علی خاں نے ائمہ کے حالات کے علاوہ ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد کے مزید تفصیلی حالات بیان کئے۔

۱۱۔ تاریخ منتظم ناصری۔ اس کا مصنف محمد حسن صنیع الدولہ ہے جو ناصر الدین شاہ کا وزیر تھا۔ اس میں ابتدائے اسلام سے لے کر مصنف کے عہد تک کے حالات مذکور ہیں۔ یہ تاریخ تین جلدوں

پر مشتمل ہے۔

سوال۔ تعزیہ سے کیا مراد ہے؟ ایران میں تماشائے تعزیہ یا تعزیہ گردانی پر روشنی ڈالئے۔

جواب: صفوی وقتوں کے شاعروں نے جگر گوشۂ رسولؐ کی شہادت کے متعلق نہایت درد انگیز مرثیئے لکھے ہیں۔ لیکن اس وقت تک اس واقعۂ جانکاہ کو ڈرامائی انداز میں یعنی تمثیل یا ناٹک کے طور پر پیش نہیں کیا گیا تھا۔ سید تقی زادہ کی رائے ہے کہ روضہ خوانی کا آغاز تو صفویہ سے ہوا لیکن تعزیہ گردانی یا شبیہ کا رواج ایک مدت بعد رُو پذیر ہوا۔ صفویہ خاندان کے زمانہ میں تو صرف عشرۂ محرم کے دس دن تک ایران میں مجالسِ عزا ہوا کرتی تھیں۔ مرزا حسین دانش کا خیال ہے کہ تعزیہ گردانی انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں شروع ہوئی۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس رسم میں مغربی فن تمثیل کی تقلید کا جا بجا پرتو نظر آتا ہے۔

واقعہ کربلا کی درد انگیزی کا یہ عالم ہے کہ بڑے سے بڑے آزاد مشرب اور لاپرواشاعر بھی اس کی تاثیر سے محروم نہ رہ سکے۔ یغما نے ایک قسم کا مرثیہ ایجاد کیا جسے وہ نوحۂ سینہ زنی کا نام دیتا ہے۔ یہ کیا عجیب بات ہے کہ یغما اور قاآنی کے سے آزاد خیال اور آوارہ مزاج شعرا نے بھی اپنے کلام میں شہیدانِ اسلام کے لئے انتہائی درد مندی اور الم کا اظہار کیا ہے۔

عہد قاچاریہ میں حضرت علیؑ حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام سے مرثیے منظوم ڈراموں کی صورت میں پیش کئے جاتے

لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایران میں المیہ یا تمثیلِ مصیبت (TRAGEDY) کا واحد قائم مقام تعزیہ ہی ہے۔ اور کہ ایرانی لوگوں کے جذبات سیاست کے مقابلے میں مذہب کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ اس لئے محرّم کی پہلی دس راتوں میں ہر سال تماشائے تعزیہ نہایت خلوص کے ساتھ دکھایا جاتا ہے حقیقی درد کی پاکیزہ سادگی تعزیہ کو کامیاب بنانے میں بہت مدد دیتی ہے۔

تماشائے تعزیہ میں نہ تو تمثیل کا مصطلبہ (STAGE) ہوتا ہے اور نہ ہی پردے یا پردوں کے منظر بلکہ ایک کھلے میدان میں ایک بلند چبوترہ (سکو) بنایا جاتا ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک چوڑا سا راستہ چھوڑ دیتے ہیں تاکہ مقلدین یا ممثلین (ACTORS) کو نقل و حرکت میں آسانی رہے۔ جب مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے حاضرین سب جمع ہو جاتے ہیں تو ایک توپ سر کرتے ہیں جس سے یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب تماشا شروع ہو گا۔ سب سے پہلے سقّوں کی ایک جماعت آتی ہے۔ یہ لوگ پانی سے بھری مشکیں اٹھائے اپنے کرتب دکھاتے ہیں۔ اور "بیادِ لبِ تشنۂ کربلا" کے جاں سوز نعرے لگاتے ہیں۔ حاضرین دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے ہیں اور چھاتی پیٹنے لگتے ہیں "ہائے حسین ع" "وائے حسین ع" کے فلک رس نعروں سے شورِ قیامت برپا ہو جاتا ہے۔ پھر تعزیہ کے افراد آتے ہیں۔ ان میں جنابِ رسالت مآب صلعم، انبیائے عظام، ملائکہ، اہلِ بیت نبوی، معاویہ، یزید اور شمر وغیرہ کے ممثل ہوتے ہیں پیغمبران اور مستورات کے ممثل نقاب پوش ہوتے ہیں۔ لڑکوں اور مستورات

کے سوانگ عموماً امرا اور متمول لوگوں کے بے ریش معصوم بچے بھرتے ہیں اور تماشا میں تبرکاً حصہ لیتے ہیں۔ جو لوگ شمر ملعون اور یزید پلید وغیرہ کا پارٹ ادا کرتے ہیں ان پر حاضرین اس درجہ عملاً لعنت اور نفرت کرتے ہیں کہ انہیں جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اسی لئے اس کام کے لئے قیدیوں کو ڈھونڈا جاتا ہے۔ تمام ممثل سکو پر ایک ہی جگہ مناسبِ حال اسلحہ اور لباس میں ہوتے ہیں۔ اگر تماشے کے دوران لباس بدلنے کی ضرورت پیش آجائے تو مدیر مصطبہ (STAGE DIRECTOR) جسے استاد کہتے ہیں اس کام میں مدد دیتا ہے۔ ہر ایک ممثل کے پاس اس کا حصہ نظم میں لکھا ہوتا ہے اور اگر کہیں وہ بھولتا ہے تو حاضرین کے سامنے فوراً اس کاغذ کو دیکھ کر حافظہ تازہ کر لیتا ہے۔ استاد کے ہاتھوں میں پورا نسخہ (PROMPT BOOK) موجود ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ ممثل کو لقمہ (PROMPT) دیتا رہتا ہے۔

سوال۔ قاچاری عہد حکومت میں بابی۔ بہائی تحریک پر مفصل نوٹ لکھئے۔

جواب: بابی مذہب کا بانی سید محمد علی تھا۔ اس نے اپنی تصنیف بیان میں اپنے ظہور کی تاریخ ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء مقرر کی ہے۔ یعنی بارھویں امام مہدی کی غیبت کے پورے ایک ہزار سال بعد سید محمد علی اپنے آپ کو امام مہدی کا باب یعنی دروازہ کہتا تھا۔ امام مہدی کے چار دروازے (ابواب) تھے جن کی مدد سے وہ اپنی غیبت صغرا میں اپنے

پیروکاروں اور شیعۂ کامل کے ساتھ راہ و رسم جاری رکھ سکتا تھا گویا باب شیعہ لوگوں اور امام مہدی کے درمیان ایک واسطہ (وسیلہ) تھا۔ اس کے دعووں کی ابتدا "بالارفتن" سے ہوئی۔

باب ۱۸۱۹ء میں بمقام شیراز پیدا ہوا۔ بالغ ہوا تو سید کاظم رشتی کی جو اس زمانہ کے مشہور علما میں سے تھے شاگردی اختیار کی۔ ۱۸۴۱ء میں باب نے اپنے مذہبی و سیاسی اصول و ضوابط پبلک کے سامنے پیش کئے۔ اور اسی سن میں اس نے دعوئے مسیح موعود و مہدی بھی کیا۔ ۱۸۴۳ء میں اس نے حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ اور واپسی پر بحکم سلطانی گرفتار ہوا۔ حالتِ اسیری میں باب نے دربار شاہی میں اپنا توبہ نامہ پیش کیا اور رہا ہوا۔ مگر جب دوبارہ اس نے وہی دعوے کیا تو علمائے مجتہدین کے اصرار سے شاہ ایران نے ۱۸۵۰ء میں اس کو قتل کرا دیا۔ باب کو گاہے گاہے صرع (مرگی) کا دورہ پڑتا تھا ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے لئے اس کے یہ دورے وحی والہام کے مترادف ہونے تھے بلکہ یہ لوگ تو باب کو "خدا آفریں" کہنے لگے تھے۔

شہزادہ ناصر الدین قاچار جب فارس کے تخت شاہی پر جلوہ فگن ہوا تو اس نے اس فرقہ کے متعلق تحقیق و تفتیش کی خاطر ایک بڑی تحقیقاتی مجلس مقرر کی اور جب ارکانِ مجلس نے اس گروہ کی تکذیب و تکفیر کا فتویٰ دیدیا تو بابی مذہب کے معتقدین اور پیرووں کو سخت سزائیں دی گئیں۔

دنیاوی دولت و ثروت نے باب کے آئین و ضوابط کی

تبلیغ و اشاعت میں بڑی حد تک کام دیا۔ ایک نہایت شریف النسل نوجوان خاتون جو بلا کی حسین اور قابل تھی اور قرۃ العین کے نام سے مشہور تھی بابی مذہب کی زبردست حامی و مبلّغ تھی۔ یہ خاتون بالآخر نہایت عبرت ناک اور ہیبت ناک طریقے سے قتل کی گئی۔ قرۃ العین کا قتل ایک ایسی برقی قوت کا مظہر ثابت ہوا کہ پل کے پل میں تمام ایران اس جدید مذہب کے رنگ میں رنگا گیا۔ باب عمدہ ایرانی خط و خال کا ایک حسین و دلکش مرد تھا۔ وہ عورتوں کی آزادی کا حامی تھا۔ اس کی آواز اور لہجہ نہایت اثر انگیز تھے۔ یہ باتیں بھی اس کے مذہب کی اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہوئیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر کارلک اور ڈاکٹر پالک کے سے یورپین سیاحوں کو بھی باب سے عقیدت تھی۔

باب نے اپنے لاتعداد وفادار اور معتقد مریدوں میں سے اٹھارہ اشخاص کو دنیا کے "حروف حیات" کا خطاب دیا۔ اس نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ آئندہ ہونے والے خلفا اس کی قائم کردہ بنیاد پر عمارت تعمیر کریں گے۔ نیز یہ کہ خدائے عزّ و جلّ اس کے ہیولیٰ میں دنیا میں جلوہ گر ہوا اور آئندہ اس کے خلفا کی صورت میں نمایاں ہوتا رہے گا۔ چنانچہ وہ خود کو "واحد اوّل" کہا کرتا تھا۔

باب ایک مذہبی و روحانی راہنما ہی نہ تھا بلکہ وہ سیاسی رہبر بھی تھا۔ باب اور اس کے سرگرم و پُرجوش مبلّغین کی ہستیاں حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ تھیں۔ ایران کے اکثر فرمانروا اقدامت پسند اور متشدّد تھے۔ اس لئے ملک کا تعلیم یافتہ اور روشن خیال

طبقہ جو اس ابدی نحوست سے عرصہ ہوا بیدار ہو کر بیزار بیٹھا تھا اور محض موقع کا منتظر تھا قدرتاً باب کی تعلیم پر جو سراسر "تجدد" اصلاح و انقلاب پر مبنی تھی عامل ہو گیا۔ علما اور مذہبی پیشواؤں کے ناجائز اختیارات کو ختم کر دینے کی خواہش بھی عوام کو بابی مذہب کی طرف راغب کرنے لگی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں بابیوں نے ایک عظیم سیاسی انقلاب کے آثار پیدا کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے بابی سرغنوں کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد بابی مذہب کے مبلغ اعظم یحییٰ دارابی نے بابی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی از سر نو بنیاد ڈالی۔ مگر وہ بھی انتہائی بے دردی کے ساتھ مار ڈالا گیا۔ اور اس کے ساتھ اس کے تمام پیرو بھی بری طرح ذبح کر دیئے گئے۔

۱۸۵۴ء میں بعض بابیوں نے شاہ ایران کے قتل کی سازش کی۔ مگر بدقسمتی سے یہ راز طشت از بام ہو گیا۔ ملک کے متعدد مقامات پر زبردست خفیہ انجمنوں کا سراغ لگا۔ یہ تمام انجمنیں مع ان کے تمام سرکردگان و کارکنان کے صفحہ ہستی سے بیرحمی کے ساتھ مٹا دی گئیں۔

باب کے سب سے پہلے متبعین میں سے کاشان کا ایک سوداگر حاجی مرزا جانی تھا۔ وہ باب کے علاوہ صبح ازل، بہاء اللہ حاجی سلیمان خان، ملا محمد علی زنجانی، سید یحییٰ دارابی، ملا شیخ علی، قرۃ العین اور دیگر سربر آوردہ بابیوں سے مراسم رکھتا تھا۔ وہ ۱۸۵۲ء میں مار ڈالا گیا۔ اس نے اپنی ضخیم کتاب "نکتۃ الکاف" میں بابی اصولوں اور تاریخ کی وضاحت کی ہے۔ ان اصولوں کی اشاعت بہت

حد تک مرزا جانی کے ذریعہ سے ہوئی۔ نکتۃ الکاف کی زبان سادہ، سلیس اور شستہ ہے۔ باب کے بعد اس کا روحانی خلیفہ مرزا یحیٰی یعنی صبحِ ازل بابی لٹریچر تقسیم کرنے اور اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف و منہمک رہا۔ ۱۸۵۲ء کے قتلِ عام کے فوراً بعد صبحِ ازل فرار ہو گیا۔ چند ماہ بعد اس کا سوتیلا بھائی مرزا حسین علی بہاء اللہ بھی بھاگ کر اس سے جا ملا۔ بابیوں نے شاہ ایران کے قتل کی جو سازش کی تھی اس کی استعانت کے سلسلہ میں بہاء اللہ بھی گرفتار ہو کر چار ماہ کے لئے محبوس کر دیا گیا۔

بہاء اللہ میں صبحِ ازل کے برعکس تمام وہ صلاحیتیں موجود تھیں جو شورشوں اور فتنہ سامانیوں کے درمیان قوم پر حکومت کرنے میں مددگار ہو سکتی تھیں۔ اسی لئے بہاء اللہ بالآخر صبحِ ازل کی مکمل بربادی اور اس کے روحانی اثر و اقتدار کے زوال کا باعث بنا۔ اس نے غالباً موسم گرما ۱۸۶۶ء میں کھلم کھلا جمہور کے روبرو خود کو "من یظہر اللہ" (جسے خدا ظاہر کرے گا) ظاہر کیا۔ اور اپنی روحانی عظمت کا اعلان کیا۔ اس کا اثر تمام بابی جماعت پر بہاء اللہ کے حق میں خوشگوار پڑا تمام معتقدین صبحِ ازل سے منحرف ہو گئے اور یکے بعد دیگرے بہاء اللہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اس زمانہ میں فرقہ بہائیہ حسن بن صباح کے فدائیوں سے کم خطرناک نہ تھا۔ تقریباً تمام "حروفِ حیات" موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ بہائی برابر ترقی کرتے گئے۔ آج ان کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ بہائیوں کے عقائد، خیالات اور اصول پرانے بابی یا جدید ازلی عقائد سے بالکل مختلف بلکہ بعض اوقات متضاد

ہیں۔ بہائیوں نے مرزا جانی کی تاریخ میں تصرف کرکے اس کو تاریخ جدید کے نام سے شائع کیا۔ اور اس میں سے بہائی پالیسی کے خلاف امور نکال دیئے گئے۔ مگر بہائیوں کو مرزا جانی کی تاریخ کو مکمل طور پر تباہ کرنے میں کامیابی نہ ہو سکی۔

بہاء اللہ کے بیٹے عباس آفندی نے ۱۸۸۶ء میں بابی مذہب پر ایک تاریخ لکھی جس کا نام "مقالہ شخصی سیاح" ہے۔ اس تاریخ کے ذریعہ سے بہائی عقائد کی نشر و اشاعت کی گئی اور پرانے بابی عقاید سے اغماض کیا گیا۔ "تاریخ جدید" اور "مقالہ شخصی سیاح" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ثانی الذکر میں بہاء اللہ کو بابی مذہب کا اصلی پیشوا بتایا گیا ہے اور باب کا درجہ بہت گرا دیا گیا ہے۔ باب کو قائم اور مہدی کی حیثیت سے گرا کر محض ایک بیشر و ظاہر کیا گیا ہے۔

سوال۔ بہاء اللہ اور اس کے بہائی مذہب پر نوٹ لکھئے۔

جواب۔ بہاء اللہ ۱۸۱۷ء میں طہران میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ وزیر سلطنت اور عمائدین میں سے تھا۔ وہ بلا کا حاضر جواب اور چرب زبان تھا۔ باب اور بہاء اللہ کی ذاتی ملاقات نہ ہوئی تھی بہاء اللہ غائبانہ طور سے باب کا معتقد تھا۔ البتہ ان دونوں میں ہمیشہ خط و کتابت رہی۔ باب نے تبریز میں اپنی موت سے کچھ روز پہلے اپنی تحریرات اور مسودے اپنی انگوٹھی اور قلمدان بہاء اللہ کے سپرد کر دیئے تھے۔ چونکہ بہاء اللہ علی الاعلان اسلام ترک کر کے بڑی شد و مد سے بابی مذہب کی تبلیغ کرتا تھا اس لئے عام پبلک اور حکام اس سے سخت برگشتہ ہو گئے تھے جب بہاء اللہ نے بغداد میں ایک عظیم الشان بابی کانفرنس منعقد کی تو

ایرانی قونصل جنرل نے ترکی گورنمنٹ سے شکایت کی۔ چنانچہ ترکی گورنمنٹ بہاء اللہ کو ایڈریانوپل بھیج دیا۔ جہاں وہ آٹھ سال تک رہا۔ پھر جب عثمانی گورنمنٹ نے وہاں بھی اس کا اثر بہت زیادہ پھیلتا ہوا دیکھا تو عرقہ کو منتقل کر دیا جہاں وہ ۱۸۹۲ء میں فوت ہو گیا۔

بہاء اللہ نے اپنے آپ کو باب سے زیادہ روحانی طاقتوں کا مالک ظاہر کیا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ بابی عقائد سے تمام شیعی قیود خارج کر کے ایک نیا اصولِ مذہب مرتب کیا جس کو اس نے عیسوی، موسوی اور آتش پرست اصولوں سے ملحق کر دیا۔ بہائیوں کی کافی تعداد آج کل ایران، مصر، ترکی، ہندوستان اور امریکہ میں موجود ہے۔

اس فرقہ کے اصولِ مذہب کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بابیوں نے ہر فرقہ اور مذہب سے اچھے اچھے اصول اخذ کر کے ایک معجون مرکب تیار کر لیا تھا۔ ۱۹ کا عدد بابیوں کے نزدیک نہایت متبرک خیال کیا جاتا ہے۔ بہاء اللہ نے یہ دعوی کیا کہ "میرے پاس باب کی پیشین گوئی کے مطابق خدا کے پاس سے آخری مرتبہ وحی آئیگی" بابیوں کے پاس ہنوز گیارہ پارے تھے اور بہاء اللہ پر مفروضہ وحی آنے سے بابی قرآن انیس پاروں پر ختم ہو جاتا اور ساتھ ہی دنیا کا خاتمہ ہو جاتا۔ (بابی عورت نو خاوند تک کر سکتی ہے اور شراب نوشی چنداں معیوب شمار نہیں کی جاتی)

اگرچہ بابی بہائی تحریک بنیادی طور پر مذہبی، تاریخی اور سیاسی اہمیت رکھتی ہے۔ تاہم اس کا لٹریچر بھی کچھ اہمیت ضرور رکھتا ہے۔ فارسی زبان میں باب کی تصنیفات بیان اور دلائل سبعہ کافی شہرت

کی حامل ہیں۔ ایقان اور الواح بہاء اللہ کی تصنیفات ہیں۔ سادہ نگاری کو ہر وقت ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ عربی الفاظ بہت کم استعمال کئے گئے ہیں۔ اگرچہ اس مذہب کے متعلق اہم ترین کتابیں کتاب اقدس وغیرہ عربی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ بہاء اللہ کا اسلوب اد اباب کے مقابلے میں بہتر ہے۔ گوبینو کی رائے میں باب کا اندازِ تحریر لطافت، رنگینی، چاشنی اور سلاست سے خالی ہے۔

آقا محمد تقی ہمدانی نے "احقاق الحق" میں اور حاجی حسین قلی نے "منہاج الطالبین" میں بابی بہائی اصول و عقائد کی تکذیب و تردید کی ہے۔

سوال:۔ "سیاحت نامہ" پر مفصل نوٹ قلم بند کیجئے۔

جواب:۔ اس کتاب کا پورا نام سیاحت نامہ ابراہیم بیگ ہے۔ اسے لکھنے والا حاجی زین العابدین تھا۔ حاجی زین العابدین کے بزرگ مراغہ سے آکر کردستان میں آباد ہوئے تھے۔ حاجی صاحب کا پیشہ سوداگری تھا۔ اپنے کاروباری دوروں کے اثنا میں انہیں بہت سے مقامات کی سیر و سیاحت کا موقع نصیب ہوا۔ وہ کاکیشیا، کریمیا اور استنبول میں بہت دنوں ٹھہرے۔ شاید انہوں نے اپنے ہی سفر کا ذکر سیاحت نامہ ابراہیم بیگ کے دلچسپ پیرائے میں ادا کیا ہے۔ سیاحت نامہ کی زبان نہایت صاف، شستہ، سادہ سلیس، منجھی ہوئی اور جدید طرز کی ہے۔ بیان میں تصنع نام کو بھی نہیں۔ مصنف کی دقیقہ شناسی اور نکتہ نوازی کی جھلک ہر صفحے پر نظر آتی ہے۔ اُسے ایران کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کے نظام سے نفرت ہے۔ وہ

اس نفرت کا اظہار نہایت لطیف اور خوشگوار طنزیہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ قدم قدم پر جاپان کی حیرت انگیز اصلاح و ترقی کو سراہتا ہے۔ جاپان کی معاشرت اور سیاسیات نے پچھلے چالیس پچاس سال کے عرصہ میں ہی جو سنہری انقلاب دیکھا ہے۔ حاجی زین العابدین اس کی تعریف کرتے ہوئے ایرانی جذبات میں بھی وہی جاپان کی سی برقی قوت پیدا کرنا چاہتا ہے۔

ایران جدید کا تقریباً مجموعی علم و ادب کسی نہ کسی پہلو سیاسی اغراض و مقاصد لئے ہوتا ہے۔ لیکن انتہائی حیرت کا مقام ہے کہ مستقل کتابوں کی بجائے رسالوں وغیرہ ہی میں بیشتر ین مضامین اشاعت پاتے ہیں۔ سیاحت نامہ ابراہیم بیگ اور حاجی بابا اصفہانی کو اس زمرے سے نہایت خوش آیند استثنا حاصل ہے۔

حاجی زین العابدین نے ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔ اس سال مسٹر فلٹ اور محمد کاظم شیرازی نے سیاحت نامہ ابراہیم بیگ کو تصحیح کے بعد کلکتہ سے شائع کیا۔

شاعر اعظم علامہ محمد اقبال

آپ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور (پاکستان) سے فلسفے کا امتحان ایم۔اے پاس کیا۔ پہلے اورینٹل کالج اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ جانا ہوا۔ جرمنی سے پی۔ایچ۔ڈی اور کیمبرج سے

فلسفہ کی ڈگری پائی۔ اس کے ساتھ ہی بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ ۱۹۲۳ء میں آپ کو برطانوی حکومت کی طرف سے سر SIR کا خطاب ملا۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ اردو میں آپ کی مشہور تصنیفات یہ ہیں :- بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم۔ فارسی میں آپ کی تصنیفات ہیں :- زبور عجم، جاوید نامہ، پیام مشرق۔

ولایت سے واپس آکر آپ نے فارسی زبان میں دو مثنویاں بعنوان "اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" لکھیں۔ آپ کی آخری تصنیف "ارمغان حجاز" آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ آپ کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں ہوا۔

دنیا نے آپ کو اردو اور فارسی شاعری کا بے مثال امام مانا ہے۔ آپ نے قناعت اور عجز کے بجائے کشمکش اور خودی کی تعلیم دی ہے ؎

تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

اقبال کے دل میں شروع سے مادر وطن کے لئے درد تھا۔ آپ کا کلام غلامی کے خلاف جہاد ہے ؎

از غلامی دل بمیرد در بدن — از غلامی روح گردد بار تن
از غلامی بزم ملت فرد فرد — ایں و آں با آں و ایں اندر نبرد
از غلامی مرد حق زنار بند — از غلامی گوہرش ناارجمند

علامہ مرحوم عورت کو ذہنی ارتقا، پاک جذبات، محبت اور عشق کا مجسم پیکر خیال کرتے ہیں۔ آپ کے نزدیک مغرب زدہ عورت عورت نہیں ہے ؎

اے زناں، اے مادراں، اے خواہراں — زلیستن تا کے مثال دلبراں

دلبری اندر جہاں مظلومی است　　　دلبری محکومی و محرومی است

مرزا ابراہیم خاں پورداؤد

آپ رشت کے مقام پر ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی، عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لئے طہران چلے گئے۔ طب قدیم کا علم حاصل کیا۔ شام میں فرانسیسی زبان سیکھی۔ فرانس میں جاکر فرانسوی ادب کا وسیع مطالعہ کیا اور قانون پڑھا۔ ۱۹۱۰ء میں آپ نے پیرس میں ایرانیوں کی علمی و ادبی انجمن قائم کرنے میں بڑی کوشش کی۔ ایران واپس آکر آپ نے روزنامہ "رستخیز" جاری کیا۔ ۱۹۱۷ء میں ہندوستان آکر عرصہ تک بمبئی میں قیام کیا اور اوستا کی تفسیر لکھی۔ آپ کا اشعار کا دیوان "پوراندخت نامہ" کے نام سے ملتا ہے۔ دوسری تصانیف یہ ہیں:۔ تفاسیر، یشتہا، ایران شاہ وغیرہ۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

یکے گیتی، یکے یزداں پرستد　　　یکے پیدا، یکے پنہاں پرستد
یکے بودا و آں دیگر برہمن　　　دگر زان موسیٰ چوپاں پرستد
یکے ذاتِ مسیح ناصری را　　　بسان حضرت سبحان پرستد
اگر پرسی زکیش پور داؤد　　　جوان پارسی ایران پرستد

سوال: ملک الشعرا بہار کی زندگی مختصراً بیان کیجئے اور اس کی علمی و ادبی خدمات پر نوٹ لکھئے:۔

جواب: ایران جدید کی شاعری کا محور حب الوطنی، سیاسی بیداری، طنز، مزاح، جدتِ تعلیم و تربیت، اخلاق، حقیقت نگاری

اور ملکی و ملی جذبات کی صحیح ترجمانی ہے۔ مذہبی، عشقیہ اور مدحیہ شاعری کو دور ہی سے سلام کہا جاتا ہے۔ آقا محمد اسحاق نے جدید ایران کے شاعروں کو چار زمروں میں تقسیم کیا ہے:۔

زمرہ جن کے یہاں

۱۔ مضامین بھی پرانے ہیں اور اسلوب ادا بھی پرانا ہوتا ہے۔

۲۔ مضامین تو نئے ہیں لیکن اسلوبِ ادا پرانا ہے۔

۳۔ مضامین بھی نئے اور اسلوب ادا بھی نیا ہے۔

۴۔ نئے انداز کے لطیف گیت ہیں۔

ملک الشعرا بہار دوسرے اور چوتھے زمرے میں آتے ہیں، آپ ۱۸۸۶ء میں مشہد کے مقام پر پیدا ہوئے۔ علوم درسیہ میں خاطر خواہ دسترس پائی۔ ایک مدت تک مشہد میں امام رضا کے مقبرے پر پرخلوص مجاور رہے۔ اسی مقدس شہر سے آپ نے جدید ایرانی کانسٹی ٹیوشن کے آخری حصے میں یعنی ۱۹۱۱ء سے ایک پرچہ "نوبہار" کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ فنی اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے صرف ادب اور تربیت کو نوبہار کی ٹکر کے پرچے کہا جا سکتا ہے۔ نوبہار کی دلیرانہ پالیسی، سیاسی بحث و تمحیص، انقلاب انگیز نظموں اور کھری کھری باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے سرکاری حکم سے بند کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد یہی پرچہ تازہ بہار کے نام سے دوبارہ چھپنا شروع ہو گیا۔

بہار کا پورا نام مرزا محمد تقی ہے۔ آپ کے والد مرزا محمد کاظم صبوری بھی ملک الشعرا تھے۔ بہار نے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۹ء تک

خراسان کے سیاسی انقلابات میں شرکت کی۔ بلند پایہ سیاسی مقالات اور انقلابی نظمیں لکھیں۔ نو بہار کے علاوہ آپ ایک مجلہ " ادبی دانشکدہ " کے بھی مدیر رہے۔

بہار کے مکمل دیوان میں کوئی بیس ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ اس میں قصائد، نظمیں، غزلیں، مثنویاں، گیت، رباعیاں اور قطعے سب کچھ موجود ہے۔ شعر و شاعری کے علاوہ آپ نے بیش قیمت سیاسی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ایک چھوٹا سا ناول نیرنگ سیاہ (کنیزان سفید) کے نام سے لکھا ہے۔ تاریخ سیستان کی تصحیح و تنقیح بھی کی۔ بہار کے کلام میں حب الوطنی کے پاک جذبات اور تلقین بیداری کے پُر جوش اظہارات کا عنصر غالب ہے۔

بہار نے کیچڑ کی جو لطافت آمیز اور جدت سے لبریز ہجو لکھی ہے، اس سے ہمارے تمام عزیز دوست محظوظ ہو چکے ہیں۔ یہاں آپ کی مشہور نظم " دماوند " سے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں ؎

گر آتشِ جاں نهفته داری سوزد جانت بجانت سوگند
بفگن زپئے ایں اساس تزویر بگسل زہم ایں نژاد و پیوند

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

مخلوقِ جہاں بگرگ مانند درست با قادر عاجزند و بر عاجز چست
سُست اند بگیر و دار چو باشی سخت سخت اند بکار زار چون باشی سُست

سوال: اشرف گیلانی کی شاعری اور زندگی سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔

جواب: سید اشرف علی گیلانی ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے، آپ کو ایران کی سیاسی بیداری اور تعلیم جدید کے حامیوں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ۱۹۰۶ء کے انقلاب عظیم نے ایران میں جو ادبی ستارے پیدا کئے ہیں ان میں دہ خدا، عارف قزوینی اور بہار مشہدی کے پہلو بہ پہلو اشرف گیلانی کا نام بھی آتا ہے۔ سید اشرف نے رشت کے مقام پر "نسیم شمال" کے نام سے ایک بلند پایہ پرچہ جاری کیا جس میں علمی، ادبی، تاریخی، اصلاحی اور سیاسی مضامین نظم و نثر میں شائع ہوتے تھے دسمبر ۱۹۱۱ء میں اشرف شہر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا اس کے چھاپہ خانہ کو روسیوں نے تباہ کر دیا۔

اشرف گیلانی کی شہرت کا زیادہ تر انحصار ان نظموں پر ہے جو اُس نے دقیانوسی ملّاؤں کی تنگ نظری، بے علمی اور کٹرپن کے خلاف جہاد کے طور پر بہت عمدہ دلکش رنگ میں لکھی ہیں۔

پروین اعتصامی

پروین ایران کی ایک بلند مرتبہ شاعرہ ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۹۱۰ء میں بمقام تہران ہوئی۔ آپ کے والد مرزا یوسف خاں ایران کے مشہور جریدۂ بہار کے مُدیر تھے۔ پروین کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے تہران کے امریکی اسکولِ نسواں میں داخل کرایا گیا۔ انھوں نے اس درسگاہ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ باوجود مغربی تعلیم کے آپ نے مشرقی نسوانی اوصاف کو ترک نہ کیا۔ آپ اپنا بیشتر وقت مطالعہ

میں صرف کرتی تھیں اور سماجی یا سیاسی زندگی سے الگ تھلگ رہتی تھیں
ایران کے حکمران رضا شاہ پہلوی نے آپ کو اپنی ملکہ کی اتالیق (ٹیوٹر) مقرر کرنا چاہا مگر آپ نے اس پیشکش کو قبول نہ کیا۔ آپ نے بچپن سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ آپ کا پہلا دیوان پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ دیوان ۱۹۳۵ء میں تہران میں شائع ہوا۔
آپ ایران کے عظیم شعرا میں شمار ہوتی ہیں۔ غزل بہت کم کہی ہے عورتوں کی بیداری کے لئے بڑا کام کیا ہے لیکن خیالات اعتدال کی حد سے آگے نہیں گذرتے۔ آپ شاعروں کے اس زمرے میں شامل ہیں جو نئے نئے مضامین پرانی طرز میں ادا کرتے ہیں۔ آپ اکثر اخلاقی نظمیں کہتی ہیں۔

نمونہ کلام :-

اے دل بقا دوام و بقائے چنان نداشت — ایام عمر فرصت برق جہاں نداشت
روشن ضمیر آنکہ ازیں خوانِ گونا گوں — قسمت ہمائے وار بجز استخواں نداشت

شنیدہ اید کہ آسائشِ بزرگاں چیست — برائے خاطرِ بے چارگاں نیاسودن
بکاخ دہر کہ آلائش است بنیادش — مقیم گشتن و دامانِ خود نیالودن

سوال: فارسی غزل کی ابتدا اور ترقی پر ایک جامع نوٹ لکھئے۔
جواب: عشق و محبت انسان کا خمیر ہے۔ اس لئے جہاں انسان سے عشق ہے وہاں شاعری عشق و محبت کے اظہار.....

سے خالی نہیں ہو سکتی ہے۔ کوئی قوم شاعری کے بغیر وجود نہیں رکھتی۔ ایران شعر و شاعری میں کسی ملک سے پیچھے نہیں۔ بلکہ ایران میں جس قدر عشقیہ شاعری کو ترقی ہوئی اور کسی صنفِ سخن کو نہیں ہوئی یعنی غزل گوئی سب سے زیادہ مقبولِ عام ہے کیونکہ عشق کا جذبہ غزل کی جان ہے۔

ابتدا میں غزل جوشِ طبع سے نہیں بلکہ اقسام شاعری کے پورا کرنے کی غرض سے وجود میں آئی۔ قصیدہ کے شروع میں عشقیہ اشعار بطور تشبیب کہنے کا رواج تھا۔ اس حصّہ کو الگ کر لیا تو غزل بن گئی گویا قصیدہ کے درخت سے ایک قلم لے کر الگ پیڑ لگا دیا گیا۔

فارسی شاعری کا باوا آدم رودکی ہے جس کے زمانے میں غزل وجود میں آچکی تھی۔ غزل کی تحریک عشق و محبت کے جذبے سے ہوتی ہے اس کی ترقی تصوّف کے ساتھ شروع ہوئی۔ سب سے پہلے حکیم سنائی نے غزل کو مقبول بنایا اور اسے کافی ترقّی دی۔ ان کے بعد اوحدی مراغی نے غزل کو جذبات سے معمور کیا۔ زبان میں نزاکت، صفائی، روانی اور سلاست پیدا کی۔ اوحدی کے بعد عطار، مولانا روم، عراقی وغیرہ نے غزل کو مزید ترقی دی۔ چونکہ یہ لوگ عشقِ حقیقی (خدا سے لو لگانا) کے جاندادہ تھے اس لئے ان کے کلام میں عشقِ مجازی (انسان یعنی عورت سے عشق) کی بجائے حقیقت کا پہلو غالب ہے۔ اس بنا پر ان کی غزلیں مقبولِ عام نہ ہوئیں۔

تاتاری حملوں سے ایران میں امن وامان کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس سے درد و غم اور سوز و رنج کے جذبات انسانوں اور ساتھ ہی شاعروں پر غالب ہوئے۔ رنج والم کے جذبات کا اظہار غزل سے ہی ہو سکتا تھا۔ اس لئے

اس دور ابتری میں غزل گوئی نے ترقی کی۔ اس عہد کے شاعر شیخ سعدی قادر الکلام تھے۔ انہوں نے اس صنف کو اپنا کر غزل کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ اس سے سارے ایران میں آگ سی لگ گئی۔ ان کے بعد سلمان اور خواجو نے اس شراب کو اور تیز کر دیا یعنی غزل کی خوب ترقی ہوئی۔ ان کے دور کے آخر میں خواجہ حافظ شیرازی اُٹھے اور سب غزل گو شاعروں پر سبقت لے گئے۔ انہوں نے یہ نغمہ اس جوش و خروش سے چھیڑا کہ زمین سے آسمان تک گونج اُٹھا۔ غزل حدِ کمال تک پہنچ گئی۔ غزل میں نہ صرف عشق بلکہ ہر قسم کے خیالات کا اظہار ہونے لگا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ عرفی، نظیری، صائب، کلیم وغیرہ نے غزل میں تمدنی، اخلاقی، معاشرتی، پند و نصیحت ہر قسم کے مضامین ادا کئے۔

خواجہ حافظ کے بعد غزلیہ شاعری کی ترقی ڈیڑھ سو برس تک رُک گئی۔ خواجہ صاحب کے راستے پر چلنا تو دشوار تھا اس لئے نئی راہیں نکالی گئیں۔ اس دور جدید کے بانی بابا فغانی ہیں۔ آپ کے انداز کا خاص جوہر تشبیہات اور استعارات کی جدّت، اختصار کلام اور خیال کی الجھن ہے۔ فغانی کے طرز کے پیرو عرفی، نظیری وغیرہ ہندوستان چلے آئے تھے جہاں مقامی مذاق اور خاص رجحان نے غزل میں زیادہ رنگینی اور لطافت پیدا کر دی۔ خاص ایران کے شعرا میں محتشم کاشانی اور شفائی نہایت مقبول اور نامور ہوئے۔

شرف جہاں جو صرف غزل کہتے تھے غزل میں معاملہ بندی کو اس حد تک لے آئے کہ اسے ایک فن کی صورت دیدی۔ آپ کا دیوان ایک ہزار شعروں پر مشتمل ہے جو سر تا پا اسی انداز میں ہے یعنی معاملہ بندی کا

جو ہر غزلوں میں نمایاں اور غالب ہے یہ طرز اس قدر مقبول ہوا کہ قغانی کے طرز کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ فغانی کی خیال بندی، مضمون آفرینی اور دقت پسندی اعتدال کی حد سے بڑھ گئی اور عالم سخن پر ناصر علی، بیدل وغیرہ کا اقتدار ہو گیا۔ نئے رجحان اور نئے طرز کی راہیں کھل گئیں۔ تغیر زمانہ کے ساتھ غزل پر بھی جدید رنگ چھانے لگا۔

تلمیحات ALLUSIONS

فارسی ادب میں جا بجا اہم تاریخی واقعات و حوادث کے حوالے پائے جاتے ہیں۔ عشق و محبت کے قدیم افسانوں کے کرداروں کا ذکر بھی اکثر آتا ہے۔ ان حوالوں یا تلمیحوں کے علم کے بغیر ادب کو سمجھنا دشوار ہے۔ اس لئے ادب کے مطالعہ کے لئے تلمیحات کا ذکر کر دینا واجب ہے۔ اردو ادب اور فارسی ادب، دونوں باہم وابستہ ہے۔ دونوں میں یکساں تلمیحات اکثر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے تلمیحات کی تشریح کے لئے شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

مشہور اور اہم تلمیحات ملاحظہ فرمائیں:-

۱۔ آب بقا :-

کہانیاں ہیں حکایاتِ خضر و آب بقا　　بقا کا ذکر کہاں اس جہانِ فانی میں

کہتے ہیں کہ سکندر اعظم سے حضرت خضر علیہ السلام کی کہیں ملاقات ہو گئی۔ سکندر نے انہیں آب بقا یعنی آب حیات مہیا کرنے کو کہا حضرت خضر سکندر کو آب حیات کی طرف لے چلے جب آب حیات کے چشمے کے قریب پہنچے تو کہتے ہیں کہ راستے میں بارہ بارہ کوس تک اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اسی لئے کسی شاعر نے کہا ہے ؎

"کہ آب چشمہ حیواں درون تاریکی ست"

بارہ کوس کی تاریکی کو چیر کر جب سکندر چشمہ کے کنارے پہنچا تو حضرت خضر کہیں اِدھر اُدھر ہو گئے۔ سکندر نے دیکھا کہ بڈھے کوّے جن کا رنگ سفید پڑ چکا تھا جب وہ اس چشمے میں ڈبکی لگاتے ہیں تو سیاہ رنگ کے ہو کر نکلتے ہیں۔ یہ دیکھ کر سکندر بھی ڈبکی لگانے ہی کو تھا کہ پاس سے ایک بہت بوڑھا آدمی ظاہر ہوا اور سکندر کو منع کرنے لگا کہ اس چشمہ میں مت کودو ورنہ مجھ جیسی حالت ہو جائے گی۔ نہ کھانے کا مزہ رہے گا نہ پینے کا اور پھر موت مانگے سے کبھی نہ آئے گی۔ سکندر اس بڈھے کا خستہ حال دیکھ کر آب حیات سے یونہی لوٹ آیا اور پانی نہ پیا۔

۲- الیاس :-

نہ پکڑیں دامنِ الیاس گردابِ بلا میں ہم
کہ بدتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

جس طرح حضرت خضر خشکی پر کھوئے بھٹکے مسافروں کو راہ دکھاتے ہیں اسی طرح حضرت الیاس علیہ السلام سمندروں میں راستہ کھونے اور بھٹکنے والوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ شعر میں کسی کا سہارا لینے کی مذمت کی گئی ہے خواہ وہ سہارا حضرت الیاس ہی کیوں نہ دیں اسی مطلب کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو :-

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردئ ہمسایہ در بہشت

۳- آتش نمرود یا نار خلیل :-

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

پرانے زمانے میں ملک عراق میں ایک بڑا زبردست اور ظالم بادشاہ نمرود حکومت کرتا تھا۔ وہ اتنا مغرور تھا کہ خدائی کا دعویٰ کرتا اور لوگوں سے اپنے آپ کو سجدہ کرواتا تھا۔ حضرت ابراہیم پیغمبر کا لقب خلیل اللہ (خدا کا دوست) تھا۔ آپ نے اپنی قوم کے بتوں کو توڑ ڈالا اور خدا پرستی کی تلقین کی۔ اس پر بادشاہ نمرود نے غضب ناک ہو کر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو آگ میں جلا دینے کا حکم دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا گیا لیکن خدا کے کرم سے وہ آگ گلزار بن گئی اور خلیل اللہ کو کوئی آنچ نہ آئی اور وہ اس امتحان میں پورے اترے۔ اس واقعہ سے متعلق ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

خلقِ کریم و نفسِ نفیس و ابرِ مفیض و فائز رحمت
آبِ بقا و خاکِ شفا و نارِ خلیل و بادِ مسیحا

۴۔ آدم کا خُلد سے نکلنا یا ہبوطِ آدم:

نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

شیطان ابلیس کو درگاہِ الٰہی سے نکال دیا گیا کیونکہ اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اس لئے وہ انسان کا دشمن ہو گیا۔ آدم کو خدا نے بہشت میں رکھا اور اس کی دلچسپی کے لئے وہاں حوّا کو پیدا کیا۔ خدا نے آدم کو شجر ممنوعہ کا پھل کھانے سے منع کر رکھا تھا۔ شیطان نے حوّا کو بہکایا اور حوّا کے ہاتھوں آدم کو ممنوعہ پھل کھلا دیا۔ اس پر خدا آدم سے ناراض ہو گیا اور اس نے آدم اور حوّا دونوں کو

بہشت سے نکال دیا۔ اور زمین پر بھیج دیا۔ اس واقعہ کو "ہبوطِ آدم" (FALL OF ADAM) کہتے ہیں۔

۵۔ بارِ امانت :-

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید　　قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

قرآن مجید میں آیا ہے کہ خدا نے آسمانوں، زمینوں، دریاؤں اور پہاڑوں کے سپرد اپنی خلافت کا بارِ امانت کرنا چاہا لیکن ان سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا اور انکار کر دیا۔ پس انسان نے اس بارِ امانت کو اٹھا لیا۔ اس کے بعد انسان کے متعلق فرمایا گیا "اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا" یعنی تحقیق وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے والا جاہل ہے۔ اسی کے متعلق خاقانیٔ ہند حضرت ذوقؔ فرماتے ہیں:-

جو بار آسمان و زمین سے نہ اُٹھ سکا　　تو نے غضب کیا دلِ شیدا اٹھا لیا

۶۔ بُراقِ معراج :-

صبح دم فکر جو تھا سیرِ فلک کا مشتاق　　عرش پر چڑھ گیا اک آن مانندِ براق

بُراق اس چوپایہ سے مراد ہے جس پر معراج کی رات کو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری کی تھی۔ کہتے ہیں کہ سواری بڑی تیز دوڑتی تھی اور پلوں میں کروڑوں میل کی مسافت طے کرتی ہوئی ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پہنچتی تھی۔ اس سواری کی شبیہ اس قسم کی بنائی جاتی ہے کہ سر انسان کا، پاؤں گھوڑے کے سے کمر چیتے کی سی اور چھاتی شیر کی سی تھی۔

۷۔ بُتانِ آذر :-

بتانِ آذر کو اس عہد کے تو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دے

اُٹھا تبر اور خلیل بن کر تو نارِ نمرود کو بجھا دے

آذر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تھا جو اپنے وقت کے بہت بڑے بت تراش تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے بت خانے کے تمام بت توڑ ڈالے جس کی سزا کے طور پر آپ کو بادشاہ وقت نمرود نے آگ میں ڈلوا دیا لیکن یہ آگ آپ پر کوئی اثر نہ کر سکی۔

۸۔ بازارِ مصر:۔

ایک انٹی سُوت پر بکتا ہے یوسف سا جمیل
مصر کے بازار میں یہ حُسن کی قیمت پڑی

کہتے ہیں کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے مصری سوداگروں کے ہاتھ بیچ دیا تو وہ آپ کو لے کر مصر کے بازار میں پہنچے۔ اس موقع کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ آپ کو خریدنے کے لئے ایک بڑھیا سوت کی انٹی بطور قیمت اُٹھا کر لے آئی۔

۹۔ پیرہنِ کاغذی:۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

قدیم ایران میں جب کسی پر ظلم ہوتا تھا تو وہ انصاف کے لئے عدالت میں جاتے وقت سفید کاغذ کا ایک بڑا سا چوغہ پہنا کرتا تھا جس پر سُرخ لہو کے چھینٹے دیئے جاتے تھے تاکہ دُور سے ہی معلوم ہو جائے کہ وہ فریادی ہے

۱۰۔ تحمّلِ صالحؑ:۔

رو بہ تجمّل، خو بہ تحمّل، کف بہ تکلّف، لب بہ تکلّم

رو کشِ یوسفؑ، ہمسرِ صالحؑ، ہمرِ موسیٰؑ، ہمسایۂ عیسیٰؑ

حضرت صالحؑ کا تحمل مشہور ہے۔ آپ قومِ عاد سے تھے۔ آپ کی قوم نے آپ سے یہ معجزہ طلب کیا کہ پہاڑ سے اونٹنی پیدا ہو اور وہ پیدا ہوتے ہی تالاب سے پانی پیئے اور پھر چلتی رہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کئی لوگ آپ پر ایمان لے آئے۔ آپ نے لوگوں کو منع کیا کہ اس اونٹنی کو کوئی گزند نہ پہنچائے۔ کیونکہ یہ خدا کی اونٹنی ہے۔ آپ کی قوم میں دو چار آدمی سخت شریر تھے۔ انھوں نے شراب پی لی اور اس اونٹنی کو مار ڈالا۔ حضرت صالحؑ کو جب یہ خبر ملی تو آپ تحمل کر کے چپ ہو رہے اور اس معاملے کو خدا کے سپرد کر کے آپ شہر سے نکل گئے۔ کہتے ہیں کہ اس شہر پر ایسا غضب نازل ہوا کہ سارا شہر برباد ہو گیا اور تمام اہل شہر ہلاک ہو گئے۔ یہ سبھی کافر تھے کیونکہ مومن حضرت کے ساتھ ہی چلے گئے تھے۔

۱۱۔ تختِ بلقیس

تختِ بلقیس کی نہیں حاجت ہم سلیماںؑ نہیں گدا ہیں تیرے

حضرت سلیمانؑ نے ایک دن تمام پرندوں، جنوں، دیووں اور پریوں کو حاضرِ دربار ہونے کا حکم دیا۔ سب آ گئے لیکن ہُدہُد نہ آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ہُدہُد آیا تو حضرت نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں رہا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ شہرِ صبا میں تھا جہاں بلقیس نام کی ایک ملکہ حکومت کرتی ہے اور اس کا تخت دنیا میں بے مثل ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنے اُمرا و اعیان سے پوچھا کہ کون جلد سے جلد ملکہ بلقیس کو اس کے تخت کے ساتھ میرے دربار میں لا سکتا ہے؟ ایک جن کہنے لگا۔ "حضور، آپ ذرا اندر سے ہو کر اُلٹے پاؤں واپس آئیں تو آپ ملکہ

بلقیس کو تخت سمیت اپنے سامنے پائیں گے۔" اس پر حضرت سلیمانؑ کے وزیر آصف بن برخیا نے کہا: "آپ پلک جھپکیں تو سامنے ملکہ بلقیس کو تخت سمیت دیکھئے گا۔" چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اس کے بعد حضرت سلیمانؑ نے ملکہ بلقیس سے شادی کرلی اور مملکتِ صبا کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔

۱۲۔ جوئے شیر:۔

کاو کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

شیریں ملکۂ ایران کے عاشق فرہاد کو ٹالنے کے لئے شہنشاہِ ایران خسرو پرویز نے اس کے سامنے شیریں کو حاصل کرنے کے لئے کوہِ بیستون سے دودھ کی نہر کاٹ کر لانے کی شرط پیش کی۔ جوئے شیر لانا اب محاورہ ہے بمعنی مشکل کام کرنا

۱۳۔ جامِ جم:۔

آئینۂ سکندر جامِ جم است بنگر
تا بر تو عرضہ دارد احوالِ ملکِ دارا

شہنشاہ جمشید کے پاس ایک جام تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک نگاہ ڈالنے سے تمام دنیا کا حال معلوم ہو جاتا تھا۔

۱۴۔ چاہِ بیژن:۔

ہونگے کوئی جو جہاں کو کہتے ہیں فردوس ہے
یہ سیہ خانہ ہمیں تو چاہِ بیژن ہو گیا

بیژن رستم کا دوست تھا۔ دونوں توران گئے۔ رستم نے رودابہ

سے شادی کی اور بیژن نے افراسیاب کی لڑکی منیژہ سے لیکن افراسیاب نے ناراض ہو کر بیژن کو کنوئیں کی مانند ایک قید خانے میں بند کر دیا۔ اسی کو فردوسی نے چاہِ بیژن لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ منیژہ اپنے خاوند بیژن کے لئے ٹکڑے مانگ مانگ کر اس کنوئیں میں ڈال آتی تاکہ اس کا عاشق زندہ رہے۔ ایک جگہ فردوسی نے لکھا ہے ؎

منیژہ منم دُختِ افراسیاب برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب
برائے یکے بیژنِ شورہ بخت فتادم ز تاج و فتادم ز تخت

۱۵۔ چاہ کنعان :؎

یہ جہاں اپنے لئے ہے چاہ کنعاں سے سوا
دے کے دھوکا اس میں ہم کو سارے بھائی چل دیئے

چاہِ کنعان اس کوئیں کو کہتے ہیں جس میں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے آپ کو گرا دیا تھا اور اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام سے آ کر کہہ دیا تھا کہ یوسف ؑ کو بھیڑیا لے گیا ہے۔ اسی چاہ کنعان کو چاہِ یوسف ؑ بھی کہتے ہیں۔

۱۶۔ حاتم دوراں :؎

حاتمِ دوراں، شذرِ نعماں، رستمِ دستاں، شیرِ نیستاں
تو بہ سخاوت، تو بہ عنایت، تو دمِ جرأت، تو سرِ ہیجا

حاتم طائی یمن کا شہزادہ تھا جو سخاوت میں مشہور عالم تھا۔ کہتے ہیں یہ ایک گھوڑے کو بہت عزیز رکھتا تھا لیکن ایک دن جب اس کے یہاں کوئی مہمان آیا ہوا تھا، رات کا وقت تھا اور مہمان کو کھلانے کے لئے اس کے پاس کوئی اونٹ وغیرہ نہ تھا تو حاتم نے اپنے مہمان

کی تواضع کے لئے وہی عزیز گھوڑا ذبح کر ڈالا۔

۱۷۔ حُسن یوسف : ؎

حسن یوسفؑ دم عیسیٰؑ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کہتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ بہت ہی خوبصورت تھے۔ عزیز مصر (شاہِ مصر) کی بیوی زلیخا آپ پر فدا ہوگئی اور جب سوداگروں نے انہیں مصر کے بازار میں بیچنے کی پیشکش کی تو زلیخا آپ کو خرید کر لے آئی۔ اوس پڑوس کی عورتوں نے زلیخا کو طعنے دیئے کہ تو کس پر مرتی ہے۔ اس میں کیا خوبی ہے؟ زلیخا نے سب عورتوں کو دعوت پر بلایا اور ان کے ہاتھوں میں ایک ایک چھری اور کاٹنے کو ایک ایک لیموں دیا۔ اس کے بعد زلیخا حضرت یوسفؑ کو ان سب کے درمیان لے آئی۔ وہ سب کی سب عورتیں حضرت یوسفؑ کے حُسن کو دیکھنے میں اس قدر محو ہوگئیں کہ اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھیں اور لیموں کو کاٹنے کی بجائے اپنا اپنا ہاتھ کاٹنے لگیں۔ اس پر زلیخا نے انہیں بتایا کہ تم کیا کر رہی ہو؟ سب ہوش میں آئیں تو بڑی شرمسار ہوئیں اور یوسفؑ کے حُسن کی قائل ہوگئیں۔

۱۸۔ خون سیاوش : ؎

مٹا نام افراسیاب اس جہاں سے
یہ خونِ سیاوش ہے کیا رنگ لایا

سیاوش ایرانی شہزادہ تھا جس کی شادی توران کے بادشاہ افراسیاب کی بیٹی فرنگیز سے ہوئی۔ جب ایرانیوں اور تورانیوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی تو افراسیاب نے اپنے داماد سیاوش کو قتل

کردیا۔ جب ایران میں یہ خبر پہنچی تو مشہور ایرانی پہلوان رستم سیاوش کا بدلہ لینے توران گیا اور افراسیاب اور توران کی دھجیاں اُڑا کر واپس آیا۔

۱۹۔ خاتم سلیمان: ؎

اللہ اللہ رے نوشتہ ترا عالی رتبہ
جس کی انگلی میں پہنائے گا سلیمان خاتم

کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان ع کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کے طفیل تمام جن و ملک، وحش و طیور وغیرہ آپ کے تابع فرمان رہتے تھے۔ ایک دفعہ اس انگوٹھی کو صخرہ نامی ایک بدطینت دیو نے چرا لیا۔ حضرت سلیمان ع کے ہاتھ سے سلطنت جاتی رہی۔ وہ انگوٹھی اس دیو کے پاس بھی نہ رہی اور سمندر میں گر پڑی جہاں اُسے ایک مچھلی نے نگل لیا۔ حضرت سلیمان ع ایک ماہی گیر کے یہاں ملازم ہوئے۔ اس ماہی گیر نے خوش ہو کر حضرت سلیمان کے ساتھ اپنی بیٹی بیاہ دی۔ ایک دن آنحضرت کے سسر (ماہی گیر) ایک مچھلی پکڑ کر لے آئے۔ جب آپ کی بیوی نے اس مچھلی کو چیرا تو آپ کی گم شدہ انگوٹھی نکلی۔ آپ نے اُسے پہن لیا اور دوبارہ سلطنت نصیب ہوئی۔ ماہی گیر کی بیٹی حضرت سلیمان ع کی مالکہ بن گئی۔ صخرہ دیو کو قرار واقعی سزا دی گئی۔

۲۰۔ دمِ عیسیٰ: ؎

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

دمِ عیسیٰ یعنی حضرت عیسیٰ مسیح ع کا سانس ایک مشہور عالم معجزہ تھا۔ جب آپ کسی بیمار یا مُردہ پر دم پھونکتے تو وہ تندرست اور زندہ ہو جاتا تھا۔

۲۱- شمعِ طور :-

شوقِ نظارہ ہے جب سے اُس رُخِ پُر نور کا

ہے مرا مرغِ نظر پروانہ شمعِ طور کا

کہتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰؑ شہر مدین سے اپنے وطن مصر کو جانے لگے تو بیابانِ سینا (SINAI) میں جسے بیابان تیہ بھی کہتے ہیں کوہِ طور پر انہیں ایک روشنی نظر آئی۔ اس وقت غضب کی آندھی چل رہی تھی۔ اس پر حضرت موسیٰؑ دنگ رہ گئے اور پہاڑ کی طرف چلے۔ وہاں جاکر آپ نے دیکھا کہ پہاڑ کے اوپر ایک ہرے بھرے درخت کو آگ لگی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آواز آئی: "اَنَا رَبُّکَ یَا مُوسیٰ" یعنی "اے موسیٰ! میں تیرا رب (خدا) ہوں" آپ حیران ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ جب کچھ اور نظر نہ آیا تو کہنے لگے! "اَرِنی" یعنی مجھے اپنا آپ دکھا۔ لیکن آگ سے جواب ملا: "لن ترانی" یعنی "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا" پھر حضرت موسیٰؑ نے اصرار کیا۔ اس پر خدا نے حضرت موسیٰؑ کو اپنا جلوہ دکھایا جس پر آپ بیہوش ہو گئے۔ چنانچہ شمعِ طور سے مراد نورِ خداوندی ہے۔

۲۲- شق القمر :-

لگا کر سُرمہ تم آنسو نہیں بہاتے ہو

یہ ہم کو جلوۂ شق القمر دکھاتے ہو

کُفّارِ مکّہ نے پیغمبر اسلام سے کہا: "زمین پر تو آپ کا جادو (نعوذ باللہ) چل جاتا ہے۔ ہم آپ کے کمال کو تب معجزہ سمجھیں گے جب آپ آسمان پر کوئی کارنامہ کر کے دکھائیں۔ آپ نے فرمایا: "اچھا" یہی بات ہے تو تم ہی بتا دو کہ کونسا کارنامہ دکھاؤں" ایک کافر بولا "چاند کے دو

ٹکڑے کر دکھاؤ" یہ سن کر آپ نے خدا کا نام لے کر چاند کی طرف انگشتِ شہادت کے ساتھ اشارہ کیا چنانچہ لوگوں کو چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا آپ کے اس معجزہ کو شق القمر کہتے ہیں۔

۲۳۔ شجر طوبیٰ :

قلمِ شاخِ شجرِ طوبیٰ سے میرا اعمال نامہ لکھا ہے

شجر طوبیٰ اس درخت سے مراد ہے جس کا پھل کھا کر حضرت آدم و حوّا بہشت سے نکالے گئے۔ حوّا کو شیطان نے ورغلایا اور حوّا نے حضرت آدم کو ثمر ممنوعہ (منع کیا ہوا پھل) کھلا دیا۔

۲۴۔ صورِ اسرافیل :

گر لکھوں مضمون اپنے نالۂ پُر شور کا
لوں صریرِ خامہ سے میں کام بانگِ صور کا

کہا جاتا ہے کہ جب قیامت آئے گی تو فرشتہ اسرافیل اپنا نرسنگھا پھونکے گا جس کی آواز کے صدمے سے سب لوگ بیہوش ہونے شروع ہونگے اور پھر آہستہ آہستہ مر جائیں گے۔ نرسنگھا کے لئے عربی زبان میں لفظ "صور" ہے۔ چنانچہ صورِ اسرافیل سے مراد قیامت برپا کر دینے والی آواز ہے۔ اسرافیل فرشتہ ہوا کا نام ہے۔

۲۵۔ صبرِ ایوبؑ :

در فراقِ تو چہا اے بُتِ محبوب کنم صبرِ ایّوب کنم یا گریۂ یعقوب کنم

حضرت ایّوب علیہ السلام ایک پیغمبر تھے۔ ان کے بدن میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ لیکن اس حالت میں کبھی انھوں نے رضائے الٰہی پر شاکر رہ کر صبر کیا۔

۲۶- عدلِ نوشیرواں :-

گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند | زندست نامِ فرخِ نوشیرواں بعدل

کیقباد شہنشاہِ ایران کا بیٹا نوشیرواں بڑا عادل بادشاہ تھا۔ اس کے عدل و انصاف کے قصّے مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور واقعہ اس کے انصاف کا یہ ہے کہ اس نے ایک بڑھیا کی جھونپڑی کو نہ گرایا جس کی موجودگی سے نوشیرواں کے محل میں ٹیڑھا پن پیدا ہو گیا۔

۲۷- عصائے موسیٰؑ :-

معجزِ باد سے مانند عصائے موسیٰؑ
شجرِ خشک بھی ہو جائے تر و تازہ نہال

حضرت موسیٰؑ کو کوہِ طور پر "ید بیضا" اور "عصائے جنت" دو معجزے عنایت ہوئے تھے۔ چنانچہ ید بیضا یعنی روشن ہاتھ کا معجزہ تھا اور عصائے جنّت دراصل شجرِ طوبیٰ کی ایک شاخ تھی جو جبرئیل علیہ السلام نے حضرت موسیٰؑ کو خدا کی طرف سے لاکر دی تھی۔ یہ عصا (ڈنڈا۔ چھڑی) ہر ایک چیز کی شکل و صورت اختیار کر لیتا تھا۔ چنانچہ جب فرعونِ مصر نے حضرت موسیٰؑ کو مصر کے جادوگروں سے زک دلوانی چاہی اور انہوں نے رسیوں سے سانپ اور اژدہے بنا ڈالے تو عصائے موسیٰؑ ایک بڑے اژدھے کی شکل میں رونما ہوا اور مصری جادوگروں کے تمام سانپوں اور اژدہاؤں کو ہڑپ کر لیا۔ یہ دیکھ کر مصری جادوگر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئے۔

۲۸۔ فرعونِ مصر:

نفسِ بے مقدور کو قدرت ہو گر تھوڑی سی بھی
دیکھ پھر سامان اس فرعونِ بے سامان کا

فرعون قدیم زمانے میں شاہانِ مصر کا لقب تھا اور عام لوگ فرعون اس خاص بادشاہ کو کہتے ہیں جس کا نام "سیتی نیپ تا" تھا اور جو حضرت موسیٰ ع کے زمانے میں ہوا ہے۔ اس فرعون نے بنی اسرائیل پر بڑے ظلم ڈھائے تھے۔ جب حضرت موسیٰ ع اپنی قوم بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر چلے تو فرعون فوج لے کر ان کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ فرعون اپنی فوج سمیت دریائے نیل میں غرق ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ فرعون نے خدائی کا دعوےٰ کیا تھا۔ خدا نے اس کے پیرووں کو بھی غرق کر دیا اس کے متعلق قرآن کریم میں یہ آیت ہے "وَ اَغرَقنَا آلِ فِرعَونَ"۔ اس کے معنی ہیں: "اور ہم نے فرعون کے پیرووں کو غرق کر دیا"۔ "فرعون" عام طور پر مغرور و متکبر آدمی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۲۹۔ قُم باذن اللہ:

ہماری لاش پہ آواز قم باذن اللہ
تم آ کے حضرت عیسیٰ ع عبث سناتے ہو

قُم باذن اللہ کے معنی ہیں: "خدا کے حکم سے اٹھ"۔ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ ع مردوں کو زندہ کرتے وقت یہ کلمات کہہ کر دم پھونکتے تھے۔ یہ کلمات کہنے اور دم پھونکنے پر مردہ زندہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ "دم عیسیٰ ع" بھی اسی معنی میں مستعمل ہے۔

۳۰- کوہ کن :ـ

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سر گشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

کوہ کن: پہاڑ کاٹنے والا- ایران کی ملکہ شیریں کے عاشق فرہاد کا لقب کوہ کن ہے۔ شاہِ ایران خسرو پرویز نے یہ شرط فرہاد کے سامنے رکھی کہ اگر وہ کوہ بیستون کو کاٹ کر دودھ کی نہر (جوئے شیر) لے آئے تو شیریں اس کے حوالے کر دی جائے گی۔ جب فرہاد نے پہاڑ بیستون کو کاٹ کر دودھ کی نہر نکال لی اور خسرو پرویز کی شرط پوری ہو گئی تو شاہِ ایران نے دغا کر کے یہ افواہ پھیلا دی کہ شیریں مر چکی ہے۔ یہ سُن کر فرہاد کے دل کو ایسا صدمہ لگا کہ اس نے پہاڑ کو کاٹنے والے تیشے کے ساتھ ہی اپنا سر کاٹ دیا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ گویا کوہ کن سے مراد عاشق صادق و جانباز ہے۔

۳۱- گنج قارون :ـ

وہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی
اگر ہاتھ آئے گا گنجینۂ قارون نہ ٹھہرے گا

قارون حضرت موسیٰؑ کی قوم بنی اسرائیل سے تھا۔ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے مصر سے فرار ہونے کے دن اس نے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ایک ایسے آدمی کو دیکھا جس کا گھوڑا ایسی گھاس پر چلتا ہے کہ اس میں سونے اور چاندی کی سی چمک پیدا ہونے لگتی ہے۔ پس اس نے اس گھاس کو اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ بعد ازاں اس گھاس کے اثر سے اس نے سونے اور چاندی کے کئی خزانے فراہم

کر لئے۔ اور بڑا امیر کبیر آدمی بن گیا۔ حضرت موسیٰ ع نے قارون کو خدا کے راستے میں کچھ خیرات کرنے کو کہا۔ لیکن وہ نہ مانا جس کی پاداش میں خدا نے اُسے اس کے خزانوں سمیت زمین میں غرق کر دیا گنج قاروں سے مراد بے شمار دولت ہے۔

۳۲۔ لیلیٰ و مجنوں :۔

مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون تھا؟
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

لیلیٰ اور مجنوں عرب کے دو معشوق اور عاشق ہوئے ہیں۔ پہلے دونوں مکتب میں ایک ہی مُلّا سے پڑھتے تھے۔ وہاں ان کی آپس میں محبت ہو گئی۔ جب بڑے ہوئے تو ان کی محبت رسوا ہوئی۔ لیلیٰ کے باپ کو بُرا لگا۔ اس نے لیلیٰ کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ مجنوں لیلیٰ کے فراق میں پاگل ہو گیا۔ مجنوں کا اصلی نام قیس تھا۔ یہ عامر کے سردار کا بیٹا تھا۔ مجنوں کے باپ نے لیلیٰ کے باپ کے آگے بہت منت و زاری کی کہ وہ مجنوں سے اپنی بیٹی کا بیاہ کر دے۔ مگر وہ راضی نہ ہوا۔ آخر اسی طرح دونوں فراق میں گھل گھل کر مر گئے۔ لیلیٰ اور مجنوں کے عشق سے مُراد عشقِ صادق ہے۔

۳۳۔ منصور کا قصہ :۔

حق تو یوں ہے یہ انانیت عجب غمّاز ہے
قصہ پہنچایا زبانِ دار پر منصور کا

منصور ایک بڑے ولی اللہ ہوئے ہیں۔ آپ حلّاج یعنی رُوئی دھننے والے کا کام کرتے تھے لیکن خدا کے فیض سے آپ پر وحدتِ

وجود کی منزل وارد ہو گئی اور آپ کو اپنے آپ میں جلوۂ حق نظر آنے لگا۔ چنانچہ مستی کے عالم میں آپ "انا الحق" کا نعرہ لگانے لگے۔ یعنی "میں خدا ہوں" کا ورد کرنے لگے۔ ایسا کہنا چونکہ شریعت اسلام میں گناہ ہے اس لئے آپ کو پھانسی کی سزا دی گئی یعنی دار پر لٹکا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

۳۴۔ مارانِ ضحّاک (یا درفش کاویانی) سے

شانۂ ضحّاک کی مانند اک اس کی موج
مارِ پیچاں بن کے ہوئے متحد با خطِ بام

ضحّاک تازی (عربی) نے ایران کے بادشاہ جمشید سے مملکت چھین لی۔ اس کے دونوں شانوں (کندھوں) پر دو سانپ لہرایا کرتے تھے جن کے لئے ہر روز دو آدمیوں انسانوں کا مغز درکار ہوتا تھا۔ لوگ اس ظلم سے تنگ آ گئے ایک دن کاوہ نام کے ایک لوہار کے بیٹے کی باری آ گئی۔ اس نے اس ظلم کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس نے اپنی دھونکنی کو پھاڑ کر اس کا جھنڈا بنا لیا (درفش کاویانی = کاوہ کا جھنڈا) لوگ جوق در جوق اس کے جھنڈے کے تلے جمع ہو گئے۔ یہاں تک کہ سابق شہنشاہ جمشید کا بیٹا فریدوں بھی اس کے ساتھ مل گیا۔ اس بغاوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضحاک مارا گیا اور فریدوں کو سلطنت واپس مل گئی۔ بعد میں ایران کی بہت سی لڑائیوں میں درفش کاویانی تبرک کے طور پر فوج کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ آخر یہ جھنڈا مداین کی فتح کے موقع پر مسلمانوں کے ہاتھ آگیا اور نیست و نابود ہو گیا۔

۳۵- نوشدارو: سے

نوشدارو سے بھی بہتر ہے دمِ رنجِ خمار
ساقیا یہ شربتِ فریادرس جامِ شراب

نوشدارو ایک مقوّی اور مفرّح معجون کا نام ہے جو کیکاؤس شاہِ ایران کے پاس تھی۔ کہتے ہیں کہ اس معجون کے اثر سے مرتا ہوا انسان بھی صحت یاب ہو جاتا تھا۔ رستم نے جب غلطی سے اپنے بیٹے سہراب کو گھائل کر دیا اور وہ دم توڑنے لگا تو اس نے سہراب کی جان بچانے کے لئے کیکاؤس سے نوشدارو منگوا بھیجی مگر کیکاؤس نے یہ معجون بھیجنے سے انکار کر دیا۔

۳۶- ہاروت ماروت (چاہِ بابل) سے

ہاروت سے واں لاکھوں ہیں شاگرد کہ جس جا
وہ چشمِ فسوں گر سبق آموز فسوں ہے

کہتے ہیں کہ خدا نے اپنے دو فرشتوں کو جن کے نام ہاروت اور ماروت تھے دنیا کی سیر کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ فرشتے علمِ سحر (جادو گری) میں بڑے ماہر تھے۔ دنیا میں آکر عیش و عشرت میں پڑ گئے اور ایک خوبصورت عورت (جس کا نام زُہرہ تھا) کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے اُسے اپنا وہ علم بھی بتا دیا جس میں کئی راز خداوندی پوشیدہ تھے۔ زہرہ اس علم کے طفیل ستارہ بن

کر آسمان پر چمکنے لگی۔ لیکن ہاروت اور ماروت چاہِ بابل میں اپنے
گناہ کی پاداش میں لٹکا دیئے گئے۔ وہ آج تک اس کنوئیں
میں لٹکے ہوئے ہیں۔ چاہِ بابل کے گرداگرد دھواں ہی دھواں
ہے جس کی تاریکی کی وجہ سے کوئی شخص انہیں دیکھ نہیں سکتا۔